خواتین، خاندان اور پارلیمان

پاکستان میں قانون سازی کے رجحانات

خالد رحمٰن

سیّد ندیم فرحت

PRESS

خواتین، خاندان اور پارلیمان

پاکستان میں قانون سازی کے رجحانات

خالد رحمٰن
سیّد ندیم فرحت

PRESS

جملہ حقوق بحق انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد محفوظ ہیں۔

2015ء

کتاب : خواتین، خاندان اور پارلیمان

تالیف : خالد رحمٰن، سید ندیم فرحت

ترجمہ : عارف الحق عارف

زیر اہتمام : PRESS

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، 1، سٹریٹ نمبر 8، ایف سکس تھری، اسلام آباد

فون: 3-8438391، فیکس: 8438390، ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ips.org.pk، www.ipsurdu.com

فیس بک: fb/InstituteOfPolicyStudiesPakistan

صفحہ سازی : عابد حسین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
انسٹی ٹیوٹ کا اپنی مطبوعات میں پیش کیے گئے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

فہرست

پیش لفظ 7

ابتدائیہ: ڈاکٹر انیس احمد 15

1۔ شادی اور خاندان سے متعلق قوانین اور مسوداتِ قوانین 31

- خفیہ شادی: فوجداری قوانین (ترمیمی) بل 2009ء 33
- کثرت ازدواج: مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2010ء 38
- جبری شادیوں کی ممانعت: فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء 48
- قرآن پاک کے ساتھ شادی پر پابندی: فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء 56
- بچپن کی شادی کی ممانعت: بچوں کی شادی کی بندش کا (ترمیمی) بل 2009ء 61
- بچوں کی کفالت کے لیے لازمی عبوری حکم: عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) بل 2008ء 72
- اپنا دودھ پلانے والی ماں کی کفالت کا بندوبست: مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2009ء 79
- کم سن بچوں کی ماں کو لازمی سپردگی: سرپرستوں اور زیرسرپرستی افراد کا (ترمیمی) بل 2008ء 82
- گھریلو تشدد سے تحفّظ اور روک تھام: گھریلو تشدد (تحفّظ اور روک تھام) بل 2009ء 87
- خواتین کا احترام: خواتین کی عزت کے تحفظ کا بل 2009ء 104

2۔ جرائم سے متعلق قوانین اور مسودات قوانین 113

- ضمانت کا قانون: ضابطہ فوجداری (ترمیمی) ایکٹ 2011ء 115
- تیزاب کے حملے: 122

  فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء 122

  ضابطہ تعزیرات پاکستان (ترمیمی) بل 2010ء 124

فوجداری قانون (دوسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء 126
تیزاب پھینکنے اور جلانے کے جرم کا بل 2012ء 134
• قذف کا جرم: قذف کا جرم (نفاذِ حد) کا (ترمیمی) بل 2008ء 140
• خواتین دشمن کارروائیاں 144
فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء 144
فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء 148
• جنس اور سزائے موت: مجموعہ تعزیرات پاکستان (ترمیمی) بل 2012ء 153
• انسانوں کی ٹریفکنگ: خواتین کی ٹریفکنگ کے امتناع اور انسداد کا بل 2010ء 161
3۔ وراثت سے متعلق قوانین اور مسودات قوانین 177
• تمہیدی نکات 179
• وراثت سے متعلق قوانین میں ترامیم کے لیے مسودات 181
عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) ایکٹ 2009ء 182
ضابطہ دیوانی (ترمیمی) بل 2010ء 184
فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء 188
فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء 191
مجموعہ ضابطہ دیوانی (ترمیمی) بل 2008ء 194
• وراثت کے مسئلہ پر ایک عمومی تبصرہ 200
4۔ دیگر موضوعات سے متعلق قوانین اور مسوداتِ قوانین 205
• فیکٹریز ایکٹ میں تجویز کردہ ترامیم 207
فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009ء 207
فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009ء 208
• پاکستانی خاتون سے شادی کرنے والے غیر ملکی کی شہریت 214
پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2008ء 214
پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2010ء 215

5۔ قومی اسمبلی کی عمومی کارکردگی پر ایک نظر (2008 تا 2013ء) 221
6۔ خلاصۂ بحث اور سفارشات 233

- ضمیمہ: خواتین اور خاندان سے متعلق نجی ارکان کے مسوّدات (2008 تا 2013ء) 251
- کتابیات 256

پیش لفظ

انسان فطرتاً اپنی زندگی میں نظم وضبط اور امن چاہتا ہے۔ بالعموم اس کی خواہش ہوتی ہے کہ تمام امور مناسب اور منصفانہ طور پر انجام پائیں، تاہم لالچ اور حسد بھی انسان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے اور اپنی خصلت میں موجود کمزوری کے سبب انسان ہوس اور لالچ کی رو میں بہہ بھی جاتے ہیں اور دوسروں کے حقوق میں خلل کا سبب بنتے ہیں۔ اسی لیے کسی بھی معاشرے میں افراد کی خواہشات اور اقدامات کو کسی قاعدے کا پابند کیے بغیر امن قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی بالادست قوت کی طرف سے قائم کردہ قاعدہ جس کی پابندی تمام ماتحت افراد پر لازم قرار پاتی ہے 'قانون' کہلاتی ہے۔ قانون کی تعریف ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے: ''ایک ایسا نظام جو طاقت کے بل پر اور سماجی دباؤ کی بنیاد پر انسانی سرگرمیوں اور تعلقات کی صورت گری کرتا ہے''۔[1] اس وضاحت کی روشنی میں دیکھا جائے تو قانون ہمیشہ انسانی معاشروں کی اہم ضرورت رہا ہے، تاہم قانون کا جوہر اور اس کی اصل قوت اس کے پیچھے موجود قوتِ نافذہ (Authority) میں نہیں ہے بلکہ اس کی افادیت کا انحصار عوام میں اس کے لیے موجود قبولیت اور مقبولیت پر ہے۔

کسی بھی مخصوص قانون کا مخاطب پورا معاشرہ یا معاشرے کا کوئی خاص طبقہ ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس قانون کے دائرۂ کار میں آنے والے افراد بہت سے متنوع رجحانات اور خصوصیات رکھتے ہیں، جنہیں پیشِ نظر رکھنا قانون بنانے والے حکام کے لیے ناگزیر ہے۔ قانون سازی کا عمل اسی لیے حساس بھی ہے کہ اس میں عوام کے حقوق وفرائض کا تعین موجود ہوتا ہے اور ایک اچھا قانون وہی ہے جس میں حالات، ضروریات اور مقاصد کے ادراک کے علاوہ نہ صرف جامعیت (Comprehensiveness) موجود ہو بلکہ مختلف امکانی حالات کے پیشِ نظر اس میں ضروری حد تک لچک (Flexibility) بھی موجود ہو۔

اگر چہ ہر قانون حساس اور اہم ہوتا ہے لیکن حالیہ عرصے میں خواتین سے متعلق قانون سازی نے اضافی اہمیت اور توجہ حاصل کر لی ہے۔ تاریخی طور پر تمام ہی معاشروں میں عورت کا مقام اور مرتبہ بحث کا موضوع رہا ہے لیکن آج کی دنیا میں یہ موضوع بوجوہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ مختلف علاقوں اور ادوار میں خواتین بالعموم استحصال اور بے توقیری کا شکار رہی ہیں، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب معاشرے میں ان کی مشکلات کا احساس بڑھا تو حل یہ نکالا گیا کہ عوامی زندگی میں ان کے کردار میں اضافہ کر کے یہ قرار دیا جائے کہ خواتین کا بااختیار اور خودمختار ہونا ان کے مسائل کا حل ہے۔ بدقسمتی سے عوامی سطح پر یہ اضافی کردار عورتوں کے لیے دوہری مشقت کا باعث بنا ہے۔[2] استحصال اور اختیار پر مبنی ان دونوں ہی صورتوں میں خواتین کی فطرت، احساسات، جذبات، ضروریات اور صلاحیتوں کو کم ہی مدّنظر رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے حقوق کی تحریک یا ان کے حقوق کے لیے تشویش کل کے قدیم معاشروں میں بھی موجود تھی اور آج کی دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی نظر آتی ہے۔

پاکستانی معاشرے میں عورتوں سے متعلق مسائل پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں روزمرہ زندگی میں بنیادی ضروریات کی عدم موجودگی یا ناکافی فراہمی خواتین کی زندگیوں کو مشکل بنا رہی ہے وہاں سماجی اور اقتصادی میدانوں میں ان کے کردار کے بارے میں ابہام (Confusion) نے معاشرے کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر چہ ان متعدد مسائل کے حل کے لیے عوامی بیداری کی سماجی اور علمی تحریکوں، تعلیم کی فراہمی کے لیے انتظامی اقدامات، روزگار اور ترقی، عدالتی اور پولیس کے نظاموں میں اصلاحات اور عورتوں کے مسائل کی طرف میڈیا اور سول سوسائٹی کی حساسیت ضروری امور ہیں، لیکن معاشرے میں دیرپا تبدیلی لانے کے لیے قانون سازی کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تغیر اور ارتقا انسانی معاشروں کا خاصہ ہے اور اس کے مطابق رائج قوانین میں ترامیم بھی لازم ٹھہرتی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں جہاں دیگر کئی موضوعات زیرِ مطالعہ رہتے ہی وہاں طبعی طور پر پاکستانی معاشرہ اور اس کے مختلف پہلو بالخصوص توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔ اس نوعیت کے

معاملات میں خواتین کی تعلیم، اقتصادی میدان میں ان کی شراکت کے امکانات اور خاندان کے ادارے کے حوالے سے مختلف سرگرمیاں اور مطبوعات اس موضوع پر آئی پی ایس کی گہری دلچسپی اور واضح سوچ کی مظہر ہیں۔ موجودہ تناظر میں جب خواتین اور خاندان سے متعلق امور کو موضوع بنانے کا ارادہ کیا گیا تو محسوس ہوا کہ خواتین اور خاندان کے ادارے کو درپیش مسائل اور چیلنجز کے حوالے سے معاشرے کے مختلف طبقات اور افراد میں آراء اور نقطۂ نظر کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس لیے مبینہ مسائل میں سے چند ایک کو ترجیح قرار دے کر موضوع بنانا ایک مشکل فیصلہ ہوسکتا تھا۔ ایسے میں مناسب محسوس ہوا کہ مسائل کی نشاندہی اور انتخاب خود سے کرنے کی بجائے خواتین اور خاندان سے متعلق ان معاملات کو موضوع بنایا جائے جنہیں ملک کے اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے یعنی پارلیمان نے اہم سمجھا۔ اس طرح اس کتاب میں شامل موضوعات پاکستانی معاشرہ میں جاری مباحث اور سوچ کے آئینہ دار ہیں۔

اس طرح اس مطالعہ کی بنیاد اگرچہ پارلیمان میں قانون سازی کی غرض سے پیش کی جانے والی تجاویز ہیں لیکن ان مین سے ہر تجویز اپنی اپنی جگہ معاشرے میں خواتین اور خاندان سے متعلق جاری بحث کا ایک اہم عنوان بھی ہے۔ اس لیے اس بات سے قطع نظر کہ قانون سازی کے لیے پیش کردہ کوئی تجویز مسترد ہوگئی، اسمبلی کی تحلیل پر زائد المیعاد ہوکر غیر مؤثر (Lapse) ہوگئی یا منظور ہوکر قانون بن گئی، ملک کے اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے میں پیش کردہ یہ تجویز بجائے خود غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، اسی لیے اس مطالعہ میں ان تجاویز کا جائزہ عمومی انسانی رویوں، معاشرتی اقدار اور قانونی نکات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ اس بحث کی افادیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اگر قانون میں ترمیم کی کوئی تجویز تکنیکی اعتبار سے زائد المیعاد ہوکر اس غیر مؤثر ہے، تو بھی خود یہی تجویز یا اس موضوع کے حوالے سے کوئی دوسری تجویز مستقبل میں قانون سازی کے لیے زیرِ بحث آسکتی ہے۔

پارلیمانی جمہوریت ہونے کے ناطے پاکستان میں پارلیمان کا کردار اس لیے بہت اہم ہے کہ معاشرے یا اس کے کسی ایک طبقے کو درپیش مسائل کی نشاندہی اور ان کو حل پیش کرنے کی توقع اسی ادارے سے کی جاتی ہے۔ ملک کے تمام حصوں میں آباد افراد کے نمائندگان ہونے کی حیثیت سے اراکینِ پارلیمنٹ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام کی مشترکہ خواہشات اور قومی مقاصد و اہداف کو قوانین اور حکمتِ

عملی کی شکل دیں گے تا کہ انہی اراکین پر مشتمل حکومت انہیں عمل کی صورت دے سکے۔اس لحاظ سے عوامی ضروریات کو درست طور پر سمجھنے اور مقامی روایات اور رویوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے حکمتِ عملی ترتیب دینے میں ان کی کامیابی یا ناکامی ہی اس بات کا تعین کرتی ہے کہ وہ قانون سازی کے اپنے بنیادی فریضہ کی ادائیگی میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔

اس مطالعہ کے لیے خواتین اور خاندان سے متعلق ان مسائل کو موضوع بنایا گیا جو 2008 سے 2013ء تک قائم رہنے والی پاکستان کی تیرہویں قومی اسمبلی کے سامنے قانون سازی کے لیے پیش کیے گئے۔اس انتخاب کی ایک واضح وجہ تو یہ ہے کہ اس مطالعہ کی تیاری کے وقت تک یہی آخری اسمبلی ہے جس نے پانچ سالہ دستوری مدت مکمل کی اور 16 مارچ 2013ء کو دستور کے آرٹیکل 52 کے تحت تحلیل ہوئی۔اس انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمہوری طور پر منتخب اسمبلی نے جمہوری طور پر منتخب صدر کے تحت اپنی مدت پوری کی ہے۔اگرچہ پچھلی قومی اسمبلی نے بھی اپنی مدت (2003 تا 2008ء) پوری کی تھی لیکن اس کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہے کہ یہ فوجی حکمران جنرل (ر) پرویز مشرف کے براہِ راست اثر اور مداخلت کے تحت کام کر رہی تھی۔اس لیے فروری 2008ء میں منعقد ہونے والے انتخابات کے حوالے سے عام خیال یہی تھا کہ ان انتخابات نے آمرانہ دور کا خاتمہ کیا اور منتخب عوامی حکومت وجود میں لائے۔اس لیے جائز طور پر یہ توقع کی جارہی تھی کہ اس دور میں عوام کی فلاح و بہبود بالخصوص پیشِ نظر رہے گی۔

<u>مطالعہ کا انداز:</u> تیرہویں اسمبلی کی مدت پوری ہونے پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی وکلاء، سماجی کارکنوں اور اسکالرز اور محققین پر مشتمل ٹاسک فورس نے خواتین اور خاندان سے متعلق قانون سازی کی کوششوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان قوانین اور قانون سازی کی تجاویز کا جائزہ لیا ہے جن کو نجی یا سرکاری مسوّداتِ قانون کی شکل میں پیش کیا گیا اور جن میں سے چند ایک کو قانون کی شکل میں لاگو بھی کیا گیا تھا۔ جن مسوّداتِ قانون (Bills) کو اس مطالعہ کے لیے منتخب کیا گیا، ان کے علاوہ کچھ دیگر مسودات بھی وسیع تر تناظر میں اس مشق کا حصہ ہو سکتے تھے لیکن مطالعہ کے مرکزی خیال سے براہِ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اور اختصار کی خاطر انہیں موجودہ مطالعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

پاکستان کی پارلیمنٹ صدر اور دو ایوانوں (قومی اسمبلی اور سینیٹ) پر مشتمل ہے۔ تاہم یہ مطالعہ صرف قومی اسمبلی میں ہونے والے قانون سازی کے عمل کے جائزے پر مشتمل ہے۔ ایسا نہ صرف اس لیے ہے کہ زیرِ مطالعہ مدت قومی اسمبلی کی مکمل آئینی میعاد کے مساوی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جنس کی بنیاد پر مسوداتِ قانون زیادہ تر قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے۔ ان پانچ برسوں کے دوران سینیٹ میں ایسے دو ہی مسوّدات متعارف کرائے گئے، لیکن یہ دونوں ہی پہلے قومی اسمبلی میں پیش ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ اس مطالعہ کا حصہ ہیں۔ ایک ''بل'' کو ''قانون'' بننے کے لیے طویل غور وخوض کے متعدد مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔[3]

ترتیب: اس مطالعہ کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی چار ابواب میں اسمبلی میں پیش کیے جانے والے مسوّداتِ قانون کی ہر تجویز کی تفصیلی تشریح اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے، خواہ یہ مسوّدات منظور ہو کر قانون کی شکل اختیار کر چکے ہوں یا اسمبلی کی تحلیل کے ساتھ زائد المیعاد ہو کر غیر مؤثر (Lapse) ہو گئے ہوں۔ اس تسلسل میں پہلا باب خاندان کے ادارے اور شادی سے متعلق قوانین اور مسودات قانون کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں وہ قوانین اور مسودات شامل ہیں جن میں فوجداری قوانین میں ترامیم کی گئی ہیں یا ان میں ترامیم کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں وراثت سے متعلق ترمیمی مسوداتِ قانون کو متعارف کروانے کے بعد زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جبکہ چوتھے باب میں دیگر متفرق قوانین شامل ہیں۔ چونکہ خواتین اور خاندان سے متعلق ان مسائل کو قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسوّدات کی بنیاد پر زیرِ بحث لایا گیا ہے اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ پانچویں باب میں اسمبلی کی مجموعی کارکردگی کو بھی مختصراً پیش کر دیا جائے۔ اس مطالعہ کا اختتام چھٹے باب پر ہوتا ہے جس میں کلیدی نتائج اور سفارشات شامل ہیں۔

اس مطالعہ میں ہر تجویز پر الگ سے بحث کی گئی ہے جو بل کے خلاصے سے شروع ہوتی ہے۔ اس خلاصے کے بعد مشاہدات ہیں جن کے ذریعہ موجودہ قانونی ڈھانچے میں ممکنہ اثر اور تبدیلی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مشاہدات کے بعد تبصرہ ہے جس میں معاشرتی ماحول میں مجوزہ قانون کی ضرورت، مجموعی اثرات اور اہمیت پر بحث کی گئی ہے اور زیرِ مطالعہ اور اس میں زیرِ غور آنے والے مسائل کے حوالے سے سفارشات

کے ذریعے اس بحث کو سمیٹا گیا ہے۔ بعض صورتوں میں کچھ مخصوص سفارشات کی بجائے زیرِ غور مسئلہ کے حوالے سے مطلوب نقطۂ نظر اور مجوزہ رویئے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ٹاسک فورس نے بحث کے دوران ان مسائل سے متعلق مسودات میں قانون سازی کے آئینی ڈھانچے موجودہ قوانین اور ان کی عدالتی تشریحات اور سماجی ساخت کا بھی خیال رکھا ہے۔

قانون سازی کے لیے پیش کردہ مسودات اور پارلیمان میں منظور کردہ قراردادوں وغیرہ کا اصل متن بالعموم انگریزی میں ہے اور مطالعہ کے لیے اسی کو استعمال کیا گیا ہے لیکن ان کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے خیال رکھا گیا ہے کہ اصل متن میں موجود الفاظ اور ان کی روح کے قریب تر ترجمہ کیا جائے۔ مسودات کے متن کی خوبی یا خامی کا اصل اظہار تو انگریزی مسودات کو دیکھ کر ہی ہوسکتا ہے لیکن بعض اوقات جہاں خامی غیر معمولی تھی، اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوا، اور ترجمہ میں اس خامی کو بھی باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہم انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی ٹاسک فورس[4] کے ہر رکن کا اس مطالعاتی سرگرمی میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لینے پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جناب ظفر الحسن جوئیہ ایڈووکیٹ، جناب اکسیر احمد عباسی ایڈووکیٹ اور محترمہ سحرش صبا ایڈووکیٹ کا بالخصوص تذکرہ بے جا نہ ہوگا جنہوں نے مختلف مجالسِ بحث میں یکساں دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ حصہ لیا اور پر مغز اور مفید کردار ادا کیا۔ ہم اپنی سابق رفیقۂ کار ثمر جاوید کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ٹاسک فورس کے اجلاس منعقد کرائے اور ہر ایک کو فعال اور باخبر رکھا۔ جناب عارف الحق عارف اور جناب متقین الرحمٰن پورے مسودے کو انگریزی میں ترجمہ کرنے اور اس کی تدوین کرنے پر ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ قومی اسمبلی کی ویب سائٹ ایک ایسی اسکیم کے تحت تشکیل دی گئی ہے کہ اس میں اس نوعیت کی کسی بھی تحقیق یا مطالعہ کے لیے مطلوب ضروری اطلاعات، مواد اور دستاویزات مہیا رکھی گئی ہیں۔ اس اقدام کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے ۔ یہ صحت مند روایت ہے جس سے قومی سطح پر لوگوں کو فیصلہ کرنے کے عمل میں اپنی بات کہنے کا موقع ملے گا۔ مسودات قانون اور قوانین پر نظر ثانی کا زیرِ نظر جائزہ اس سے قبل انگریزی کتاب کی صورت میں اور آئی پی ایس کے نمائندہ تحقیقی جریدے پالیسی پرسپیکٹوز (Policy Perspectives) میں شائع ہو چکا

ہے۔تاہم اس اردو اشاعت میں اس پر نظرِ ثانی اور قابل لحاظ اضافے کیے گئے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ مطالعہ نہ صرف ملک میں جاری مباحث میں اہم اضافہ ثابت ہو گا بلکہ معاشرے میں خواتین کے کردار کے حوالے سے ایک متوازن سوچ کو آگے بڑھاتے ہوئے خاندان اور معاشرے کے استحکام میں بھی مددگار رہو گا۔ہمیں توقع ہے کہ اس تالیف میں قانون ساز اور قانون سازی سے دلچسپی رکھنے والے افراد اپنے لیے متعدد ایسے نکات اور سفارشات پائیں گے جن کے ذریعے صحتمند معاشرتی روایات اور اقدار کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ قانون کے طلبہ، سماجی بہتری میں دلچسپی رکھنے والے افراد، تنظیموں اور پاکستانی معاشرے کو مختلف جہتوں سے جاننے کے خواہشمند افراد کو اس کتاب سے کافی مدد ملے گی۔

مؤلفین

﴿حواشی﴾

1۔ بلیک کی قانونی لغت

2۔ دیکھیے، ثروت جمال اصمعی: عورت مغرب اور اسلام، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، 2014ء

3۔ دستورِ پاکستان اور قومی اسمبلی کے قواعدِ کار مجریہ 2007ء کی رُو سے قانون سازی کی وفاقی فہرست میں شامل کسی بھی موضوع سے متعلق معاملے پر قانون سازی کے لیے مسوّدہ (Bill) قومی اسمبلی یا سینٹ میں سے کسی بھی ایوان میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس بل کو اس ایوان کے ارکان پر مشتمل متعلقہ قائمہ کمیٹی کی طرف بھیج دیا جاتا ہے جو ہر حوالے سے غور وخوض کے بعد اپنی سفارشات کی روشنی میں یہ بل ایوان میں پیش کرتی ہے۔ اگر ایک ایوان سے کوئی مسوّدۂ قانون منظور ہو جائے تو اسے دوسرے ایوان میں منظوری کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر دوسرا ایوان بھی اس بل کو بغیر کسی ترمیم کے منظور کر لے تو صدرِ مملکت کے دستخط کے بعد اسے قانون کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر دوسرا ایوان اس مسوّدے میں ترمیم کے بعد اسے منظور کرے تو تبدیل شدہ صورت میں اس کی منظوری کے لیے اسے دوبارہ اسی ایوان میں بھیجا جاتا ہے جس میں اس بل کو ابتداء پیش کیا گیا تھا۔ منظوری کی شکل میں اس بل کو قانون بننے کے لیے صرف صدر کے دستخط ہی درکار ہوں گے لیکن اگر یہ ایوان دوسرے ایوان کی منظور کردہ ترمیم کو رَدّ کر دے یا نوّے دن کے عرصے میں اس کی منظوری نہ دے سکے تو اس بل کی منظوری دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں دی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں بھی منظوری کے بعد اسے قانون کی شکل اسی وقت ملے گی جب صدرِ مملکت اس پر دستخط کر دیں۔ اگر کوئی بل قومی اسمبلی کی تحلیل کے وقت تک منظور نہ ہو سکا ہو تو یہ زائد المیعاد قرار پا کر غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔

4۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی ٹاسک فورس برائے مطالعہ حقوق خواتین و خاندان ان افراد پر مشتمل تھی: اسما مشتاق ایڈووکیٹ، اکسیر احمد عباسی ایڈووکیٹ، آصفہ امداد ایڈووکیٹ، ثمر جاوید، ڈاکٹر حبیب الرحمان عاصم، خالد رحمٰن (صدر)، سحرش صبا ایڈووکیٹ، سلیم رضا ایڈووکیٹ، سید ندیم فرحت، ڈاکٹر شہزاد اقبال شام، ظفر الحسن جوئیہ ایڈووکیٹ، عامر عبداللہ ایڈووکیٹ میرو نہ نذیر ایڈووکیٹ، نادیہ خادم ایڈووکیٹ

خواتین، معاشرہ اور قانون ۔۔۔ ایک جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

عصرِ حاضر میں پسماندہ طبقات کے حقوق کے لیے چلنے والی تحریکوں میں خواتین کو بااختیار بنانے کا معاملہ ایک بڑا عنوان رہا ہے۔ جاگیردارانہ معیشت سے سرمایہ دارانہ معیشت میں تبدیلی کے باوجود یورپ میں اور دنیا کے دیگر حصوں میں اپنی طاقت، اختیار، ملکیت اور اجارہ داری کے گھمنڈ میں مبتلا جاگیردارانہ سوچ کی یہ نفسیات رہی ہے کہ پسماندہ اور پسے ہوئے طبقات سے نفرت کی جائے۔ یہ سوچ صدیوں سے موجود چلی آ رہی ہے۔ یورپی کلچر اور تہذیب، غیر تحریری قانون اور سماجی روایت غالب طور پر مردانہ سوچ کی حامل ہے۔ خواتین کی اقتصادی محتاجی نہ صرف یورپ کی روایت رہی ہے بلکہ یہ جاگیردارانہ سوچ کے حامل دیگر معاشروں میں بھی عموماً جاری رہی ہے۔

اس حوالے سے برطانوی سامراج کے قبضے کے تحت برصغیر پاک و ہند بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ بلکہ برطانیہ نے تو اپنے مفادات کے خادموں کو بڑی بڑی جاگیریں تحفے میں دے کر جاگیرداری کی حوصلہ افزائی کی اور سامراجی راج کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں نوابیّت (Knighthood) کے منصب پر بھی فائز کیا۔ اس کے علاوہ موجودہ معاشرتی مزاج کی تشکیل میں بلوچستان اور شمالی علاقوں جیسے خطوں میں اسلام سے پہلے کے قبائلی کلچر نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔ یہی کردار پنجاب اور سندھ میں برادری کے نظام اور وڈیرہ شاہی کا تھا۔ اس سماجی تانے بانے کا، جو صدیوں تک رائج رہا، اسلامی تعلیمات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اگرچہ پاکستان میں شامل علاقوں کی اکثریت مسلمان تھی، لیکن خواتین کے بارے میں ان کی غیر مناسب سوچ، مذہب کے حوالے سے ان کے ناقص تصور کی عکاس تھی۔ یورپ اور ہندوستان کی

طرح انہوں نے بھی مذہب کو رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا جس میں بعض مخصوص دنوں اور اوقات میں عبادات، خیرات اور زیارات پر مبنی افعال ہی مطلوب ہوتے ہیں، جب کہ ان کا خیال تھا کہ ان کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی معاملات پہلے سے رائج روایات کے مطابق طے ہوں گے۔

پاکستان خالصتاً اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا، جو مسلمانوں کا ایمان بھی ہے اور ثقافت بھی۔ اس بات کا واضح اظہار خود بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ''ایمان، اتحاد اور نظم'' کو پاکستان کا مقصد (Motto) قرار دے کر کیا۔[1] اس ریاست کے قیام کے بعد توقع تھی کہ ریاست تعلیم، قانون، ذرائع ابلاغ اور سماجی و ثقافتی تبدیلیوں کے ذریعے مذہب کے روایتی تصور کو ایسے نظامِ زندگی سے بدل دے گی جس میں اسلام کی حقیقی روح کارفرما ہوگی، لیکن جب قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد ہی قائدِ اعظم وفات پا گئے تو بدقسمتی سے اقبالؒ اور جناحؒ کا تصورِ اسلام ان کے بعد آنے والے حکمرانوں کے ذہنوں میں مطلوبہ جگہ نہ پا سکا۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام، پہلے سے موجود روایات، رسومات اور ان کے پیچھے کارفرما سوچ کے خلاف علمِ بغاوت لے کر اٹھا تھا۔ اسلام نے زندگی کا نیا تصور اور نمونہ پیش کیا جس کا مقصد انسانیت کو فرسودہ رسوم اور روایات سے آزادی دلا کر معاشرے کی سماجی انصاف کی بنیاد پر تعمیرِ نو تھا۔ یہ انسانی رویوں اور سماجی ڈھانچے کو ایک نئے فلسفے کی بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ گویا اسلام محض عقیدے کے زبانی اظہار کا نام نہیں تھا بلکہ اس نے تاریخ کو معاشرے، معیشت، ریاست اور قانون میں مکمل تبدیلی سے رُوشناس کروایا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں لڑکی کی پیدائش کو پورے خاندان کے لیے بدشگونی سمجھا جاتا تھا اور معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ اعلان کیا کہ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر یکساں حقوق حاصل ہیں۔ قرآن مجید نے واضح طور پر کہا کہ ''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے سے ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے''۔[2] اس آیت میں

قرآن نے یہ قرار دیا ہے کہ اگرچہ مرد کو خاندان کے سربراہ کا کردار دیا گیا ہے لیکن مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق میں پیدائشی طور پر مساوات موجود ہے۔ ان دونوں کے درمیان حقوق کے معاملے میں معاشی، سماجی، سیاسی اور قانونی معاملات میں کسی قسم کے امتیاز کی اجازت نہیں ہے۔ صرف فرائض اور ذمہ داری کے سلسلے میں ہر صنف کو معروضی اور مبنی بر انصاف سوچ کے ساتھ مخصوص کردار تفویض کیا گیا ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے ساتویں صدی عیسوی میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے خواتین کے رائے دہی کے حق کو تسلیم کیا تھا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقرر کردہ کمیشن نے مدینہ منورہ میں گھر گھر جا کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بطور خلیفہ موزونیت کے بارے میں رائے دریافت کی۔ اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کے دور میں متعدد خواتین کے معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی مثالوں اور اس حقیقت سے خواتین کے معاشی حقوق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کی دولت اور بچت پر لازمی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں تقریباً ہر صفحے پر یہ تذکرہ کسی نہ کسی انداز میں مل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ جنس، رنگ یا سماجی یا سیاسی وابستگیوں کی بنا پر نہیں، بلکہ ان کے اعمال اور رویوں کی بنا پر کرے گا۔ سورۂ احزاب میں قرآن مسلمان مردوں اور خواتین کی عبادات، سماجی رویوں اور ان کے طرز عمل کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے بلاتخصیص یہ خوش خبری سناتا ہے کہ ''ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے معافی اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''[3]

یہ موقع یہ تفصیل بیان کرنے کا نہیں ہے کہ اسلام نے خواتین کو کس طرح اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی حقوق دے کر مضبوط کیا ہے، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اور سنت کی واضح نصوص اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ ایک مسلمان خاتون سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو حصولِ تعلیم کے ذریعے استعمال کرے؛ اپنی عقل اور دانائی کو گھر میں اپنے خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے اور عوامی سطح پر اپنے ووٹ اور جہاں ضروری ہو وہاں اپنی رائے کا اظہار کرے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے ذریعے نہ صرف اپنا مذہبی اور سماجی فرض ادا کرے، بلکہ اپنی منفرد حیثیت کا اظہار بھی کرے۔ مسلم خواتین کو تجارت، زراعت، یا دوسری معاشی سرگرمیوں میں متحرک شہری کی حیثیت سے حصہ لینے کی اجازت ہے۔ وہ اسلام

کی سماجی اخلاقیات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے صنعتی اداروں کو چلا بھی سکتی ہیں اور ان کو اپنی ملکیت میں بھی رکھ سکتی ہیں۔ ان کو جائیداد کو اپنی ملکیت میں رکھنے، پس انداز کرنے، سرمایہ کاری کرنے، خیراتی ادارے قائم کرنے اور وقف بنانے اور اپنی دولت خرچ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ ایک عورت کا بنیادی میدان عمل اس کا اپنا گھر ہے، جہاں وہ اپنی قوم اور انسانیت کے مستقبل کی تعمیر اور معاشرے کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے اس پر کوئی مالیاتی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی اگر چہ وہ کروڑ پتی ہی ہو۔ یہ وہ دائرہ کار ہے جس کے اندر گزشتہ پندرہ صدیوں کے دوران مسلم معاشروں میں خواتین کا کردار دیکھا جاسکتا ہے۔

پاکستان کو بطور ایک اسلامی ریاست، نوآبادیاتی ورثہ سے اسلام کے سماجی نظام کی طرف پیش رفت کرنا تھی، اور اسی خواہش کا اظہار بانیٔ پاکستان نے بھی بار بار کیا تھا۔4 تاہم اس کی مخالفت زیادہ تر جاگیردار حکمران طبقے کی طرف سے کی گئی اور اس مخالفت کو تقویت نوکر شاہی اور ان ارکان پارلیمنٹ کی طرف سے ملی جو خود بھی اسی جاگیردارانہ پس منظر کے حامل تھے۔ ذات پات پر مبنی ہندو اکثریت کے ساتھ صدیوں پرانا میل جول عورتوں سمیت معاشرے کے دیگر طبقات کی محرومیوں کی ایک اور وجہ تھی۔

حالیہ تاریخ میں پسماندہ طبقات کی بہتری و ترقی کی کوششوں کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ متعلقہ پارلیمنٹ اس حوالے سے قانون سازی کردے۔ اس نوعیت کی کاوشیں قانون ساز اداروں پر اعتماد اور خوش امیدی کی مظہر بھی ہیں، تاہم عمومی مشاہدہ یہی ہے کہ ان کوششوں کے محرکین خواتین کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کے اصل اسباب کی نشاندہی کرنے میں بالعموم ناکام رہے ہیں۔ موجودہ قوانین میں جو ترامیم حال ہی میں پیش کی گئی ہیں اور جن کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں موجود ہے، وہ بالعموم مندرجہ ذیل چار خصوصیات کی حامل ہیں:

(1) چونکہ قانون اپنا اختیار رعیت یعنی عوام سے حاصل کرتا ہے، اس لیے نئی قانون سازی اور موجود قوانین میں تبدیلیوں کے ذریعے خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی کے رجحانات کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

(2) عام زندگی میں خواتین کی نمایاں تر شمولیت اور انہیں معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی، قانونی اور سیاسی میدان میں حقوق دینے سے ان کے مرتبے میں اضافہ ہوگا اور انہیں زیادہ بااختیار بنانے اور معاشرے میں ان کی عظمت واحترام کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی۔

(3) خواتین کے نوکر شاہی (Bureaucracy)، دفاعی خدمات، پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں میں بڑھتے ہوئے کردار سے اقتصادی پیداواریت اور خوشحالی میں کئی گنا اضافہ ہوگا۔

(4) سیاسی نمائندگی جنس کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ قانون ساز اداروں میں خواتین کی موجودگی ان کے مطالبات اور مسائل کو حل کرنے کا لازمی سبب بنے گی۔

چونکہ مغربی اصولِ قانون اور ضابطہ اپنی بنیاد اور ابتداء کا جواز سماجی رسومات، تعامل اور روایات سے حاصل کرتا ہے، اس لیے معاشرتی تغیرات کے ساتھ قانون میں ترمیم، اس کی دوبارہ ترتیب اور تشکیل کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ 1860ء کی دہائی میں اور اس کے بعد برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں نے برصغیر میں متعدد قوانین متعارف کروائے گئے تاہم مغربی فلسفۂ قانون کے برعکس ان میں رعایا کے طرزِ زندگی اور مقامی معاشرے کے طرز ہائے فکر کا خیال نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر یہ قوانین برطانوی قوانین کا چربہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان قوانین کو لفظ ''پاکستان'' کے سابقے یا لاحقے کے ساتھ اپنا لیا گیا جب کہ متن اور مفہوم وہی رہے۔ یہاں تک کہ بعد میں کی جانے والی ترامیم سے بھی ان قوانین کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نمائشی تبدیلیاں ان میں کوئی قابلِ ذکر بہتری نہ لاسکیں۔

حالیہ عشروں میں سماجی تبدیلی اور آزادئ نسواں کی عالمی تحریکوں کے ردعمل میں برطانیہ اور متعدد دوسرے مغربی ممالک میں قوانین اور قانون سازی کے رجحانات میں واضح تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک خاص طور پر مصر، شام، سوڈان اور پاکستان میں جو یورپی اقوام کے نوآبادیاتی نظام کا حصہ رہنے کے تجربے سے گزر چکے ہیں، آزادئ نسواں کے علمبرداروں نے انہی نقوشِ قدم کی پیروی کو لازم جانا۔ اس تحریک کے نعروں میں ہر شعبۂ زندگی میں خواتین کے لیے مساوات، قانون اور پالیسی ساز اداروں میں ان کی مساوی موجودگی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کی مساوی نمائندگی شامل ہیں۔ چونکہ

چرچ خواتین کے حقوق کے بارے میں غیر ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا اور مغرب میں حقوقِ نسواں کی تحریک کا ایک اہم مفروضہ یہ بھی تھا کہ مذہب خواتین کے حقوق اور ان کی مطلوب آزادیوں کے خلاف ہے۔ نتیجتاً یہ رائے قائم ہوئی اور بعد ازاں ایک اعتقاد کے طور پر پھلی پھولی کہ آزادئ نسواں کے مقاصد کے حصول کے لیے مذہب سے تعلق ختم کرنا ہوگا۔ اس پس منظر میں یورپی تحریکِ مساوات میں لادینیت تو قابلِ فہم ہے لیکن مسلمان معاشروں میں یہ سوچ اور طرزِ فکر قطعی غیر منطقی اور بے بنیاد ہے۔

خواتین کے حقوق کے لیے دنیا بھر میں جاری بحث اس حوالے سے اہم ہے کہ مشرق اور مغرب کی سماجی اور قانونی تاریخ میں خواتین کی حالت بالعموم ناگفتہ بہ رہی ہے۔ اس لیے قانون میں اصلاحات کی تحریک اس حوالے سے تو تحسین کی مستحق ہے کہ اس نے تبدیلی کو انسانی زندگی کا مستقل شعار سمجھ کر حالات کی نئی صورت گری پر زور دیا ہے۔ تاہم پاکستان میں قانون میں تبدیلی یا ترمیم کو قانونِ الٰہی یعنی شریعت کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ قانون میں وقتاً فوقتاً تبدیلی یا ترمیم تمام متحرک اور ترقی پذیر معاشروں کا خاصہ ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین بشمول اسلامی قانون (فقہ) تبدیلی کے اس عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔

بہتری، تغیر اور نشوونما کے اسی عمل نے اسلام میں کم از کم چھ معروف فقہی مسالک کو جنم دیا۔ اسلامی قانون کے ماہرین (فقہا) نے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق فقہ کے اصولوں اور قواعد کی رُو سے اسلامی قوانین میں تبدیلی کے مسلسل عمل میں اپنے تجربے اور تحقیق کو شامل کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور اہلیت کا لوہا منوایا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم شراب نوشی کی سزا کا حوالہ دیں گے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سمیت اپنی شوریٰ کے ارکان کے مشورے سے شراب نوشی پر 80 کوڑوں کی سزا مقرر کی۔ ایک عشرے کے بعد خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سزا کو کم کر کے 40 کوڑے مقرر کر دی- جو چیز ناقابلِ ترمیم رہی، وہ شریعت (قرآن وسنت) تھی جس کے تحت شراب نوشی پر سزا کم سے کم 40 کوڑے تھی۔[5]

بدقسمتی سے حقوقِ نسواں کی تحریک کے مغربی اثر کی اندھی تقلید میں، نیز شریعت کی بطور قانونِ الٰہی

اصل حیثیت سے عدم واقفیت کی بناء پر اسلام کی ترجمانی کرنے والے متعدد افراد بھی فقہ اور شریعت کے درمیان فرق کو محسوس کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ شریعت تو اللہ کا حکم ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی مثلاً شراب نوش کو لازماً سزا دی جائے اور زنا پر مقررہ حد جاری کی جائے۔ جبکہ فقہ کا مطلب وہ قانون سازی ہے جو شریعت کے اصولوں اور اس کے ناقابل تبدل احکامات کی روشنی میں کی جاتی ہے اور فقہ میں ترمیم یقیناً ممکن ہے۔ اس کے تحت تعزیری سزا کو اس وقت کے سماجی حالات کی روشنی میں زیادہ یا کم کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی بڑے پیمانے پر پھیلنے لگے تو حدود اللہ کا خیال کرتے ہوئے اس حکم کی پامالی کی سزا میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے اسلامی شریعت اور فقہ کے اس کثیر الجہتی، قرینِ عقل اور اطلاقی پہلو کو ان متعدد افراد نے نہیں سمجھا جو مغرب میں جاری قانونی اصلاحات کی تحریکوں کی تقلید کے جوش میں الہامی احکامات پر نظرثانی کی حد تک آزاد اجتہاد کی بات کرتے ہیں۔

دین کے ان دو پہلوؤں (شریعت اور فقہ) کو واضح طور پر سمجھ نہ پانے کی وجہ سے بعض اہلِ علم بھی قانونِ وراثت، قانونِ شہادت، قانونِ جنگ وامن اور خواتین کی سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں ترقی جیسے بنیادی اور انتہائی اہم معاملات میں غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔[6] حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر جنس، نسل اور رنگ کی بنیاد پر نہیں بلکہ عدل وانصاف، مساوات اور ایمانداری پر مبنی ہوتا ہے۔

لوگوں کی زندگیوں کو ترتیب دینے والے قوانین اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے ان میں کی جانے والی ترامیم صرف اسی وقت اور اسی صورت میں موثر ہوسکتی ہیں جب ان قوانین کے مخاطبین ان کا احترام کریں۔ اگر ایک معاشرہ صنفی، سیاسی، قبائلی، ثقافتی یا دوسرے امتیازات کی بنیاد پر مسلسل دوہرے معیارات کا خوگر ہو تو بیشتر صوتوں میں قانونی ترمیمات ایک دفتری مشق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ قانون کو موثر بنانے کے لیے سماجی حقائق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر عوام کے طرزِ عمل، رویوں اور ذہنی سوچ میں تبدیلی مقصود ہو تو قانون کو ہر طرح کی صورتِ حال میں اوّلین ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا درست طرزِ عمل نہیں۔ قانون اسی وقت مؤثر ہوگا جب معاشرہ اسے قبول کرنے کے لیے پہلے سے ایک حد تک تیار ہو چکا ہو۔ عوام کے طرزِ عمل، سوچ اور رویوں کو تعلیم پر مبنی حکمتِ عملی اور قانون کی عقلی بنیادوں کے

حوالے سے اعتماد پیدا کر کے تبدیل کرنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں عوام قانون کی پیروی پر رضامند ہوں گے۔

پاکستانی معاشرے کو بانیان پاکستان کے تصور کے مطابق تعمیر کرنے کے لیے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی سے قبل دنیا کے حوالے سے بنیادی رویئے کو ایک اخلاقی تربیت اور ہمہ جہت تبدیلی کی بنیاد پر استوار کرنا ضروری ہے۔ ہماری نظر میں خواتین کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں عددی طور پر مساوی نمائندگی دینے سے عورتوں کے مسائل کم نہیں ہوں گے۔ اس قسم کی مثبت تبدیلی کے لیے سب سے پہلے ایک انقلابی نظریاتی تبدیلی لانا ہوگی اور اس حقیقت کو دل و جان سے تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ نے خواتین کو قانونی، اقتصادی اور سماجی حقوق نہ صرف نظریاتی طور پر، بلکہ معاشرتی حقیقت کے طور پر عطا کیے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کرنا ہوگا کہ یہ حقوق عدل، انصاف اور مساوات کے اصولوں کی بنیاد پر دیے گئے ہیں، جن کی تشریح معاشرے میں اس کے حالات اور وقت کی ضروریات کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ حقوق نسواں اور خواتین کو بااختیار بنانے کی تحریک کے دورِ حاضر کے لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین صنفی مساوات اور قانونی تحفظات کے باوجود عزت اور وقار حاصل کرنے میں ابھی تک ناکام ہیں۔ صنفی مساوات کی حامی ایک معزز علمی شخصیت نے حال ہی میں اس حوالے سے یہ اعتراف کر کے بہت سے لوگوں کو سوچنے کے لیے اچھا مواد دیا ہے کہ "مغرب میں حقوقِ نسواں کی تحریک کا زور ٹوٹ چکا ہے جب کہ ترقی پذیر دنیا کی متعدد خواتین اس فریب کے تحت زندگی گزار رہی ہیں کہ وہ (مغرب کی خواتین) مرد کی برتری پر مبنی نظام کے خلاف جنگ لڑ کر فتح مند ہوئی ہیں۔ یہ تصور واضح طور پر اس حقیقت کے خلاف ہے جس کا سامنا مغربی عورت اپنی روزمرہ کی زندگی میں کر رہی ہے۔"[7]

تاہم یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمان علما اور اسلام کے فعال کارکن، جن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عدل کے فروغ اور خواتین کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حقوق کے لیے پیش رو کا کام کریں گے، خواتین سے متعلق متعدد معاملات میں قائدانہ کردار ادا نہیں کر سکے۔ بلکہ ان لوگوں کو جو سیکولر سوچ کے مالک ہیں، پارلیمنٹ اور دوسری جگہوں پر عورتوں کے حقوق کے علمبرداروں کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

خواتین کے اختیار سے متعلق مقدار یا تعداد کی بنیاد پر کی جانے والی اکثر تحقیقات میں ایک اہم پہلو جو اکثر نظر نہیں آتا، وہ عام زندگی میں خواتین کی شرکت اور پیشہ ورانہ و صنعتی شعبے میں ان کی شرکت میں اضافے کا ان کی خانگی زندگی پر اثر ہے۔ مغرب میں حقوقِ نسواں کی تحریک نے خاندان میں خواتین کے کردار کو کم اہمیت دی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد کی سرمایہ دارانہ سوچ نے کارخانوں اور دفاتر میں خواتین محنت کشوں کو معاوضے کے لحاظ سے سستی افرادی قوت جانا اور اسی سوچ کے تحت گھر سے باہر معاشی سرگرمی میں شرکت نہ کرنے والی عورت کی خاندانی زندگی کامیاب بھی ہو تو اسے اقتصادی طور پر غیر فعّال قرار دیا۔ بعد میں جب مغرب میں خواتین نے اپنے حقوق کے لیے بحث اور جدوجہد شروع کی تو انہوں نے اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا مقدمہ ترتیب دیا اور خاندان کی نشوونما کے بہترین کردار کی بجائے اپنے لیے مساوی اجرتوں کا مطالبہ کر دیا۔ اسلام میں خاندان کوئی تجارتی اکائی (کمرشل یونٹ) نہیں ہے، جہاں خوراک، رہائش اور چند افراد کے ساتھ تعلق کی سہولت دستیاب ہوں بلکہ اس کی اہمیت فوری مالی فوائد کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ خاندان، تہذیب اور تمدن کی بنیادی اکائی ہے۔ یہ خاندان ہی ہے جس کے ذریعے بنیادی انسانی اقدار آنے والی نسلوں کو منتقل کی جاتی ہیں۔ اگر خاندان کو غیر اہم کر دیا جائے تو تہذیبی عمل روبہ تنزل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان تحقیقات میں جہاں سرمایہ دارانہ عالمی نظام میں خواتین کے اقتصادی کردار پر توجہ مرکوز کی گئی ہے وہاں اس بڑی معاشرتی قیمت کو کماحقہ بیان نہیں کیا گیا جو خواتین کو بااختیار بنانے کے عوض چکانا پڑتی ہے۔ اس لیے حقیقی مطالعے اور گھر سے باہر معاشی سرگرمی میں شریک خواتین پر پڑنے والے ذہنی دباؤ، روابط میں دَر آنے والی دوریوں، اعتماد کے مسائل اور تنازعات کو جانے بغیر کوئی معیاری سروے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ عام زندگی میں خواتین کی موجودگی نے ان کا معیارِ زندگی حقیقتاً بلند کر دیا ہے اور معاشی لحاظ سے تیزی کا رجحان اسی عمل کا مرہونِ منت ہے۔

پارلیمنٹ میں مساوی سیاسی نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں میں عددی طور پر یکساں مواقع کا نعرہ بھی بظاہر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ پارلیمنٹ اور سرکاری اداروں میں مردانہ غلبے کی وجہ سے خواتین کے حقوق حاصل نہیں کیے جا سکتے اور نہ ہی ان کا تحفظ کیا جا سکتا ہے اور خواتین کی متناسب نمائندگی کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے جدوجہد کرنے کے قابل ہو جائیں گی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ

یہ متناسب نمائندگی کا نہیں بلکہ معاشرے کی اقدار کا معاملہ ہے۔ اس امر کو ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں خواتین کو سیاسی معاملات میں مشورہ دینے کا حق حاصل تھا۔ یہاں تک کہ انہیں کھلی عدالت میں خلیفہ کی رائے پر اعتراض کرنے کا حق بھی تھا۔8 اس کے برخلاف دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں میں عوامی زندگی میں خواتین کے نمایاں کردار کے باوجود اِن کی خستہ حالی کی رپورٹیں اور شکایات چشم کشا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں عدل اس کے ارکان کی زندگیوں میں جاری نہ ہو، حقوق کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ معروضی طور پر بات کی جائے تو یہ مفروضہ بنیادی طور پر ناقص ہے کہ پالیسی ساز اداروں میں صرف عورتوں کی متناسب نمائندگی سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی معاشرے میں روانڈا 9 کی طرح پارلیمنٹ میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی نشستیں زیادہ ہوں تو پارلیمنٹ مردوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کرے گی اور ہمیشہ ان کے مفادات کے خلاف قانون سازی کرے گی؟ کیا عددی اکثریت کی بنیاد پر قائم جمہوری نظام میں یہ بنیادی خامی ہے کہ وہاں صنف، مذہب یا کسی دوسری بنیاد پر جو بھی اقلیت میں ہوگا، اس کی حیثیت کم تر رہے گی اور وہ استحصال کا شکار رہے گا؟

ریاستی نظام میں اسلام کا بنیادی اصول عدل ہے، جو ہر ایک کو اس کا حق دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ کوئی ایسا ''جمہوری'' اصول نہیں ہے جو صنف کی بنیاد پر طے پاتا ہے، بلکہ انصاف کا یہ الٰہی اصول مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ اسی طرح اسلامی ضابطہ اخلاق بھی کسی مرد کے متعصّبانہ ذہن کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ یہ مرد اور عورت دونوں کے خالقِ حقیقی نے اس دنیا میں اتارے ہیں۔ وہ صنف کی بنیاد پر پسند یا ناپسند سے بالاتر ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک ایسی ریاست میں جس کا واضح اور متفقہ اصول یہ ہے کہ پوری کائنات پر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے،10 اور سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی و ثقافتی، غرض ہر دائرے میں حاکمِ مطلق وہی ہے، ہر معاملے میں فیصلہ کن عنصر یہ ہوگا کہ الہامی ہدایت کی روشنی میں اخلاقی طور پر کیا چیز اچھی یا بری ہے۔ اس اصول کے تحت یقینی طور پر دونوں صنفوں کے حقوق کی پاسبانی ہوگی۔ بصورتِ دیگر صنف کی بنیاد پر حقوق اور مراعات کی دوڑ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ معاشرتی علوم کو اس طرح ازسرِنو ترتیب دینا ہوگا کہ معاملے کی کلیت کو سمجھا جاسکے اور اس کا ایسا جامع حل نکل سکے، جو مسئلے کی اصل

وجوہ کا سراغ لگا کر اسے حل کر سکے۔

اس غرض سے پاکستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں موجودہ قوانین کا ازسرنو جائزہ لیا جانا چاہیے اور قانون سازی کو قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق مرتب کیا جانا چاہیے۔ اب تک کیے جانے والے تمام تجربات نے ظاہر کر دیا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں محض قانونی اصلاحات خواتین کی قسمت بدل نہیں سکتیں۔ اب وقت ہے کہ انسان کے سوچے اور روبہ عمل لائے گئے تمام اقدامات اور طریقوں کو اختیار کرنے کے بعد دنیا اسلام کے انقلابی پیغام کی طرف توجہ دے جو صنف کی بنیاد پر تصادم اور تنازع کی بجائے اخلاقی اصولوں پر استوار ہے۔ اسلام مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں معیاری قانون پیش کرتا ہے اور قانون کے ساتھ ساتھ خیالات، جذبات اور مقاصد کو بھی از سرِ نو استوار کرتا ہے۔ اسلام صنفی بالاتری یا کمتری کی سوچ سے پاک ہے۔ قرآن عالمی اخلاقی معیار متعارف کراتا ہے جس کا اطلاق مرد وخواتین سب پر ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''بے شک اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں، اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں، اور فرماں بردار مردوں اور فرماں بردار عورتوں، اور راست باز مردوں اور راست باز عورتوں، اور صبر کرنے والے مردوں اور صبر کرنے والی عورتوں، اور عاجزی کرنے والے مردوں اور عاجزی کرنے والی عورتوں، اور خیرات کرنے والے مردوں اور خیرات کرنے والی عورتوں، اور روزہ دار مردوں اور روزہ دار عورتوں، اور پاک دامن مردوں اور پاک دامن عورتوں، اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مردوں اور بہت یاد کرنے والی عورتوں کے لیے بخشش اور بڑا اجر تیار کیا ہے''۔ 11

اس آیت میں قرآن مردوں اور عورتوں کے درمیان تین حوالوں سے مساوات کو نمایاں کرتا ہے۔ اولاً، عقیدے کی سطح پر مردوں کو عورتوں پر کوئی فضیلت نہیں۔ دوم اخلاقی رویے کی سطح پر یعنی صداقت، پاک دامنی، معاشرے کے لیے مفید طرزِ زندگی، غریبوں اور ضرورت مندوں کا خیال وغیرہ۔ تیسری سطح بدلے اور جزا کی ہے، یعنی فیصلے کے دن جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآن نسلی اور قبائلی وابستگیوں سے بھی بالاتر ہو جاتا ہے۔ جو بات کسی بھی مرد یا عورت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کا اخلاقی طرزِ عمل ہے اور اس کا فیصلہ بھی ہر بات جاننے والا اور دانائے کل اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا۔ دیگر حوالوں سے تمام خواتین اور مرد اپنے معاملات اور عمل میں مساوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لوگو، ہم

نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے''۔12

کُلّی اور جامع اصلاح کی سوچ کے تحت اسلام انسانی تعلقات کو ''معروف'' کی عالمگیر قدر پر پروان چڑھاتا ہے، جس سے مراد اخلاقی لحاظ سے اچھائی اور انصاف وعدل پر مبنی رویہ ہے۔ اس قدر کا اطلاق صرف اخلاقیات پر نہیں ہے بلکہ اسلام کے قانونی نظام کا بنیادی اصول بھی یہی ہے۔ اسلام کی تمام قانونی تعلیمات میں معروف، عدل (انصاف اور مساوات)، برّ (نیکی) اور حق (سچائی اور حق) کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ مقامی روایات اور رسوم کی قانون وضابطوں اور اقدار میں ترقی اور ارتقا کا معاملہ نہیں بلکہ اسلامی قانون دراصل الہامی اخلاقی اقدار کی مکان وزمان کی جہتوں میں منتقلی کا نام ہے۔

اس لیے قانون کی ضابطہ بندی کے ساتھ ساتھ فرد، خاندان اور معاشرے کی اخلاقی تربیت بھی لازمی ہے۔ اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ قانون اور قانونی اصلاحات اس وقت تک حقوق کی پامالی کو روک نہیں سکتے جب تک مرد اور خواتین اپنے صنفی تعصب اور انا پر قابو نہ پا لیں۔ قانون کی اثر پذیری کے لیے رویہ اور ذہنیت میں تبدیلی شرطِ اولین ہے۔ خواتین کے متعلق پاکستان یا کسی اور جگہ قانونی اصلاحات کا فائدہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب تعلیم، مثبت خاندانی اقدار کی آئندہ نسلوں کو منتقلی اور میڈیا کی عملی شراکت کے ذریعے لوگوں کی سوچ اور رویے اس طرح تبدیل کیے جائیں کہ لوگ معاشرتی ذمہ داری کے بوجھ کو محسوس کرنے لگیں۔ ایک دفعہ اگر اخلاقی اقدار عام آدمی کے اندر پیدا ہو جائیں تو تمام ذاتی، معاشرتی، سیاسی یا اقتصادی اقدامات کا جائزہ کسی جذباتی ذہانت (emotional intelligence) سے پہلے ہی ایک خودکار اخلاقی احتساب لے لیتا ہے۔ اس اخلاقی تصور سے مزین شخص کبھی بھی اپنی شخصیت، انانیت، خود پسندی یا اپنی حیوانی جبلت مثلاً غصے، دباؤ، بے چینی، خوف یا اپنی ذات کو لاحق خطرات کی بنیاد پر کوئی کام نہیں کرتا۔ کسی چیز کا حلال، حرام، مباح، مکروہ، مصلحتِ عامہ پر مبنی یا ضرر کا باعث ہونا ہی وہ معیارات ہیں جو اس اخلاقی نقطۂ نظر کے حامل فرد کے افعال وکردار کا تعین کرتے ہیں۔ اخلاقی ذہانت (ethical intelligence)[13] ہی جلد یا بدیر نازک اور تزویراتی فیصلے کرنے کی محرک ہوتی ہے

یہ انسانی رویوں اور طرزِ عمل کا تعین کرتی ہے، انسان کو سرکشی پر مبنی ردّعمل سے روکتی ہے، صنفی اور دیگر تعصّبات سے بلند تر کرتی اور اس کے ہر عمل کو اخلاق کا پابند اور مبنی بر عقل بناتی ہے۔ اخلاقی ذہانت کے حامل مرد اور خواتین کسی بھی فعل کی اخلاقی حیثیت جانچنے کے بعد اخلاقیات ہی کی بنیاد پر اپنے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی یا انتہائی ذاتی معاملات میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔

پاکستان میں خواتین اور خاندان سے متعلق جاری مباحث کو جاننے کے لیے 2008ء سے 2013ء کے دوران پارلیمان میں پیش کردہ مسودات جہاں موجودہ رجحانات اور سوچ سے آگاہی کا موقع دیتے ہیں بلکہ واضح طور پر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ادارہ جاتی اور طریق کار کی خامیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ معاشرے میں موجودہ رویّوں، ترجیحات اور تصورات اور سوچنے کے انداز کو بھی مدّنظر رکھنا ہوگا۔ ایک حقیقی نظریاتی تبدیلی اسی وقت ظہور پذیر ہوسکتی ہے جب معاشرے میں اسلامی اخلاقیات اور عدل کی قرآنی تعلیمات کو رُوبعمل لایا جائے۔

.....

حواشی

1۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے افسران کے خطبہ استقبالیہ کی جوابی تقریر جو قائداعظم نے 28 دسمبر 1947ء کو کراچی میں کی۔

2۔ البقرۃ 228

3۔ الاحزاب 35

4۔ قائداعظم محمد علی جناح کے متعدد بیانات ہیں، جن میں انہوں نے پاکستان کے تصور کی وضاحت کی تھی۔ حوالے کے طور پر یہ دو اقوال ملاحظہ فرمائیں: ''سماجی تخلیقِ نو اور سیاسی آزادی کے تمام پہلوؤں کا انحصار بالآخر کسی ایسی بات پر ہونا چاہیے جس کے زندگی میں گہرے معانی ہوں جو، اگر آپ مجھے کہنے کی اجازت دیں تو، اسلام اور اسلامی روح ہے۔'' اور یہ کہ ''قیام پاکستان جس کے لیے ہم گزشتہ دس برس سے جدوجہد کر رہے تھے، اللہ کے فضل سے اب ایک حقیقت ہے۔ لیکن ہماری اپنی ریاست کا قیام ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا، خود ایک مقصد نہیں تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی ریاست چاہیے جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ اور سانس لے سکیں، جس کو ہم اپنی ثقافت کے مطابق ترقی دے سکیں اور جہاں اسلام کے سماجی انصاف کے اصولوں کے مطابق آزادانہ کام کرنے کا موقع ملے۔'' (رضوان احمد: اقوالِ قائداعظم محمد علی جناح، کراچی۔ قائداعظم فاؤنڈیشن اور پاکستان موومنٹ سینٹر، 1993ء)

5۔ صحیح مسلم، باب: شراب نوشی پر حد

6۔ دیکھیے: انیس احمد، Women and Social Justice: An Islamic Paradigm آئی پی ایس، اسلام آباد، 1996ء۔ باب سوم، چہارم، پنجم اور ششم۔

7۔ فرزانہ باری: ''کیا واقعی مغرب میں مرد اور خواتین برابر ہیں؟''، دی ایکسپریس ٹریبیون، اسلام آباد، 19 مارچ، 2013ء

8۔ برائے حوالہ: خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے ایک خاتون کے اعتراض پر مہر کی رقم پر حد لگانے کے اپنے اصل فیصلے کو تبدیل کر دیا تھا۔

9۔ بین الاقوامی پارلیمانی یونین (IPU) کے اعداد و شمار کے مطابق روانڈا کے ایوان بالا کی 56.3 فیصد نشستوں پر خواتین براجمان ہیں۔ www.ipu.org/wmn-e-/classif.htm (آخری رسائی 3 جون 2013ء)

10۔ حوالہ: اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کا دیباچہ

11۔ الاحزاب 35

12۔ الحجرات 13

13۔ میں نے Ethical Intelligence کی یہ اصطلاح علمِ نفسیات کی معروف اصطلاح جذباتی ذہانت (Emotional Intelligence) کے جواب میں وضع کی ہے، جس سے مراد حالات کے مطابق ردِّعمل ظاہر کرنے والے فرد پر عالمی اخلاقی اقدار کو تسلیم کرنے والے فرد کے امتیاز کو واضح کرنا ہے۔ دیکھیے، غیر طبع شدہ مقالہ: انیس احمد، Emotional Intelligence: An Islamic Perspective۔

.....

باب اوّل

شادی اور خاندان سے متعلق قوانین اور مسوّداتِ قوانین

اس باب میں ان قوانین اور مسوداتِ قانون کو زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے جن کا تعلق براہِ راست خاندان کے ادارے سے ہے۔اس نسبت سے آئندہ صفحات میں میں خفیہ شادی، کثرتِ ازدواج، جبری شادی، قرآن کے ساتھ شادی، بچوں کی کفالت، دودھ پلانے والی ماں کا نفقہ، بچوں کی حضانت(Custody)، گھریلو تشدد اور عورتوں کی عزت و وقار سے متعلق موضوعات پر مجوزہ قوانین اور ان پر مشاہدات شامل ہیں۔

خفیہ شادی

فوجداری قوانین (ترمیمی) بل 2009ء

محترمہ ماروی میمن[1] نے بعض ایسے مسائل کے ازالے کے لیے فوجداری قوانین میں ترامیم تجویز کیں، جن کا معاشرے میں چلن عام سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک کا تعلق خفیہ شادی سے ہے۔ اس مسودۂ قانون میں تجویز کیا گیا کہ ضابطہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء میں دفعہ 493۔ب کے اضافہ کے ذریعے یہ قانون بنا دیا جائے کہ شادی کا خواہشمند کوئی شخص اگر اُس کو جس سے شادی کی جارہی ہے، یہ بتائے بغیر کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے، دوسری یا مزید شادی کرے گا تو وہ دس سال تک کی قید اور جرمانے کا مستحق ہوگا۔

عنوان: فوجداری قوانین (ترمیمی) بل 2009ء
پیش کار: ماروی میمن، مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 14 اپریل 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

بل کی محرّکہ (Mover) نے مسوّدۂ قانون کے مقاصد اور وجوہ کے بیان میں یہ موقف پیش کیا کہ اگرچہ قانون یہ تقاضہ کرتا ہے کہ شادی کے وقت ازدواجی حیثیت کا اظہار کیا جانا چاہیے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات ہونے والی بیوی کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیے بغیر دوسری، تیسری یا چوتھی شادی کر لی جاتی ہے۔ گویا یہ شادی ابتدا سے ہی فریب اور مکاری پر مبنی اور غیر شفاف انداز میں ہوتی ہے۔ اس طرح یہ تمام معاملہ اسلامی احکامات کی خلاف ورزی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

موجودہ قانون اور عمل

ضابطہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء کی دفعہ 494 میں ایسے فرد کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے جو اپنے خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران شادی کرتا ہے۔ دفعہ 495 ایسے فرد کے لیے سزا تجویز کرتی ہے جو

خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران مزید شادی کرتے ہوئے متعلقہ فرد سے پہلی شادی کو خفیہ رکھے۔

دفعات 494 اور 495 کا متن درج ذیل ہے:

"494 – خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران دوبارہ شادی کرنا: جو کوئی خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران ایسی شادی کرے جو خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے فاسد ہو تو ایسے فرد کو کسی بھی نوعیت کی قید کی سزا دی جائے گی، جس کی مدّت سات سال تک ہوسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

استثنیٰ: اس دفعہ کا اطلاق کسی ایسے فرد پر نہیں ہوگا جس کی شادی مذکورہ خاوند یا بیوی کے ساتھ کسی مجاز عدالت سے فاسد قرار دی جا چکی ہو۔ نہ ہی (اس کا اطلاق) اس فرد پر ہوگا جو سابق خاوند یا بیوی کی زندگی کے دوران شادی کرے، اگر ایسا خاوند یا بیوی اس دوسری شادی کے وقت اس فرد سے سات سال کی مدت تک مسلسل غیر حاضر رہے، اور اس عرصے کے دوران اس کے زندہ ہونے کی کوئی خبر نہ سنی گئی ہو، بشرطیکہ دوسری شادی کرنے والا فرد شادی کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اُس فرد کو جس سے شادی ہو رہی ہے، اُن اصل حقائق سے آگاہ کرے جو اس (مرد یا عورت) کے علم میں ہوں۔"

"495: جس سے دوسری شادی کی جا رہی ہو اس سے پہلی شادی کو خفیہ رکھ کر یہی جرم کرنا: جو شخص گزشتہ دفعہ میں تصریح کردہ جرم کا ارتکاب اس فرد سے جس سے بعد میں شادی کی جا رہی ہے، پہلی شادی کو خفیہ رکھ کر کرے گا، اس کو کسی بھی نوعیت کی قید کی سزا دی جائے گی، جس کی مدت دس سال تک ہوسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔"

مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کے تحت بھی سابقہ نکاح کی موجودگی میں مزید شادی کے مسئلہ کا ذکر موجود ہے۔ اس آرڈیننس کو دوسرے تمام قوانین، رسوم و رواج اور اس کے نفسِ مضمون کے حوالے سے استعمالات پر فوقیت حاصل ہے۔[2] آرڈیننس کی دفعہ 6 موجودہ بیوی یا بیویوں کو، جو بھی صورت ہو، اطلاع دیے بغیر اور ثالثی کونسل[3] کی اجازت کے بغیر دوسری یا اس کے بعد شادی کی ممانعت کرتی ہے۔ اس دفعہ کی خلاف ورزی پر قیدِ محض جو ایک سال تک ہوسکتی ہے، یا پانچ ہزار روپے جرمانہ یا

دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔اس طرح تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 494 غیر مؤثر ہوگئی ہے، تاہم دفعہ 495 مؤثر ہے۔

مشاہدات

اس بل میں ضابطہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء کے باب20 میں دفعہ 493 -ب شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔اس میں اس شخص سے پہلی شادی کو خفیہ رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے، جس سے بعد میں شادی کی جارہی ہو۔دفعہ 495 بھی اسی باب میں موجود ہے، جس میں وہی ضابطہ موجود ہے جو محرک نے تجویز کیا ہے۔

پہلی بیوی سے دوسری شادی کرنے کو خفیہ رکھنے کے جرم سے مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء میں بھی نمٹا گیا ہے۔ایک جیسے جرائم کے لیے دونوں قوانین میں تجویز کردہ سزائیں یکسر مختلف ہیں۔تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے کی دفعہ 495 میں یہ سزا مجرم کے لیے زیادہ سے زیادہ 10 سال قید تجویز کرتی ہے جبکہ مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1961ء کی دفعہ 6 موجودہ بیوی یا بیویوں کو بتائے بغیر دوسری شادی کی ممانعت کرتے ہوئے ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں تجویز کرتی ہے۔

ضابطہ تعزیراتِ پاکستان میں ترمیم تجویز کرنے والے اس بل میں مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کے دوسرے شیڈول میں حسبِ ترمیم تبدیلی کی تجویز شامل ہونی چاہیے تھی، جو مسوّدہ قانون میں موجود نہیں ہے۔

تبصرہ

شادی کا رشتہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو نہ صرف دو افراد کو ایک مضبوط بندھن میں جوڑتا ہے بلکہ دو خاندانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ایجاب وقبول کرنے والے زوجین میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا آغاز ایک نئے عزم، ذمہ داری اور خوشگوار خواہشات کے ساتھ کرتا ہے۔پھر یہ بندھن ایک دن، ہفتہ یا مہینہ کے لیے نہیں بلکہ بقیہ پوری زندگی کے لیے خوشی اور غم کے لمحات میں ایک دوسرے کے ساتھ مل

کر چلنے کا عہد بھی ہے۔ یہ بعض حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کا ذریعہ بھی ہے۔ اگر اس معاہدہ کی بنیاد ہی دھوکہ دہی، بد دیانتی، جھوٹ اور منافقت پر ہوگی، تو شاید اس سے زیادہ اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والا اور ناپسندیدہ عمل کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ ایک فرد نکاح کے فریضے کی انجام دہی کے دوران اپنی ازدواجی حیثیت کے بارے میں جھوٹ بول کر نہ صرف اس دوسرے فریق کے اعتماد کو پارہ پارہ کرتا ہے، جس نے اس کے ساتھ پوری زندگی کے لیے وفادار رہنے کے لیے مخلصانہ طور پر اظہارِ رضامندی کیا ہے، بلکہ وہ نکاح کی تقریب میں موجود شرکاء کے ساتھ بھی غلط بیانی کرتا ہے۔ ایسا فرد نکاح کی قانونی دستاویز میں غلط اندراج کا مرتکب بھی ہوتا ہے، جو ایک سرکاری دستاویز ہے۔ گویا یہ فرد ریاست اور معاشرے کے خلاف بیک وقت جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

اس لیے یہ اہم ہے کہ اس عمل کا مؤثر طور پر سدّ باب کیا جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 495 اور مسلم عائلی قوانین آرڈیننس کی دفعہ 6 کو کئی پہلوؤں سے موافق بنانا ہوگا۔ اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جرائم میں مماثلت کے باوجود تصریح کردہ سزائیں بہت زیادہ غیر متناسب ہیں۔ یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ پہلی شادی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرنا عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آتا ہے، جبکہ حسبِ قانون اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کے جرم پر مقدمہ سیشن عدالت میں چلایا جاتا ہے۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے ایک بہتر راستہ یہ ہوسکتا ہے کہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۴۹۵ میں مذکور جرم کو عائلی عدالتوں کے دائرۂ کار میں شامل کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف قانون میں موجود الجھن ختم ہو جائے گی بلکہ متاثرہ خواتین کے لیے انصاف کا حصول بھی زیادہ مؤثر اور کم خرچ ہو جائے گا۔[4] دفعہ 495 کے تحت جرم کو ناقابلِ ضمانت اور ناقابلِ مصالحت نہیں ہونا چاہیے اور عائلی عدالتوں کو فریقین کے درمیان مصالحت کرانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ پہلی شادی کو خفیہ رکھنے کی وجہ سے شادی ناجائز نہیں ہو جائے گی۔[5] دوسری بیوی کو، جو اس صورت میں متاثرہ فرد ہے، یہ اہم فیصلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو اس بد دیانتی پر سزا دلوانا چاہتی ہے یا اس کی غلطی کو نظر انداز کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ جرم کو ناقابلِ ضمانت اور ناقابلِ مصالحت برقرار رکھنا عورتوں کے حقوق اور خاندان کے لیے نقصان دہ ہوگا اور ایسا ہر معاملہ لازماً زوجین کی علاحدگی کی صورت اختیار کرے گا۔

اس بات کو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ پہلی شادی کی موجودگی میں مرد کی شادی (کثرتِ ازدواج)، عورت کی دوسری شادی (کثیر شوہری) سے مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ مسودہ قانون اور دفعہ 495 کی زبان مذکر کے لیے خاص نہیں بلکہ کسی امتیاز کے بغیر مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے شامل ہے۔ اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ پہلی شادی کی موجودگی میں مردوں اور عورتوں کی دوسری شادی کو دینِ اسلام کے اساسی قواعد اور معاشرتی نظم کے پیشِ نظر مختلف انداز سے نمٹانا ہوگا۔

موجودہ قانون اور زیرِ بحث مسودۂ قانون، دونوں میں جس پہلو پر توجہ نہیں دی گئی ہے وہ دھوکہ دہی پر مبنی ایسی شادی میں نکاح کے عمل کے دوران نکاح خواں اور خاص طور پر گواہوں کا ملوّث ہونا ہے۔ طریقہ کار میں موجود خامیوں اور نقائص کو اچھی طرح سمجھ کر ان سے پیدا ہونے والے مسائل کے ازالے کے لیے بھی مناسب اقدامات کیے جانے چاہییں۔

سفارشات

- چونکہ مذکورہ دفعہ پہلے ہی قانون کی کتاب کا حصہ ہے، اس لیے ضرورت صرف تعزیراتِ پاکستان اور عائلی قوانین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے۔
- خفیہ شادی کی سزا سخت لیکن قابلِ ضمانت اور قابلِ مصالحت ہونی چاہیے، تاکہ خواتین اور خاندان کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔
- کثرتِ ازدواج اور کثیر شوہری دو مختلف تصوّرات ہیں۔ قانونی متن میں اس نوعیت کی باریکیوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔
- اگر دوسری شادی کے نکاح خواں، رجسٹرار اور گواہوں نے جان بوجھ کر دلہن اور دولہا کی ازدواجی حیثیت کے جھوٹے بیان کے ساتھ نکاح نامے کی توثیق کی ہے تو ان کے لیے سزا تجویز کی جائے۔

کثرتِ ازدواج

مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2010ء

اس مسودۂ قانون میں مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کی دفعات 6 اور 7 میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔اس قانون کی دفعہ 6 کثرتِ ازدواج کے بارے میں ہے۔اس دفعہ میں یہ تبدیلی تجویز کی گئی تھی کہ مصالحتی کونسل پہلی شادی کی موجودگی کے دوران دوسری شادی کی اجازت صرف اس صورت میں دے گی جب مرد نے اس مقصد کے لیے اپنی درخواست کے ساتھ تسلیم شدہ طبی معالج کا جاری کردہ سرٹیفکیٹ بھی منسلک کیا ہو جس میں واضح کیا گیا ہو کہ اس شخص کی پہلے سے موجود بیوی ناقابلِ علاج مستقل بیماری میں مبتلا ہے اور ازدواجی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل نہیں ہے۔

عنوان: مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2010ء
پیش کار: جسٹس ریٹائرڈ فخر النساء کھوکھر، پاکستان پیپلز پارٹی
بتاریخ: 4 مئی 2010ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

مسوّدہ میں یہ تجویز بھی موجود تھی کہ اگر کوئی شخص مصالحتی کونسل کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرتا ہے تو پہلے سے موجود تعزیری اقدامات کے ساتھ ''موجودہ بیوی کو شوہر کی وراثتی جائیداد میں، اگر موجود ہو تو، اس کا حق دیا جائے گا''۔سزا کی صورت میں جرمانے کی موجودہ حد کو پانچ ہزار روپے سے بڑھا کر ایک لاکھ روپے کرنے کی تجویز بھی دی گئی ہے۔

مزید برآں مسوّدہ قانون مسلم عائلی قوانین آرڈیننس کی دفعہ 7 میں اضافہ بھی تجویز کرتا ہے، جو طلاق دینے اور اس کے مؤثر ہونے کا طریق کار طے کرتا ہے۔اس دفعہ کی ذیلی دفعہ الف میں تجویز کردہ اضافہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کو بغض وسنکیّت کی بنا پر تشدد یا ذہنی کوفت کا نشانہ بنا کر

مزید شادی کے لیے رضامندی حاصل کرتا ہے تو وہ:

(الف) پہلی بیوی یا بیویوں کو زندگی بھر نان نفقہ دے گا؛

(ب) مہر کی پوری رقم ادا کرے گا، جو مالیانہ کے بقایاجات کے طور پر قابلِ وصول ہوگی؛

(ج) بیوی کو کم سن بچوں کی حضانت (Custody) سے محروم نہیں کرے گا؛

(د) مطلقہ بیوی کو بچوں کے گزارے کے اخراجات ادا کرے گا؛

(ہ) اگر مالی طور پر صلاحیت ہو تو اپنی بیوی کو اس گھر سے محروم نہیں کرے گا جس میں وہ طلاق سے پہلے رہ رہی تھی؛

(و) وہ اس کے ساتھ نکاح کے دوران پیدا ہونے والے کم سن بچے کو دودھ پلانے والی بیوی کو دو سال تک نفقہ ادا کرے گا، یہاں تک کہ عدت 6 کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی۔ عائلی عدالت مذکورہ رقوم کی وصولی کے لیے مالیانہ کی عدالت کے طور پر کام کرے گی۔

مسودۂ قانون کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کا بیان کچھ جس انداز میں کیا گیا ہے، ذیل میں اسے زبان و بیان میں کسی تصحیح کے بغیر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''پاکستان میں ہم نے دیکھا ہے کہ مردانہ برتری کے حامل معاشرے میں پہلی بیوی مشکل کا شکار رہتی ہے اور اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ قرآن مجید سورۃ نساء اور سورۃ نور۔ یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ پہلے نکاح سے پیدا شدہ بچے غیر متوازن حالات کے تحت ذہنی اور نفسیاتی طور پر بُری طرح متأثر ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کی روح کے مطابق یہ ترامیم بہت ضروری ہیں۔

ہزاروں عورتوں کو دوسری شادی کی خاطر اجازت دینے کے لیے یا تو مجبور کیا جاتا ہے، یا اگر وہ دوسری شادی کی اجازت نہ دیں تو انہیں طلاق دیئے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسی خواتین کو ذہنی اذیتوں اور کرب سے دوچار کیا جاتا ہے اور اس کو تمام ازدواجی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جب شادی ان حالات کے تحت مصالحتی کونسل کے پاس جائے بغیر ہو جاتی ہے تو یہ دوسری شادی بغض و سنگیّت کے نتیجے میں عمل میں آتی ہے اور قرآن کے احکامات کے خلاف ہوتی ہے۔''

موجودہ قانون اور عمل

موجودہ حالات میں اگر کوئی شخص پہلے سے شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسری شادی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1961ء کی دفعہ 6 کے مطابق مصالحتی کونسل سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ مصالحتی کونسل کے پاس دائر کردہ درخواست میں، جو تجویز کردہ فارم پر طے شدہ فیس کے ساتھ ہوگی، اس آدمی کو دوسری شادی کے لیے وجوہ بیان کرنا ہوتی ہیں، اور یہ بھی کہ کیا پہلی بیوی یا بیویوں کی رضامندی حاصل کی گئی ہے یا نہیں۔ مصالحتی کونسل یہ اجازت اس وقت دے گی جب تمام فریقوں کو سننے کے بعد اُسے یہ اطمینان ہو کہ مجوزہ شادی ضروری اور عادلانہ ہے۔ کوئی شخص جو مصالحتی کونسل کی اجازت کے بغیر مزید شادی کرتا ہے اس کے لیے قانوناً یہ لازم ہے کہ وہ موجودہ بیوی یا بیویوں کو مہر کی پوری رقم ادا کرے اور اسے ایک سال تک قید محض یا پانچ ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

تبصرہ

کثرت ازدواج تمام معاشروں اور ادوار میں بحث کا موضوع رہا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ شادی، باہمی محبت اور انتہائی قریبی تعلق پر مبنی ایک معاہدہ ہونے کی وجہ سے کسی تیسرے فریق کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ انسانی حقوق کے دیگر کئی تصورات کی طرح موجودہ دور میں کثرتِ ازدواج پر مکالمے کی جڑیں بھی مغرب کی عیسائی روایت سے جُڑی ہیں، جہاں اسے ایک لعنت اور برائی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔[7] اس رجحان کو بیان کرتے ہوئے ہیرالڈ برے (Herald Bray) نے لکھا ہے ''موجودہ دور میں بڑے پیمانے پر اتفاقِ رائے ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں غیر منصفانہ ہیں، ایسا شاید خواتین کے حقوق پر اصرار کی وجہ سے ہے جن کی نسبت سے ایک شادی میں موجود مساوات کو اہم قرار دیا جاتا ہے''۔[8]

عام حمایت پر مبنی مغربی اصولوں کے برعکس اسلام ایسے اصول اور احکامات بیان کرتا ہے، جو ہر زمان اور مکان میں کارآمد ہیں۔ سورۃ النساء کی تیسری آیت میں بیان کردہ اصول کے مطابق مرد کو ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کرنے کا اختیار ہے، بشرطیکہ وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ تمام اُمور میں عدل کی صلاحیت رکھتا ہو۔[9] تاہم اگر اُسے یہ خدشہ ہو کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف کرنے اور

ان کے درمیان مساوات برقرار رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تو قرآن اُسے حکم دیتا ہے کہ وہ ایک بیوی کو کافی سمجھے۔ گویا اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی تاہم اس کا دروازہ بالکل بند بھی نہیں کیا۔ کثرتِ ازدواج کا بطور موضوع مطالعہ اس بحث کے دائرے سے باہر ہے، لیکن یہ بات بہرحال کہی جاسکتی ہے کہ انسانی زندگی میں ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جہاں فلاح، افراد کے حقوق اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کے تحفظ کے لیے ایک سے زیادہ شادیاں ہی بہترین لائحۂ عمل طے پاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں ایک سے زیادہ شادیوں کی شرح واضح طور پر معلوم نہیں ہے، لیکن ملک کی سماجی حرکیات (Social dynamics) سے واقف کوئی بھی فرد آسانی سے نشاندہی کرسکتا ہے کہ پاکستان میں زیادہ تر گھرانے ایک شادی کی بنیاد پر آباد ہیں۔ خاص طور پر شہری علاقوں میں کثرتِ ازدواج کی مثالیں تو بہت کم ہیں۔ کثرتِ ازدواج پر مبنی گھرانوں میں بھی ایک سے زائد شادیوں کی وجہ بالعموم سماجی یا تہذیبی ہے، نہ کہ شہوانی، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔

مسلم عائلی قوانین آرڈیننس نے ایک سے زیادہ شادیوں کو کچھ پابندیوں کا تابع کرکے اس پورے عمل کو ایک رُخ دینے کی سعی کی تھی۔ متعدد مسلم علمائے کرام نے پہلی بیوی کی پیشگی رضامندی اور مصالحتی کونسل سے اجازت کو ریاستی اختیار میں غیرضروری توسیع قرار دیا ہے۔[10] چونکہ پاکستانی معاشرے میں شخصی زندگی کا نظام مسلمانوں کی حد تک اسلام کی تعلیمات اور رہنمائی کے تحت چلایا جاتا ہے، اس لیے مسلم عائلی قوانین آرڈیننس کی دفعات کو مذہبی بنیاد پر حمایت حاصل نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ قانون ابھی تک عوام میں قبولیت کی درکار سطح تک نہیں پہنچ سکا اور اس پر عمل سے زیادہ اس سے پہلوتہی کا رجحان نمایاں ہے۔

دفعہ 6 میں تجویز کردہ ترمیم

زیرمطالعہ مسودۂ قانون کے بارے میں اس امر کی نشاندہی کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ یہ قانونی اور معاشرتی صورتِ حال کو اچھی طرح جانے بغیر تیار کیا گیا ہے۔ پاکستان کے شہریوں کی شخصی زندگیوں سے متعلق کوئی قانونی دفعہ تجویز کرتے ہوئے ان معاشرتی بنیادوں کا خیال رکھنا لازم ہے جو بالعموم اسلامی

اقدار سے وابستہ ہیں۔ اس تناظر میں ایک سے زائد شادیوں کے امکان کو صرف اس ایک صورت تک محدود کرنے کی تجویز کہ جب پہلی بیوی اپنی مستقل ناقابلِ علاج بیماری کی وجہ سے ازدواجی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے قابل نہ ہو، اسلامی قانون اور معاشرت کے لیے نامانوس ہے اور پورے اسلامی قانون میں اس نوعیت کی پیشگی شرط کی کوئی نظیر یا شہادت موجود نہیں ہے۔ اس لیے خدشہ ہے کہ ایسی کوئی قانونی دفعہ عوام کو ملک میں رائج عائلی قوانین سے مزید لاتعلق کر دے گی۔ دی گئی تجویز کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ بیماری جو نئی شادی کی وجہ بن سکتی ہے، ایسی ہونی چاہیے کہ وہ بیوی کو حقوقِ زوجیت کی ادائیگی سے روکتی ہو۔ اس سے یہ سوچ جھلکتی ہے کہ انسان کی شادی کا واحد مقصد صرف بچوں کی پیدائش ہی ہے۔ اگرچہ شادی کا ایک مقصد افزائشِ نسل بھی ہے، لیکن یہی شادی کا واحد مقصد نہیں ہے۔ شادی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ایک خاندان کا قیام ہے، جہاں ہر شخص کے حقوق اور ذمہ داریوں کا واضح تعین ہوتا ہے، اور خاندان کے ارکان کے درمیان محبت والفت ان میں سے ہر ایک کی زندگی میں برکتیں اور امن لانے کا سبب بنتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی بھی فرد کے نسب کا معقول شک کے بغیر تعین نہایت اہم ہے اور اس کا ایک اہم مقصد دیگر افراد کی نسبت اس فرد کے حقوق اور ذمہ داریوں کا واضح تعین بھی ہے۔ اس کی اخلاقی و معاشرتی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'حفظ النسل' اسلامی شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اگرچہ ایک سے زائد شادیوں کے رواج کا حامل معاشرہ اسلام کا مطمعِ نظر نہیں ہے، لیکن ماورائے ازدواج جنسی تعلقات کو ممکن حد تک محدود کرنے کی غرض سے ایک سے زیادہ شادیوں کے امکان کو ختم بھی نہیں کیا گیا۔

بعض اوقات تو حالات انفرادی یا اجتماعی سطح پر ایسی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں کہ کثرتِ ازدواج ہی مناسب ترین انتخاب محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً شوہر اور بیوی کے درمیان بہت زیادہ فاصلے یا بیوی کی طویل بیماری یا معذوری کی صورت میں شوہر کے لیے معقول اور مبنی بر عدل ہوگا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ کئی صورتوں میں تو یہ امکان بھی موجود ہے کہ پہلی بیوی شوہر کو از خود اجازت دے کر اُسے ناجائز تعلقات قائم کرنے سے محفوظ رکھے گی۔ انسانی زندگی طرح طرح کی مثالوں اور مختلف حالات اور رویّوں سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی عورت یہ پسند نہیں کرے گی کہ اسے معاشرے میں بانجھ کی حیثیت سے جانا

جائے اور اس کی خواہش ہوگی کہ یہ بات اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان راز رہے۔ ایسی صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے کہہ سکتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ لیکن اگر ایسی صورت میں قانون مرد سے مطالبہ کرے کہ وہ دوسری شادی کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے پہلی بیوی کا طبی سرٹیفکیٹ پیش کرے تو یہ بڑی غیر منصفانہ بات ہوگی۔ اسی طرح یہ امکان بھی ہے کہ کوئی شخص اپنی شادی شدہ زندگی سے پوری طرح مطمئن نہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ اپنی بیوی کو اُنس یا بچوں کی خاطر چھوڑنا بھی نہ چاہتا ہو۔ اگر ایسے شخص کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جاتی تو ممکن ہے کہ وہ غیر اخلاقی تعلقات کی جانب مائل ہونے پر مجبور ہو جائے۔ انفرادی زندگی کی چند مثالوں کے علاوہ اجتماعی طور پر بھی بعض اوقات کسی قدرتی آفت، جنگ یا کسی دیگر وجہ سے خواتین کو پناہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوسکتی ہے اور ممکن ہے کہ یہ تحفظ انہیں صرف اس شخص کے ذریعہ دستیاب ہو جو پہلے سے شادی شدہ ہو۔ زیادہ شادیوں پر پابندی کی صورت میں ایسی مجبور خواتین کو بے آسرا، بے سہارا اور شاید بے گھر بھی رہنے پر مجبور ہوں گی۔ غرض انسانی معاشرے کے تنوعات میں امکانات کی کوئی حد نہیں، اور وہی قانون مفید اور میسر ہوگا جو ان امکانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیا جائے۔ انسانی زندگیوں کو کسی ایک ہی طے شدہ فارمولے یا نظام کے تابع کرنے کی سوچ غیر حقیقت پسندانہ ہے۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ موجودہ قانون کے مطابق پہلی بیوی کو شوہر کی دوسری شادی کے فیصلے میں رائے دہی کا اہم اور فیصلہ کن حق حاصل ہے۔ اس بات میں مختلف آراء ہوسکتی ہیں کہ آیا اس ضمن میں پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ مسوّدہ قانون میں پیش کردہ تجویز کے مطابق پہلی بیوی کی رضامندی یا عدم رضامندی، شوہر کی طرف سے پیش کردہ طبی سرٹیفکیٹ کے بعد غیر اہم ہوجائے گی اور ایسا سرٹیفکیٹ پیش کر دیئے جانے کے بعد پہلی بیوی کو ہر حال میں حالات سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔

ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ زندگی کے بارے میں انسانی رویے اور سوچنے کے انداز، بذریعہ قانون یا جبراً تبدیل نہیں کیے جاسکتے۔ ہر انسان کے ذہن میں یہ بات واضح کرنے کے لیے معاشرتی سطح پر اقدامات کرنا ہوں گے کہ نکاح اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کردہ ایک

مقدس معاہدہ ہے اور اس کے ذریعے زوجین کے درمیان قائم ہونے والے تعلق کا مقصد خوشی، راحت اور محبت والفت کا حصول ہے۔ اس لیے اس تعلق کو اعتبار اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ ایسے تمام فیصلے جن سے خاندانی زندگی متأثر ہوتی ہو، اس میں نہ صرف زوجین بلکہ والدین اور بزرگوں کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ مختصر یہ کہ دوسری شادی کے فیصلے میں شفافیت اور واضح طور پر حسنِ نیت کا ہونا ضروری ہے۔ قانون میں اس کا جو طریقہ کار پہلے سے موجود ہے، وہ کافی حد تک اس پہلو کا خیال رکھتا ہے۔

اس سب کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاست کو ان خواتین کے ساتھ منصفانہ اور برابری کے سلوک کو یقینی بنانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کرنے چاہییں جو ایک شخص کے نکاح میں ہیں۔ ریاست کو ان تمام صورتوں میں دخل اندازی کا حق حاصل ہے، جہاں رعایا میں سے کسی کے بھی حقوق پر سمجھوتہ کیا جا رہا ہو۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، لیکن ان کے درمیان مساوی سلوک کی قرآنی شرط کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو یقینی طور پر اس کے طرزِ عمل پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی بیویوں کے درمیان مبنی بر عدل سلوک میں ناکام ہوتا ہے تو متأثرہ بیوی کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ وہ یونین کونسل کے سربراہ کو اس معاملے کو طے کرنے کے لیے مصالحتی کونسل کی تشکیل کی درخواست دے۔[11] تاہم ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے جن میں قانون میں موجود یہ شق خواتین اور خاندان کے مفاد میں حقیقی اور مؤثر طور پر کارآمد بھی ہو سکے۔

زیرِ مطالعہ مسودۂ قانون میں یہ تجویز بھی موجود ہے کہ اگر ایک شخص اس متعین طریقہ کار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسری شادی کر لے تو پہلی بیوی خاوند کی جائیداد میں وراثت کی حق دار ہو جائے گی۔ اس تجویز کی کوئی عملی اہمیت نہیں، اور اس کے پیچھے کم علمی یا کم از کم سنجیدہ سوچ کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص کی موت کے موقع پر وراثت میں حق قریبی عزیزوں کے لیے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک عورت بیوہ ہے تو اس کا اس کے مرحوم خاوند کی جائیداد میں سے یقیناً حصہ ہوگا۔ تاہم اگر شادی کا معاہدہ طلاق، خلع یا عدالتی فیصلے کے نتیجے میں ختم ہو جاتا ہے تو اس شخص کی وراثت میں سابقہ بیوی کی شراکت کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

بل میں دفعہ 6 کے تحت سزا کی صورت میں زیادہ سے زیادہ جرمانے کی رقم میں پانچ ہزار روپے سے ایک لاکھ روپے تک اضافے کی تجویز دی گئی ہے۔ مختلف قوانین میں جہاں جرمانے کی خاص رقم متعین کی گئی ہے، ان میں وقتاً فوقتاً ترمیم ضروری ہوجاتی ہے اور یہی معاملہ زیر بحث قانون کے ساتھ بھی ہے۔

دفعہ 7 میں ترمیم کی تجویز

آگے بڑھتے ہوئے مسوّدۂ قانون ایک اور منظرنامہ تصوّر کرتا ہے کہ آدمی موجودہ بیوی سے ظالمانہ طریقہ سے، اسے ذہنی اذیت اور تشدّد کا نشانہ بنا کر دوسری شادی کی اجازت حاصل کرتا ہے، اور دوسری شادی کے بعد اسے طلاق دے دیتا ہے۔ اس مفروضہ صورتِ حال کی بنیاد پر مسوّدۂ قانون متعدد اقدامات تجویز کرتا ہے۔

یہ تجویز یا تو کسی غلطی کا نتیجہ تھی یا قانونی و معاشرتی حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسے مسودے کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ کوئی بھی شخص دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ذہنی و جسمانی تشدد اس صورت میں کرسکتا ہے جب مصالحتی کونسل سے اجازت کے لیے یہ پیشگی شرط ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسری شادی کی اجازت کے لیے درخواست دیتا ہے تو یونین کونسل (یا چیئرمین مصالحتی کونسل کی حیثیت سے کام کرنے کا مجاز فرد) میاں بیوی یا بیویوں کو نوٹس جاری کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک سے ایک نمائندہ نامزد کرنے کو کہتا ہے۔ مصالحتی کونسل چیئرمین اور ان نامزد کردہ نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو مناسب اور منصفانہ موقع ملتا ہے کہ اُسے سنا جائے۔ اگر چیئرمین کو درخواست دینے سے قبل اس سے جبری رضامندی لی گئی ہو تو وہ برقرار نہیں رہے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مصالحتی کونسل کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرتا ہے تو اس کو اجازت لینے کے لیے بیوی کو اذیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گویا اس تجویز کی بنیاد ہی غلط مفروضے پر قائم ہے۔

زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مسودہ قانون میں فرض کرلیا گیا تھا کہ شوہر پہلی بیوی سے زبردستی رضامندی حاصل کرے گا اور دوسری عورت سے شادی کرنے کے بعد آخرکار پہلی بیوی کو طلاق دے دے

گا۔[12] ایسا کرنا یقیناً بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اگر اسے پہلی بیوی کو طلاق ہی دینا ہوتی تو وہ اس سے اجازت لینے کی تکلیف ہی کیوں کرتا، اور وہ بھی زبردستی۔ المیہ تو یہ ہے کہ مسوّدہ قانون نے اس مفروضے کو ہی عمومی کیفیت گردانتے ہوئے قانون میں ترمیم تجویز کردی ہے جیسے عملی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ چونکہ تمام مفروضہ ہی ناقص معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسی بنیاد پر اوپر بیان کیے گئے مجوزہ اقدامات پر تبصرہ مختصراً ہی کیا گیا ہے۔

سابقہ شوہر سے اس کی مطلقہ بیوی کے لیے گزارے کے اخراجات کی فراہمی کا مطالبہ غیر منصفانہ اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ طلاق اور عدّت کے بعد مرد اور عورت باہم عائد فرائض اور ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ مرد کی طرح خاتون کو بھی یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر کے نئی زندگی کا آغاز کرے۔[13] دوسری جانب یہ بات اس کے سابقہ شوہر کی موجودہ بیوی کے لیے بھی نقصان دہ ہوگی، کیونکہ وہ وسائل جن پر اس کا حق ہے وہ سابقہ بیوی کے لیے استعمال ہو رہے ہوں گے۔

دوسرا مجوزہ اقدام مہر کی پوری رقم کی ادائیگی کا تھا۔ یہ تجویز بھی بلاضرورت تھی۔ مہر یا تو معجّل ہوگا یا غیر معجّل (مؤجّل)۔ مہر معجّل شادی کے موقع پر فوراً یا مطالبے پر ادا کردیا جاتا ہے، جبکہ مہرِ غیر معجّل شادی ختم ہونے پر قابلِ ادائیگی ہوتا ہے۔ اس لیے طلاق کی مفروضہ صورت میں مہر، اگرچہ وہ غیر معجّل ہی ہو، پہلے ہی قابلِ ادائیگی ہو چکا ہوگا۔

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سابقہ شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو کم سن بچوں کی حوالگی سے محروم نہیں کرے گا۔ کم سن بچوں سے متعلق معاملات پاکستان میں سرپرستوں اور زیرِ حفاظت کے قانون مجریہ 1890ء (Guardians and Wards Act, 1890) کے تحت طے کیے جاتے ہیں، جس کی رُو سے ''بچے کی فلاح'' وہ رہنما اصول ہے جس کی بنیاد پر عدالت بچے کی حوالگی (Custody) کا فیصلہ کرتی ہے،[14] ایسے میں عدالت بچے کی مالی، نفسیاتی اور اخلاقی بہبود کو مدّنظر رکھتی ہے۔ اس لیے بچوں کی حضانت کے حوالے سے موجودہ قانون مبنی بر حکمت اور منصفانہ ہے، اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

اس بِل میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ سابقہ شوہر مطلقہ بیوی کے بچوں کو گزارے کے لیے

اخراجات (نفقہ) بھی دے گا۔ اگرچہ بیوی اور اولاد کے نفقہ کے حوالے سے کچھ رہنمائی مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 488 میں مذکور ہے، لیکن عدالتیں بچوں کے نفقہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ اسلام کے احکام کی بنیاد پر کرتی رہی ہیں اور اب یہ طے شدہ قانون بن چکا ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کے اخراجات ان کے بالغ ہونے اور اپنی بیٹیوں کے اخراجات ان کی شادیاں ہونے تک برداشت کرنے کا ذمہ دار ہے۔[15]

یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ اگر بیوی طلاق دینے والے شوہر سے پیدا شدہ بچے کو عدّت کے بعد بھی دودھ پلا رہی ہو تو وہ اسے دو سال کے لیے نفقہ دے گا۔ یہ تجویز اس بل کو پیش کرنے والی رکن پارلیمنٹ کی طرف سے مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2009ء کے نام سے ایک علیحدہ مسوّدہ قانون میں بھی پیش کی گئی۔ اس وقت اتنا کہنا کافی ہے کہ سابقہ شوہر اپنے بچے کی دیکھ بھال کا نہ صرف اس کی کم سنی میں بلکہ اس کے بعد بھی ذمہ دار ہے، اور دودھ پلانے والی ماں کو بھی نان نفقہ اور لباس اچھے انداز میں فراہم کرنے کا پابند ہے۔

طلاق یافتہ عورت جس گھر میں رہائش پذیر تھی اسے وہاں رہنے کی اجازت دینے کی تجویز سفارش کے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ مسوّدہ قانون کی زبان اسے لازمی قرار دیتے ہوئے عورت کا حق قرار نہیں دیتی۔ اگر معاشرے میں مطلقہ بیویوں کے ساتھ منصفانہ اور موافقانہ سلوک کے طرزِ عمل کو فروغ حاصل ہوتا ہے تو یہ بڑی صحت مندانہ پیش رفت ہوگی۔ قرآن مجید (البقرۃ 231 اور الاحزاب 49) میں مردوں سے کہا گیا ہے کہ وہ طلاق دیتے ہوئے عورت سے حسنِ سلوک کریں۔ تاہم سماجی رویوں میں ایسی تبدیلیوں کو قانون سازی سے نہیں بلکہ مثبت ترغیبات اور تحریکات کے ذریعہ ہی پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔

بل کی تجاویز کے ساتھ اغراض و مقاصد اور وجوہات کا بیان بھی مختصر تبصرے کا تقاضہ کرتا ہے، کیونکہ اغراض و مقاصد کا بیان واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ بل کی تیاری میں کتنی توجہ اور احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مجوزہ قانون میں جس طرح مسائل کو مصنوعی طور پر فرض کیا گیا ہے، اور بل کو بے احتیاطی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، اسی طرح اغراض و مقاصد کا بیان بھی کمزور زبان، نامکمل اور انتہائی عمومی جملوں کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بل کی بنیاد پر قانون سازی کی جاتی تو عام لوگوں کی مشکلات میں یقیناً اضافہ ہی ہوتا اور قانون سازی

میں سنجیدگی کے فقدان کی وجہ سے ان کی زندگیاں لازماً متاثر ہوتیں۔ یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ محرکہ جواعلیٰ عدلیہ کی سابق رکن بھی ہیں، ایسی واضح خامیوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ خدشہ ضرور ذہن میں آتا ہے کہ خواتین کے مقاصد کے لیے جدوجہد میں نام لکھوانے کی جلدی نے بعض قانون سازوں کو نمایاں غلطیوں پر توجہ دینے کی فرصت بھی نہیں دی۔

حاصلِ کلام

یہ مسوّدۂ قانون ایک ایسی مثال ہے جس میں قانون سازی کے لیے تجاویز قانونی اور معاشرتی ڈھانچے کو سمجھے بغیر پیش کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بل کا مقصد عورتوں کے حقوق کے نام پر ایک علامتی کوشش کرنا تھا، نہ کہ عورتوں کو درپیش حقیقی مشکلات کو سنجیدگی سے حل کرنا۔ مسائل کے غلط ادراک کی وجہ سے دی گئی تجاویز بھی ناقص ہیں۔ یہ کہنا پڑے گا کہ قانون سازی کی اس طرح کی تجاویز اور رویے سے عورتوں کو سہولت ملنے اور خاندان کے ادارے یا خاندان میں بہتری آنے کا کوئی امکان نہیں۔ مؤثر قانون سازی صورتِ حال کو سوچ سمجھ کر تجزیہ کرنے اور معاشرتی حرکیات، مذہبی اور ثقافتی طور طریقوں کی واضح سمجھ اور مجوزہ تجاویز کے ممکنہ اثرات کے جائزے کے بعد کی جاسکتی ہے۔

جبری شادیوں کی ممانعت

فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء

عنوان: فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2011ء
پیش کار: چوہدری پرویز الٰہی و دیگر سات اراکین، پاکستان مسلم لیگ (ق)
پیش کردہ بتاریخ: 10 جون 2008ء
نافذ العمل بتاریخ: 26 دسمبر 2011ء

تیرہویں قومی اسمبلی میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی لیڈر چودھری پرویز الٰہی اور ان کی جماعت کے سات دیگر اراکین قومی اسمبلی 16 نے اس بل کو خواتین مخالف کارروائیوں کی روک تھام کا (فوجداری قانون ترمیمی)

بل 2008ء کے عنوان سے قومی اسمبلی میں پیش کیا تھا۔[17] یہ بل منظوری کے بعد اوپر ذکر کیے گئے عنوان کے ساتھ 2011ء کے چھبیسویں قانون کی حیثیت سے نافذ العمل ہوا۔ اس قانون کے ذریعے مجموعہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء میں ایک نئے باب 20۔الف کا اضافہ کیا گیا ہے جو خاص طور پر خواتین کے خلاف جرائم سے متعلق ہے۔ ان جرائم میں تنازعات اور لین دین کے معاملات طے کرنے کے لیے عورتوں کا استعمال، وراثت میں خواتین کو حق سے محروم کرنا اور قرآن سے شادی کرنے کے افعال شامل کیے گئے ہیں۔ عورتوں کے حقِ وراثت کے حوالے سے قانون میں کی گئی ترمیم کو وراثت سے متعلق دیگر قانونی تجاویز کے ساتھ آئندہ صفحات میں ذکر کیا جائے گا تاہم ذیل میں جبری شادیوں پر پابندی اور قرآن کے ساتھ شادی پر بحث پیش کی جارہی ہے۔

اس ایکٹ کے ذریعہ مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں شامل کی گئی دفعہ '498-ب' جبری شادیوں کی ممانعت کرتی ہے۔ اس دفعہ کے متن کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

"498-ب: جبری شادیوں کی ممانعت: جو کوئی زبردستی یا کسی بھی طریقے سے کسی خاتون کو شادی پر مجبور کرے گا، اسے کسی بھی نوعیت کی قید کی سزا دی جائے گی جو سات سال یا ایسی مدت تک ہوسکتی ہے جو تین سال سے کم نہیں ہوگی، اور وہ پانچ لاکھ روپے جرمانے کا مستوجب بھی ہوگا۔"

محرکین نے اس بل کو پیش کرتے ہوئے اس کے اغراض ومقاصد کے بیان میں کہا تھا کہ:

"ملک میں ایسے کئی رسوم ورواج ہیں، جو نہ صرف انسانی وقار کے خلاف ہیں بلکہ انسانی حقوق کے بھی منافی ہیں۔ اسی طرح یہ اسالیب اسلامی احکامات کے بھی خلاف ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان سنگ دلانہ معمولات اور رسوم ورواج کو فوری طور پر ختم کیا جائے، اور جو افراد ان کو جاری رکھیں ان کے ساتھ تعزیراتی اور مالیاتی سزائیں دے کر نمٹا جائے۔ موجودہ بل کا ہدف انہی مقاصد کا حصول ہے۔"

اس ایکٹ سے پہلے قانون اور جاری عمل

اس ایکٹ سے پہلے زبردستی کی شادیوں کی حیثیت کے بارے میں کوئی خاص قانونی دفعہ موجود نہیں تھی۔ تاہم رواجی شخصی قانون (Customary Personal Law) کے حصے کے طور پر جبری

شادیوں کو ہمیشہ غلط اور ساقط قرار دیا جاتا رہا ہے۔ عدالتیں یہ تسلیم کرتی رہی ہیں کہ کسی بھی فرد کو زوجیت کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے مقدمہ دائر کرنے کا حق حاصل ہے، جس کے ذریعے عدالت سے یہ قرار دلوانا مقصود ہو کہ دعویٰ کے فریقین کے درمیان شادی کا کوئی قابلِ اعتبار معاہدہ موجود نہیں ہے۔ عام طور پر اس نوعیت کا دعویٰ دائر کرنے کا مقصد شادی کے جھوٹے الزام یا دعویٰ[18] کو مستقل طور پر خاموش کرانا ہوتا ہے کیونکہ ایسی شادی مدّعی کی آزاد مرضی کے بغیر ہوئی ہوتی ہے۔[19]

اس سلسلے میں عدالت کا طرزِ عمل ایک حد تک متعیّن ہو چکا ہے کہ قانون میں کوئی دفعہ کسی شخص کو زوجیت کا جھوٹا دعویٰ دائر کرنے کا حق نہیں دیتی۔ زوجیت کے جھوٹے دعووں کی سماعت کرنے کا اختیار عائلی عدالتوں کے (ترمیمی) ایکٹ مجریہ 1971ء (1971ء کے چوبیسویں ایکٹ) کے ذریعہ عائلی عدالتوں کو تفویض کیا گیا ہے۔ کوئی خاتون دباؤ کے تحت کی گئی شادی کی تنسیخ کے لیے مسلم شادیوں کی تنسیخ کے ایکٹ مجریہ 1939ء کے تحت بھی دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔

زبردستی شادی کی وجوہات میں سے ایک تنازعات کو طے کرنے کے لیے عورتوں کا استعمال ہے۔ تعزیراتِ پاکستان میں فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2004ء (سال 2005ء کا پہلا ایکٹ) کے ذریعہ شامل کی گئی دفعہ 310-الف کسی عورت کو بدلِ صلح[20] میں کسی کی زوجیت میں دینے یا علاوہ ازیں استعمال کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ اس دفعہ کی خلاف ورزی کرنے والا قیدِ سخت کا مستحق ہوگا، جو زیادہ سے زیادہ 10 سال اور کم از کم 3 سال ہوگی۔

مشاہدات

کسی فرد کو کسی فعل کے ارتکاب یا اس سے اجتناب پر مجبور کرنا یا تو اکراہِ تام ہو سکتا ہے یا اکراہِ ناقص۔ اکراہِ تام کی تعریف ضابطہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء کی دفعہ 299 میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''اکراہِ تام کے معنی کسی فرد، اس کے زوج یا اس کے کسی محرم خونی رشتہ دار کو موت یا جسم کے کسی عضو کو مستقل طور پر خراب کرنے یا بگاڑنے کے خوف یا غیر فطری فعل یا زنا بالجبر کے فوری خوف میں مبتلا کرنا

ہے''۔21

اسی دفعہ میں اکراہِ ناقص کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''اکراہِ ناقص جبر کی کوئی بھی شکل ہے جو اکراہِ تام سے کم تر ہو۔''

ایسی مثالیں بھی ہوسکتی ہیں جب کسی فرد کو اکراہِ تام کے تحت شادی پر مجبور کیا گیا ہو، لیکن زیادہ تر واقعات میں زبردستی کی شادیاں، معاشرتی، مالی یا نفسیاتی خدشات یا دباؤ کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔ ایسے خدشات اور دباؤ ہر قسم کی انسانی سرگرمی میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اکراہِ تام کے ذیل میں نہیں آتے اگرچہ بعض اوقات انہیں اکراہِ ناقص قرار دیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ اگرچہ مجبور کیا گیا فرد مرد بھی ہوسکتا ہے لیکن عورتوں کا ایسی صورتِ حال کا شکار ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

مجموعہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء (Pakistan Penal Code, 1860) کی دفعہ 310 کے مطابق عورت کو بدلِ صلح، یعنی ایک تنازعہ طے کرنے کے لیے بدلے میں، فریقِ مخالف میں سے کسی کی زوجیت میں یا کسی اور حیثیت سے نہیں دیا جاسکتا۔ اس دفعہ کی مزید وضاحت فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2004ء (2005ء کا پہلا ایکٹ) کے ذریعے دفعہ 310-الف کے اضافے سے کی گئی تھی، جسے اس ایکٹ (2011ء کا چھبیسواں ایکٹ) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس دفعہ میں عورت کو بدلِ صلح کے طور پر استعمال کرنے کی سزا کا بیان ہے۔ قبل ازیں دفعہ 310-الف کا دائرۂ کار محدود تھا اور اس کے پیشِ نظر صرف وہ واقعات تھے جن میں عورتوں کو بدلِ صلح کے لیے شادی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ چونکہ دفعہ 310 قتلِ عمد[22] کی صورت میں قصاص[23] کو بذریعہ مصالحت طے کرنے کے بارے میں ہے، اس لیے دفعہ 310-الف کی تشریح بھی اسی تناظر محدود انداز میں کی جانے لگی۔ بدلِ صلح کی واضح تعریف کی عدم موجودگی میں لاہور ہائی کورٹ نے 2007ء کے ایک فیصلے میں یہی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے طے کیا کہ دفعہ 310-الف کے حوالے سے اس اصطلاح کو صرف معاوضے میں دینے یا قبول کرنے کے طور پر سمجھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دفعہ 310-الف قتل سے پیدا ہونے والے ایک تنازعہ کو طے کرنے کے لیے کسی عورت کی حوالگی کی ممانعت کرتی تھی اور دیگر صورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

اس ایکٹ کے ذریعہ شامل کی گئی دفعہ 310-الف نے اس ممانعت کا دائرہ کار وسیع کر دیا ہے اور اب یہ قانون قصاص کی صورت میں بدلِ صلح تک محدود نہیں ہے۔ یہ عورت کی زبردستی شادی کو بھی خواتین کی عزت و وقار کے منافی اور اس کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی تصور کرتا ہے۔

تبصرہ

عقدِ زوجیت کی ایک پیشگی شرط شادی کرنے والے افراد کی رضامندی ہے۔ اس رضامندی کے صراحتاً یا کم از کم ضمناً اظہار کے بغیر شادی معتبر نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ عورت (کنواری یا زوجیت کا تجربہ رکھنے والی) کا ولی (سرپرست) بھی اُسے شادی پر مجبور نہیں کر سکتا۔[24] اس لیے حنفیوں کے نزدیک بالغ عورت (خواہ کنواری ہو، طلاق یافتہ یا بیوہ) کی شادی کا معاہدہ اس کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا، چاہے یہ معاہدہ اس کے والد یا دادا نے کیا ہو۔[25]

تاہم یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ معاشرے میں بعض اوقات افراد کے شادی کے سلسلے میں اس ہم انسانی حق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک نوعیت تو یہ ہے کہ کچھ علاقوں میں 'وَنی' اور 'سوارہ' جیسی رسوم کے ذریعے خاندانوں اور قبیلوں کے درمیان تنازعات کو طے کرنے کے لیے عورتوں کو تجارتی مال و اسباب کی طرح استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ گھرانوں میں بچوں خصوصاً لڑکیوں کی مرضی جاننے کا رجحان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں یا انہیں ایک خاص انتخاب کی توثیق کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

خواتین کو فوجداری یا مالیاتی معاملات میں بطور معاوضہ استعمال کرنا ایک قبیح جرم ہے، جس میں عورت کو مالِ تجارت کی طرح سمجھا اور دوسرے کی کھال بچانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ بیشتر صورتوں میں اس طرح کی شادی کے نتیجے میں عورت پوری زندگی تکلیف میں گزارتی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کے جرم کے انتقام کے لیے اُسے زندگی بھر ذہنی اور جسمانی تشدّد سہنا پڑتا ہے۔ ایسے رسوم و رواج اس لائق ہیں کہ انہیں پوری قوت سے روکا جائے اور اس نوعیت کی 'سودے بازی' میں ملوّث تمام افراد کو سزا دی جائے۔

جہاں تک ان شادیوں کا تعلق ہے جن کا تعلق بدلِ صلح وغیرہ سے نہیں ہے، ان کے بارے میں زیادہ محتاط سوچ اور دور اندیشی کی ضرورت ہے۔ معاشرے کے سماجی ڈھانچے میں والدین اور سرپرستوں کا اپنے بچوں کی زندگیوں میں ایک اہم کردار ہوتا ہے، اور وہ ان کو وہ کچھ دینا چاہتے ہیں جو وہ ان کے لیے بہترین سمجھتے ہیں۔ اپنی بے پناہ محبت اور پیار کی وجہ سے اپنے اقدامات میں وہ خود کو درست سمجھتے ہیں، نیز انہیں یہ اعتماد بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر کے تجربات اور سوچ کی پختگی کی بنا پر اپنے بچوں کے لیے صحیح انتخاب کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کے بچوں کی سوچ ابھی ناپختہ ہے اور وہ اپنی نوعمری کی خواہشات سے پیچھا چھڑانے اور کسی پیچیدہ معاملے کی تہہ تک دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ میں بیشتر شادیاں خاندان کے بڑے ہی طے کرتے ہیں جو آخر تک ٹھیک چلتی ہیں۔

تاہم بعض بزرگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی زندگیوں کے اہم ترین فیصلے میں ان کے ساتھ مشورے کے حق سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی جانب سے بار بار کی ترغیب یا جذباتی بلیک میل کے ذریعہ شادی ہو ہی جاتی ہے، لیکن یہ خدشہ بہر حال رہتا ہے کہ شادی کرنے والے ساتھی اپنی خواہشات پر سمجھوتہ کے لیے تیار نہ ہوں۔ اس صورت میں خاندان اور معاشرے کے لیے متعدد مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں طرح کے رجحانات کی موجودگی میں دفعہ 498۔ب کے ذریعے زبردستی شادی کے غیر محدود مفہوم کے ساتھ اس انداز میں سزا کا تعین مزید پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ جملہ کہ ''جو کوئی زبردستی یا کسی بھی طریقے سے کسی خاتون کو شادی پر مجبور کرے گا'' بہت عمومی نوعیت کا ہے جسے مشروط کرنے کی ضرورت ہے۔ اکراہِ تام کے تحت بیاہنے اور بدلِ صلح میں عورت کو دینے پر پابندی لگانا اور اسے غیر قانونی قرار دینا یقیناً ضروری ہے (جیسا کہ دفعہ 310-الف کو شامل کرنے کے ذریعہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے)، لیکن اس کے دیگر مفاہیم پر دوبارہ غور کرنا ہوگا۔ بے شمار واقعات کو اکراہِ ناقص قرار دیا جا سکتا ہے، اور تمام کو سزا کے ذیل میں نہیں لانا چاہیے۔ کسی رشتہ کو قبول کرنے کی ترغیب کو جہاں کچھ لوگ والدین کا حق قرار دے سکتے ہیں وہاں اسی عمل کو کچھ دوسرے لوگ جبر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر قانون کی لفظی تعبیر کی جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ کوئی ناسمجھ اولاد اپنے والدین کے خلاف ہی یہ فوجداری مقدمہ دائر کر دیں کہ

اُنہوں نے اِن کی مرضی کے بغیر اِن کی شادی کا اہتمام کر دیا۔ پاکستانی معاشرے میں شاید کچھ لوگوں کو یہ بات بعید از قیاس محسوس ہو لیکن اسے نظر انداز تو بہر حال نہیں کیا جا سکتا جب کہ قانوناً اس کا امکان موجود ہے۔

معاشرت سے متعلق امور کو سماجی رویوں میں سدھار کے ذریعے بہتر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے نہ کہ قانونی پابندیوں کے ذریعے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ تعلیمی ادارے، مذہبی رہنما، سماجی کارکن اور ذرائع ابلاغ ایسا ماحول پیدا کریں جہاں والدین اور اولاد کا باہم تعلق اس نہج پر استوار ہو کہ گھرانے کے تمام اہم فیصلے باہم اعتماد اور یقین کے ساتھ مل جُل کر طے پائیں۔ اگرچہ شادی ہو جانے کے بعد طلاق، تنسیخِ نکاح، یا خلع 26 جیسے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک خطرناک حد تک تکلیف دہ ہے۔

زیرِ نظر دفعہ کا ایک اور واضح نقص یہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر صرف خواتین کے حق کا تحفظ ہے جب کہ مذکورہ صورتحال مرد و زن میں سے کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے، اگرچہ یہ درست ہے کہ زیادہ تر واقعات میں عورتیں ہی سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، لیکن مرد بھی کئی مرتبہ ایسے حالات کا شکار ہوتے ہیں جہاں ان کو ان کی مرضی اور رضامندی کے بغیر شادی کرنا پڑ سکتی ہے۔

قانون اس شخص کو شریکِ جرم قرار نہیں دیتی جو یہ جانتے ہوئے کسی سے شادی کرتا ہے کہ اس شادی کے لیے فریقِ ثانی کی رضامندی جبر اور مجبوری کے تحت حاصل کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر وَنی اور سوارا کی صورت میں کسی گھرانے کا وہ سرپرست جو برادری کے دباؤ پر یا نام نہاد رسوم و رواج کے تحت اپنی زیرِ پرستی کسی خاتون کو زبردستی شادی پر مجبور کرے، اُسے بھی جرم کا مرتکب قرار دینا ہی چاہیے، لیکن اس پورے تناظر میں زیادہ ذمہ دار شخص وہ ہے جو اس خاتون سے شادی کرتا ہے، نیز برادری کے وہ بااثر افراد ہیں جن کے کہنے پر اس شادی کا اہتمام کیا گیا ہے اور وہ افراد جو نکاح کیے عمل میں شریک رہے ہیں۔ قانون کو جبری شادی میں ملوّث ایسے تمام افراد کو سزا دینی چاہیے۔

سفارشات

● سال 2011ء کے چھبیسویں ایکٹ کے ذریعہ وضع کردہ دفعہ 498-ب کو دفعہ 310-الف کے ساتھ ملا کر پڑھا جانا چاہیے۔ اصل میں تو دفعہ 310-الف کے موجودہ متن پر مشتمل دفعہ کو تعزیراتِ پاکستان کے بیسویں باب میں ہونا چاہیے، جو شادی سے متعلق جرائم کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں اس دفعہ کی شمولیت سے اس کے دائرۂ عمل میں وسعت آئے گی۔

● اکراہِ تام کے تحت، تنازعات کو طے کرنے کے لیے یا مالیاتی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے عورتوں کے استعمال پر پابندی ضروری ہے اور اس نوعیت کے خلافِ انسانیت فعل کے ارتکاب پر سخت سزا دی جانی چاہیے۔ اس نوعیت کی شادی کے لیے نہ صرف خاتون کو نکاح میں دینے والے بلکہ اس سے نکاح کرنے والوں پر بھی گرفت لازم ہے۔ نیز زبردستی کی شادی کے گواہان، نکاح خواں اور شادی طے کرنے والوں کو بھی مجرم تصور کیا جانا چاہیے۔

● ایسی شادیاں جو ڈرا دھمکا کر یا بزورِ قوت کروائی گئی ہوں، ان کے لیے سخت تر سزائیں تو یقیناً درکار ہیں لیکن قانون کی ممکنہ غلط تشریح سے بچنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اس بات کی وضاحت خود قانون کا حصہ بنا دی جائے کہ والدین کی ترغیب کے تحت ہونے والی شادی بجائے خود اس ذیل میں نہیں آئے گی۔

● زبردستی شادیوں کے حوالے سے قانون عورتوں کے لیے مخصوص نہیں ہونا چاہیے، لیکن چونکہ عورتیں مردوں کی نسبت بُری رسوم و روایات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، اس لیے عورتوں کے معاملے میں سزائیں سخت تر ہو سکتی ہیں۔

● معاشرے میں حقیقی اور دیرپا تبدیلی کے لیے رویّوں اور طرزِ فکر میں تبدیلی لانا ہوگی جو سماجی بیداری اور تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ والدین کو احساس دلایا جانا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو فیصلے کرنے کے عمل میں شریک کر کے اور ان کے مطالبات، جذبات اور خواہشات کا خیال کر کے ان کی زندگیوں میں امن اور اطمینان کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کو بھی یہ بتانا اہم ہے کہ بزرگوں کی زندگی بھر کے تجربات اور بے لوث محبت پر مبنی تجاویز اور مشوروں کا احترام انہیں کئی مشکلات سے بچا سکتا ہے۔

قرآن پاک کے ساتھ شادی پر پابندی

اسی ایکٹ (2011ء کے چھبیسویں ایکٹ) نے تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے میں قرآن پاک کے ساتھ شادی کی ممانعت کے لیے بھی ایک دفعہ کا اضافہ کیا ہے۔ دفعہ '498-ج' کا متن یہ ہے۔

''498-ج: قرآن پاک کے ساتھ شادی پر پابندی۔ (ا) جو کوئی بھی کسی عورت کو قرآن پاک کے ساتھ شادی کے لیے مجبور کرتا یا انتظام کرتا یا سہولت فراہم کرتا ہو، اس کو قید کی سزا دی جائے گی، جو زیادہ سے زیادہ سات سال اور کم سے کم تین سال ہوگی اور وہ پانچ لاکھ روپے جرمانہ کا بھی سزاوار ہوگا۔

تشریح: قرآن پاک سے شادی سے مراد کسی خاتون کا قرآن پر یہ حلف ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی میں غیر شادی شدہ رہے گی یا وراثت میں حصے کا دعویٰ نہیں کرے گی''۔

بل کے محرّکین نے اغراض و مقاصد اور وجوہات کے بیان میں اس امر پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ معاشرے میں موجود بعض برادریوں اور علاقوں میں ایسے رسوم و رواج موجود ہیں جن کا مقصد عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہے۔ ایسے رسوم اور روایات انسانی وقار کے خلاف اور قرآنی احکامات کے منافی ہیں۔

موجودہ قانون اور عمل: اس دفعہ کی تعزیراتِ پاکستان میں شمولیت سے قبل قرآن پاک کے ساتھ شادی پر پابندی کا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قانون کی کسی کتاب میں خود 'شادی' کی کوئی تعریف ہی موجود نہیں ہے، لیکن یہ تصور اس قدر عام اور غیر مبہم ہے کہ شادی کی کسی مخصوص تعریف کی عدم موجودگی بالعموم قانون میں کسی خلا کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

مسلم پرسنل لاء (شریعت) اطلاقی ایکٹ 1948ء (1948 کا نواں ایکٹ) کی دفعہ 2 اور مسلم پرسنل لاء (شریعت) اطلاقی ایکٹ 1962ء (1962ء کا پانچواں ایکٹ) کی بنیاد پر مسلمانوں کی شادی سے متعلق تمام معاملات کا فیصلہ مسلم پرسنل لاء (شریعت) کے مطابق ہوتا ہے، اور یہ بات بڑی واضح ہے

کہ اسلامی شریعت میں شادی (نکاح) کا تصور مرد اور عورت کے درمیان معاہدے (نکاح) کا ہے، نہ کہ عورت اور ایک چیز کے درمیان۔ ڈی۔ ایف ملاّ نے پرنسپلز آف محمڈن لاز میں شادی کی اس طرح تعریف کی ہے: ''شادی (نکاح) کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ وہ معاہدہ ہے جس کا مقصد افزائشِ نسل اور بچوں کی پیدائش کو قانونی بنانا ہے۔''[27] ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے نکاح کی تعریف یہ کی ہے: ''ایک مذہبی قانونی معاہدہ جو عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کو باقاعدہ بناتا، ان کی نسل کا تسلسل قائم کرتا اور ان کے درمیان شہری حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے''۔[28]

ایک مسلمان معاشرے میں کسی فرد کا شادی کرنا اس کے بنیادی حقوق اور فرائض میں سے ایک اور اس کا براہِ راست تعلق شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یعنی حفظ النسل سے ہے۔

تبصرہ

قرآن پاک کے ساتھ شادی ایک بری رسم ہے، جو سندھ اور جنوبی پنجاب کے چند علاقوں اور برادریوں میں رائج ہے۔ مختلف علاقوں اور برادریوں میں رسم و رواج اور عمل کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن عام طور پر قرآن پاک کے ساتھ شادی کا مطلب ایک عورت کو پوری زندگی کے لیے قرآن کے ساتھ وابستہ کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے اپنی بقیہ زندگی میں 'دنیاوی' امور سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اور وہ قرآن کے ساتھ وقف رہے گی، خاص کردہ جگہ تک محدود رہے گی اور اس کو کسی شخص کے ساتھ شادی کرنے کا حق نہیں ہوگا، نیز اسے وراثت سمیت مالی حقوق سے محروم رکھا جائے گا۔

اس رسم کا زیادہ تر چلن جاگیردار گھرانوں میں ہے، جہاں بہنوں اور بیٹیوں کو پوری زندگی غیر شادی شدہ رکھا جاتا ہے اور ان کی قرآن پاک کے ساتھ شادی کر کے ان کے ساتھ تقدس اور پاکدامن ہونے کا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے، اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ زندگی بھر قرآن کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی جنسی خواہشات اور مالیاتی حقوق سے دستبردار رہیں گی۔ اسی بناء پر بعض علاقوں میں یہ رسم و رواج حق بخشوائی[29] کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس رواج کا ایک تعلق ذات پات کے نظام سے بھی ہے۔ بعض خاندان جو خود کو اعلیٰ تر سمجھتے ہیں، وہ اپنی بیٹیوں کی شادی دوسری ذات برادری میں نہیں کرتے۔ ایسے میں اپنی بیٹیوں

اور بہنوں کے لیے مناسب رشتے تلاش کرنے میں ناکامی کی صورت میں وہ اپنی نام نہاد اعلیٰ نصبی کے تحفظ کے لیے ان کی قرآن کے ساتھ شادی کر دیتے ہیں۔

قرآن کے ساتھ شادی کے ذریعے حاصل ہونے والا ''تقدس'' دراصل جاگیرداری کا ایک انتہائی خراب اور برا ہتھیار رہے۔ جاگیردار اپنی جائیداد کو اپنے پاس رکھنے کی ہوس کی وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنے محلات میں موجود اس خاموش مخلوق کو اس میں حصہ دار بنائیں جنہیں خواتین کہا جاتا ہے۔ ان خواتین سے ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے جیسے ان کی کوئی عزت اور وقار نہیں ہے۔ اگر ان میں سے کسی کی شادی کی جاتی ہے تو حسبِ رواج اسے جہیز کی صورت میں خاندانی مال اسباب میں سے کچھ دینا ہوگا اور اگر اس کی شادی نہ کی جائے تو بھی اسلامی قانون کے مطابق کسی قریبی رشتہ دار کی وفات پر وہ وراثت میں حقدار ہو گی۔ اس لیے اسے ہر صورت محروم رکھنے کے لیے اپنے حقوق سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے، اور اسے مطمئن کیا جاتا ہے کہ اس کو ایک بلند تر مقام کے لیے منتخب کیا گیا ہے، جہاں وہ ایک مادّی اور عام انسانوں کی طرح حرص و ہوس کی زندگی کے بجائے ایک روحانی زندگی گزارے گی۔ اس طرح قرآن کے ساتھ شادی قانون، شریعت اور اخلاق کی متعدد خلاف ورزیوں کا مرکب بن جاتی ہے، اور قرآن کی بے حرمتی، شادی کے اسلامی ادارہ کی بے توقیری، ایک عورت کو اسلامی احکامات کے مطابق وراثت کے حق سے انکار اور اپنی زندگی کے ساتھی کے انتخاب کے حق سے انکار جیسے جرائم اس کا حصہ بنتے ہیں۔

حالیہ برسوں کے دوران اس رواج کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے قانون سازی کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے متعدد بار اس رواج کو سخت تعزیری قوانین کے ذریعہ ختم کرنے پر زور دیا ہے۔ کونسل نے 30 مئی 2005ء کو منعقدہ اپنے اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس معاملے پر قانون سازی کر کے اس عمل کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔[30] کونسل نے جون 2006ء میں منعقد ہونے والے اپنے 157 ویں اجلاس میں متفقہ طور پر اس رسم کو غیر اسلامی قرار دیا اور اس رواج کے خاتمے کے مقصد کے لیے ایک مسوّدہ قانون کی منظوری بھی دی۔ اس نے حکومت سے یہ سفارش بھی کی کہ اس رواج کو ضابطہ تعزیرات پاکستان مجریہ 1860ء کی دفعہ 295-ب کے تحت قرآن کی بے حرمتی کا فعل سمجھا جائے، جس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے عمر قید کی سزا مقرر کی جائے۔[31]

اس تناظر میں کی گئی قانون سازی یقینی طور پر بہت اچھا قدم ہے، لیکن اس قابلِ نفرت رسم کے خاتمے کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ اس جرم کی سنگینی اور ہولناکی کا تقاضہ ہے کہ زیادہ سنجیدگی سے اسے سمجھ کر سخت تر اقدامات کیے جائیں۔ جو تجویز ضابطہ تعزیرات پاکستان (ترمیمی) بل 2005ء کے ذریعہ پیش کی گئی تھی اور جسے اسلامی نظریاتی کونسل کی منظوری بھی حاصل تھی، مؤثر قانون سازی کے لیے زیادہ مناسب بنیاد کی حامل نظر آتی ہے۔ مذکورہ بل میں تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے کی دفعہ 295-ب کو درج ذیل دفعہ سے تبدیل کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔

''**295-ب**: قرآن کے ساتھ شادی اور قرآن کی بے حرمتی: جو کوئی بھی جان بوجھ کر قرآن پاک کے کسی نسخے یا حصے کے تقدس کو پامال کرے، نقصان پہنچائے یا اس کی بے حرمتی کرے، یا براہِ راست یا بالواسطہ اس بات کی اجازت دے کہ قرآن کو ایک عورت کے ساتھ شادی کے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، یا دھوکہ دہی یا بددیانتی کے ساتھ کسی خاتون کو قرآن پر قسم دے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی سے کبھی شادی نہیں کرے گی، یا اسے کسی بھی طرح توہین آمیز طریقے سے یا کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کرے، وہ عمر قید کی سزا کا مستحق ہوگا''۔[32]

ایک دوسرا پہلو جو موجودہ قانون میں نظر انداز ہو رہا ہے، اس کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس قانون کے نفاذ سے قبل موجود یا اس کے بعد واقع ہونے والی نام نہاد شادیوں کو بھی خلافِ قانون اور غیر مؤثر قرار دیا جانا چاہیے اور اس ذریعہ سے سلب کردہ حقوق اس نقصان کے معاوضے سمیت دلائے جانے چاہییں جو متاثرہ خواتین کو پہنچا ہے۔

معاشرے میں موجود منفی رجحانات اور غیر انسانی رسوم و رواج کے بارے میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ ان کے مکمل خاتمے کے لیے صرف قانون سازی کافی نہیں ہے۔ ریاست کو ایسے تمام برے رسوم و رواج کے خلاف بیداری کی مہم چلانی چاہیے جو انسانی وقار اور اسلامی احکامات کے منافی ہوں۔ آئین کے آرٹیکل 31 کے تحت یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے مطابق گزارنے کے قابل بنانے کے لیے اقدامات عمل میں لائے۔ یہ

بھی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے اخلاقی معیارات کو برقرار رکھے اور ان کو فروغ دے۔

یہ بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ قرآن کے ساتھ شادی، ونی، سوارا[33] اور کاروکاری[34] جیسی رسوم جاگیردارانہ سوچ کی پیداوار ہیں، جس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ جاگیردار دوسروں کی زندگیوں پر حکمرانی کا حق حاصل کر کے ریاست کے اندر اپنی ریاستیں برقرار رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علاقوں کے اندر قانون سازی کرتے، تنازعات کا فیصلہ کرتے اور ان پر عملدرآمد کراتے اور اپنے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو اپنی رعیت تصور کرتے ہیں۔ جب تک قانون سازی اور مؤثر زرعی اصلاحات کے ذریعہ ان کے مکمل اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جائے گا صورت حال کے بہتر ہونے کے امکانات کم ہی ہیں۔

سفارشات

- سخت قانون سازی اور انتظامی اور معاشرتی محاذوں پر مثبت اقدامات کے ذریعہ قرآن پاک کے ساتھ شادی یا حق بخشوائی کی رسم کا مکمل خاتمہ کیا جائے۔

- اس جرم کی سنگینی کے پیش نظر موجودہ قانون ناکافی نظر آتا ہے اور ضرورت ہے کہ اوپر بیان کردہ تجویز کو کسی تاخیر کے بغیر منظور کیا جائے، جس کی توثیق اسلامی نظریاتی کونسل کر چکی ہے۔

- ضرورت ہے کہ قرآن سے ہونے والی ان تمام نام نہاد شادیوں کو کالعدم اور ایسا قرار دیا جائے جیسے یہ وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی تھیں، اور اس بدترین روایت کی وجہ سے متاثرین کے جن حقوق کا انکار کیا گیا تھا، ان کو نقصانات کے ازالے اور معاوضے کے ساتھ بحال کیا جائے۔

- یہ تسلیم کیا جائے کہ موجودہ شکل میں جاگیرداری اس بدترین برائی کی اصل وجہ ہے جو ونی اور سوارا اور قرآن پاک سے شادی جیسی قبیح رسم و رواج کو شروع کرنے، تحفظ دینے اور اس عمل کو جاری رکھنے اور افراد کو ان کے قانونی حقوق سے محروم رکھنے کا سبب بنتی ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ جاگیرداری کی روک تھام کے لیے سخت قانون سازی کی جائے اور ایسی اصلاحات لائی جائیں جن کو بھرپور عزم کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے۔

بچپن کی شادی کی ممانعت

بچوں کی شادی کی بندش کا (ترمیمی) مسوّدہ قانون 2009ء

عنوان: بچوں کی شادی کی ممانعت (ترمیمی) بل 2009ء
پیش کار: ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ، پاکستان مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 11 اگست 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

اس بل کا مقصد بچوں کی شادی پر پابندی کے ایکٹ 1929ء میں ترمیم کرنا تھا، اور اس مسودۂ قانون کے ذریعے مذکورہ قانون کی دفعات 2، 4، 5، 6، 8، 9 اور 12 میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔ دفعہ 2 کے پیرا (الف) کو اس طرح تبدیل کرنے کی تجویز دی گئی کہ قانوناً بچہ اس فرد کو سمجھا جائے جو 18 سال سے کم عمر کا ہو۔ موجودہ قانون کی دفعات 4، 5 اور 6 میں کسی بالغ مرد کی بچی سے شادی کرنے، شادی کی تقریب منعقد کرنے اور بچی کو شادی کی غرض سے دینے پر قیدِ محض کی سزائیں تجویز کی گئی ہیں، جو ہر معاملے میں ایک ماہ تک قید یا جرمانہ، جو ایک ہزار روپے یا دونوں سزائیں ہوسکتی ہیں۔

اس بل میں مذکورہ قانون کی دفعہ 8 میں یہ ترمیم تجویز کی گئی کہ بچوں کی شادیوں سے متعلق معاملات کو مغربی پاکستان عائلی عدالتوں کے قانون مجریہ 1964ء کے تحت قائم عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں لایا جائے۔ بل میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ اس ایکٹ کے تحت جرائم قابل دست اندازی پولیس[35] قرار دیے جائیں اور عدالت کو یہ اختیار نہ دیا جائے کہ وہ مجوزہ جرم کی تاریخ سے ایک سال کے عرصے کے بعد کسی واقعہ کا عدالتی نوٹس لے سکے۔

یہ تجویز بھی بل میں شامل تھی کہ عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ بچے کی شادی روکنے کے لیے حکمِ امتناعی جاری کرسکے اور حکمِ امتناعی کی خلاف ورزی پر تجویز کردہ سزا میں اضافہ کیا جائے، جو ایک سال قید

تک اور ایک لاکھ روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوں۔

محرّک نے درج ذیل الفاظ میں بل کے اغراض ومقاصد اور وجوہ بیان کیں:

''غربت، جہالت، ناخواندگی، معاشرتی اور ثقافتی عوامل وہ عناصر ہیں جن کو بچے کی شادی میں اضافے کی وجہ بیان کیا جاتا ہے۔ کم عمری کی شادی جلد حمل کا باعث بنتی ہے جو آخر کار کم عمر لڑکی کی صحت کو متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر کمسن دلہن پر بچے پالنے کا بہت زیادہ دباؤ ڈال دیا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں 15 سے 18 سال عمر کی بچیوں کی موت کا بڑا سبب کم عمری میں حمل ٹھہرنا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے بچے کے حقوق کے کنونشن کے مطابق ایک بچہ وہ فرد ہے جو 18 سال سے کم عمر ہو۔ بدقسمتی سے کم عمر بچوں کی شادیوں کا رواج پاکستان کے تمام علاقوں خاص طور پر غریب شہری اور دیہی علاقوں میں عام ہے۔ اس ترمیم کا مقصد ایک رکاوٹ پیدا کرنا اور جوڑے کی عمر میں عدم مساوات کا خاتمہ ہے۔''

موجودہ قانون اور عمل

بچے کی شادی کی روک تھام کا قانون مجریہ 1929ء کم عمر بچوں کی شادیوں کے انعقاد کو روکتا ہے۔ یہ ایکٹ مجسٹریٹ درجہ اول کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں آنے والے علاقوں میں منعقدہ بچوں کی شادیوں یا ہونے والی ایسی شادیوں کا عدالتی نوٹس لے۔ یہ ایکٹ عدالت کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ اگر وہ کسی شکایت کی صورت میں یا علاوہ ازیں اس اطلاع پر مطمئن ہو کہ اس ایکٹ کی خلاف ورزی میں شادی کا انتظام کیا گیا ہے، یا کیا جانے والا ہے، تو اس کے خلاف حکمِ امتناعی جاری کرے۔ تاہم عدالت یہ نوٹس صرف یونین کونسل کو یا یونین کونسل کی عدم موجودگی میں صوبائی حکومت کی جانب سے مقرر کردہ بااختیار شخص کی شکایت پر لے گی۔ اس ایکٹ کے تحت جرم کے ارتکاب کے ایک سال بعد ایسا نوٹس نہیں لیا جا سکتا۔

اس ایکٹ کے تحت ایسے بالغ شخص کو، جو بچے کے ساتھ شادی کا معاہدہ (نکاح) کرتا ہے، اور جو شخص بچے کی شادی منعقد کرتا، اس کا انتظام کرتا یا بچے کی شادی کے لیے رہنمائی کرتا والد یا سرپرست کی حیثیت سے شادی کے لیے بچے کو دیتا ہے، وہ ایک ماہ تک قید محض یا ایک ہزار روپے تک جرمانہ یا دونوں

سزاؤں کا مستوجب ٹھہرایا گیا ہے، اس استثنٰی کے ساتھ کہ عورتوں کو قید کی سزا نہیں دی جائے گی۔

یہ ایکٹ اپنی دفعہ 2 میں بچے کی تعریف اس طرح کرتا ہے: ''ایک شخص جو، اگر لڑکا ہے تو 18 سال کی عمر کا ہو اور اگر لڑکی ہے تو 16 سال کی ہو۔''

مشاہدات

اس بل میں بچوں کی شادی کی بندش کے ایکٹ مجریہ 1929ء میں بعض نہایت بنیادی تبدیلیاں تجویز کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح تبدیلی بچے کی تعریف کے سلسلے میں ہے۔ موجودہ قانون لڑکے اور لڑکی کے لیے عمر کا تعین یکساں طور پر نہیں کرتا۔ اس قانون کے تحت ایک لڑکی 16 سال کی عمر میں، جب کہ لڑکا 18 سال کی عمر میں بالغ تصور کیا جائے گا۔ اس ترمیم کو قبول کیے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ بلا لحاظِ جنس لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی 18 سال کی عمر ہونے پر شادی کے لیے اہل ہوتے۔

اس مسودۂ قانون نے سزاؤں میں مندرجہ ذیل افراد کے لیے کافی اضافہ بھی تجویز کیا تھا:

- ایسا بالغ مرد جو کسی کم سن بچی سے شادی کرے؛
- ایسا شخص جو بچے کے ساتھ شادی کی رسم ادا کرتا، اس کا اہتمام کرتا یا اس کا حکم دیتا ہے، جب تک کہ وہ یہ ثابت نہ کردے کہ قابلِ اعتبار وجوہ کی بنیاد پر اسے یقین تھا کہ یہ شادی بچے کی شادی نہیں تھی؛ اور
- جس بچے کی شادی ہو رہی ہے، اس کی کفالت، دیکھ بھال کرنے والا شخص، خواہ وہ والد ہو یا سرپرست یا وہ کسی دوسرے قانونی یا غیر قانونی حیثیت میں ہو اور وہ ایسی شادی کے عمل کی حوصلہ افزائی کرتا یا اس کا اہتمام کرنے کی اجازت دیتا یا اس کا انعقاد ہونے سے روکنے میں غفلت برتتا ہو۔

تیسری اہم تبدیلی یہ ہے کہ بل میں اس ایکٹ کے تحت دائرۂ اختیار کو تبدیل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ موجودہ قانون میں صرف مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت کو اس ایکٹ کے تحت جرائم پر مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے۔ بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ اس ایکٹ کے تحت مقدمات کو عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں دیا جائے۔ تجویز کے مطابق عائلی عدالتوں کو بچے کی شادی کی بندش کے ایکٹ مجریہ 1929ء کے تحت ایک جرم کا اسی طرح عدالتی نوٹس لینے کا اختیار حاصل ہو جائے گا جیسا کہ

تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے مجریہ 1898ء کی دفعہ 190 میں فراہم کیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عائلی عدالت مندرجہ ذیل طریقوں میں عدالتی نوٹس لے گی۔

(الف) حقائق کی ایسی شکایت موصول ہونے پر جو اسے جرم قرار دیتی ہو۔

(ب) ایسے حقائق کی تحریری رپورٹ پر جو کوئی پولیس افسر کرے۔

(ج) پولیس افسر کے سوا کسی دوسرے شخص کی طرف سے موصول ہونے والی اطلاع پر یا اس کے اپنے علم اور شک کی بنیاد پر پیش کی جانے والی رپورٹ پر۔

قانون کے موجودہ ڈھانچے میں مجسٹریٹ کی عدالت بچے کی شادی کی بندش کے ایکٹ کے تحت اُس وقت تک عدالتی نوٹس نہیں لے سکتی، جب تک یونین کونسل یا اگر وہاں یونین کونسل نہیں ہے تو کوئی ایسا مجاز شخص جس کو صوبائی حکومت نے اپنی جانب سے مقرر کیا ہو، شکایت نہ کرے۔

بل میں بچے کی شادی کی بندش کے ایکٹ کے تحت تمام جرائم کو قابلِ دست اندازی پولیس بنانے کی تجویز کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کو کسی معقول شکایت، قابلِ بھروسہ اطلاع اور معقول شک کی بنیاد پر اور کسی عدالت سے جاری وارنٹ کے بغیر اس ایکٹ کے تحت کسی جرم سے متعلق ایک شخص کو گرفتار کرنے کا اختیار ہوگا۔

بچے کی شادی کو روکنے کے لیے حکمِ امتناعی جاری کرنے کا طریق کار بھی اس بل کے موضوعات میں سے ایک تھا۔موجودہ قانون میں عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے، لیکن کسی شخص کے خلاف کوئی حکمِ امتناعی اُسے پہلے نوٹس دیے اور حکمِ امتناعی کے خلاف اظہارِ وجوہ کا موقع دیے بغیر جاری نہیں کیا جا سکتا۔ بل نے ایسے شخص کے لیے سزا میں اضافہ تجویز کیا ہے جو بچے کی شادی کو روکنے کے لیے عدالت کی طرف سے جاری حکمِ امتناعی کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کرتا ہے۔

تبصرہ

کم سنی کی شادی ان موضوعات میں سے ایک ہے جو خاندان کے حوالہ سے قانون سازی کے ضمن میں خبروں کا ایک بڑا موضوع رہتے ہیں۔نکاح کے اسلامی ادارے کی بنیاد شادی کرنے والے افراد کی

باہمی رضامندی ہے، اور اسلام کا مطمعِ نظر معاشرے کی عمومی بھلائی ہوتا ہے۔ اسلام نکاح کو ایک معاہدہ اور ایک مضبوط پیمان سمجھتے ہوئے چاہتا ہے کہ شادی کا فیصلہ متعلقہ مرد و زن کی آزاد مرضی اور خوش دلی کے ساتھ اور معاشرے کی سرگرم شرکت سے طے پائے۔ تاہم اسلام تسلیم کرتا ہے کہ انسانی معاشرے میں ایسی صورتیں بھی درپیش آسکتی ہیں جہاں کسی فرد کو خلافِ معمول فیصلہ اور عمل کرنا پڑ جائے۔ اسلامی تعلیمات کی یہی وہ لچک ہے جس نے اسے انسانوں کی ضروریات کو ہر علاقے اور ہر زمانے میں پورا کرنے کے قابل بنایا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کم سنی کی شادی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور کسی بھی شخص (مرد یا عورت) کو یہ اختیار دیتا ہے کہ اگر اس کی شادی اس کے بچپن میں ہوئی تھی تو وہ عدالت کے ذریعہ منسوخ کرالے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایسے نکاح کو کالعدم قرار دیا تھا، جہاں ایک عورت کی شادی اس کی رضامندی کے بغیر ہوئی تھی۔[36] ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک لڑکی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ ''میرے والد نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے اس لیے کر دی ہے کہ اس کا مقام و مرتبہ بلند ہو جائے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے انتخاب کا اختیار دیا تو لڑکی نے کہا: ''میں اس کو منظور کرتی ہوں جو میرے والد نے کیا ہے۔ لیکن میں عورتوں کو بتانا چاہتی تھی کہ ان کے والدین کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں''[37] شادی کرنے والے افراد کی مرضی کے بغیر ہونے والی شادیوں کے حوالے سے یہ طرزِ عمل اس امر کا عملی مظاہرہ ہے کہ شادی کرنے کا فیصلہ اصل میں شادی کرنے والے شخص کا ہے، اور اس (مرد یا زن) کے بڑوں کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں اس کی پسند کا احترام کریں۔ اگرچہ اسلامی قانون نے سرپرست کو یہ اختیار دیا ہے کہ کم سن کی شادی کرنے کا معاہدہ کرے یا اس کی طرف سے شادی کے معاہدہ کے لیے رضامندی کا اظہار کرے لیکن اس حوالے سے سرپرست اپنی زیرِ کفالت کم سن کی فلاح و بہبود کے احترام کا پابند ہے۔ اگر اصل باپ یا دادا کے سوا سرپرست نے دھوکہ دہی سے یا غفلت سے کام لیا یا وہ نکاح بظاہر ہی کم عمر کے لیے غیر مفید ہو، تو اس طرح ہونے والی شادی کو سمجھا جائے گا کہ کبھی ہوئی ہی نہیں ہے۔[38] اس لیے اس سلسلے میں سرپرستوں کو دی جانے والی اجازت کئی لحاظ سے محدود اور مشروط

ہے اور اس پر ناگزیر حالات کے سوا عمل نہیں کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ جب وہ اپنے خاندان کی معاونت کے قابل ہو جائیں وہ جلد شادی کر لیں۔[39] قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کو بھی صرف اسی وقت شادی کرنی چاہیے جب وہ ازدواجی فرائض ادا کرنے اور دوسری اہم ذمہ داریاں ادا کرنے کے لائق ہو جائے۔

بچے کی تعریف

بچے کی تعریف مختلف قوانین میں ان کے نفسِ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء کی دفعہ 82 اور 83 کے مطابق 7 سال سے کم عمر بچہ کوئی جرم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مجرمانہ نیت کرنے اور اس کو قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جبکہ 7 اور 12 سال کی عمر کے بچے کو اس وقت تک جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے نیت کرنے اور اس پر قائم رہنے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ فعل کی نوعیت اور اس کے نتائج کو پرکھنے کی صلاحیت میں پختگی حاصل کر چکا ہے۔ 12 سال سے اوپر کی عمر کے نوجوان کو تعزیراتِ پاکستان (Pakistan Penal Code 1860) اور کم سنوں کے عدل کے نظام آرڈیننس مجریہ 2000 (Juvenile Justice System Ordinance, 2000) دونوں جرم اور سزا پانے کے لحاظ سے ایک بالغ شخص کے برابر قرار دیتے ہیں۔

بلوغت ایکٹ مجریہ 1875ء (Majority Act, 1875) میں کہا گیا ہے کہ ایک شخص 18 سال کی عمر میں بلوغت حاصل کرتا ہے، لیکن اس کا اطلاق شادی سمیت متعدد معاملات میں نہیں ہوتا۔ سرپرستوں اور زیرِ نگرانی افراد کے ایکٹ مجریہ 1890ء (Guardians and Wards Act, 1890) کے مطابق اگر عدالت کسی فرد کے لیے سرپرست مقرر کرتی ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی عمر کے 21 سال پورے ہونے پر بلوغت کو پہنچ جائے گا۔

مسلم عائلی قانون آرڈیننس مجریہ 1961ء کے تحت نان نفقہ کے مقصد کے لیے بچے کی تعریف

میں ایسا شخص شامل ہے جس نے قانونی طور پر بالغ شخص کا درجہ اور بلوغت حاصل کر لی ہو، لیکن اپنی کفالت خود کرنے کے قابل نہ ہو۔[40] اس لیے والد پابند ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی ہونے تک کفالت کرے۔ بیٹوں کی صورت میں اُسے ان کے قانونی طور پر بالغ ہونے تک کفالت کرنا ہوگی۔[41] البتہ اسے اپنے بیٹوں کی کفالت کے لیے ادائیگی ان کے بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی جاری رکھنا ہوگی اگر وہ جسمانی یا ذہنی طور پر یا کسی بیماری کی وجہ سے معذور ہیں۔[42]

1926ء میں جب بچوں کی شادی کی بندش کا ایکٹ منظور کیا گیا تو لڑکی کی قانونی طور پر شادی کی عمر 14 سال رکھی گئی تھی۔ بعد میں مغربی پاکستان مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961 کے ذریعہ اس میں ترمیم کر دی گئی اور اس مقصد کے لیے یہ عمر 16 سال مقرر کی گئی۔

زیرِ بحث ترمیمی بل نے اقوامِ متحدہ کے بچے کے حقوق پر کنونشن میں دی گئی تعریف کا حوالہ دیا۔ لیکن متعدد قوانین میں موجود تفریق ظاہر کرتی ہے کہ 18 سال کی عمر کو اصول قرار دے کر ہر جگہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اقوامِ متحدہ کے کنونشن کا یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے قومی سطح کے نظامِ قانون کے ہر شعبے میں بچے کی اس میں دی گئی تعریف کو اختیار کیا جائے۔ حتیٰ کہ کنونشن خود بھی بچے کی دیکھ بھال اور اس کی خوش اسلوبی کے ساتھ نشوونما کے لیے ہر قوم کی روایات و رسومات اور ثقافتی اقدار کو اہم قرار دیتا ہے۔[43] 13 نومبر 2014ء کو اقوامِ متحدہ، سیڈا (CEDAW) اور بچوں کے حقوق کے تحفظ کے عالمی معاہدے (Convention on Right of the Child) کی مشترکہ کمیٹی نے سفارشات میں یہ بات شامل ہے کہ اگرچہ مرد و خواتین کی شادی کے لیے کم از کم قانونی عمر 18 سال مقرر کی گئی ہے تاہم استثنائی صورتوں میں اسے 16 سال تک کم کیا جا سکتا ہے، تاہم شادی کرنے والے فرد کی آزاد مرضی کو یقینی بنانے پر زور دیا گیا ہے۔[44] یہ کہا جا چکا ہے کہ شادی کے لیے مثالی عمر وہ ہے جب کوئی فرد شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ شادی کا تعلق خاص عمر سے نہیں بلکہ بلوغت سے ہے۔ بلوغت ایک فطری مظہر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد نے ازدواجی فریضہ کی ادائیگی کے لیے مطلوبہ جسمانی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ زنا کے جرم (نفاذِ حدود) آرڈی نینس

مجریہ 1979ء نے اسی وجہ سے بالغ شخص کی اس طرح تعریف کی ہے کہ ایسا شخص جس نے مرد ہونے کے ناطے 18 سال اور عورت ہونے کی صورت میں 16 سال یا بلوغت حاصل کر لی ہو۔ پاکستان میں رائج عیسائی شادی ایکٹ مجریہ 1872ء کے تحت بھی اگرچہ شادی کی عمر 21 سال مقرر کی گئی ہے لیکن اس قانون کی دفعہ 19 کے تحت مذکورہ عمر سے کم عمر فرد کی شادی اس کے والد یا سرپرست کی رضامندی سے کی جاسکتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے حقوقِ اطفال پر کنونشن نے اعتراف کیا ہے کہ مختلف ثقافتوں میں بچے کی تعریف مختلف ہوسکتی ہے۔ اس لیے اس کنونشن کی پہلی شق میں بچے کو ایک ایسے انسان کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جو 18 سال کی عمر سے کم ہو، الّا یہ کہ قابلِ اطلاق قانون کے تحت وہ اس سے قبل بالغ سمجھا گیا ہو۔

گویا شادی کے لیے قانونی عمر میں اضافے کے لیے قانون میں ترمیم کی تجویز کو بین الاقوامی قانون میں موجود گنجائش کے ساتھ ساتھ سماجی عوامل اور قانونی ضروریات کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوگا۔

پاکستانی معاشرے میں کم عمر بچوں کی شادیاں

پاکستانی معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو شروع میں یہ کہنا ضروری ہوگا کہ اگرچہ کم عمری میں بچوں کی شادیوں کے واقعات کا ذکر تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کو میڈیا کے ذریعے منظرِ عام پر لایا جاتا ہے، لیکن کم عمر بچوں کی شادیوں میں موجود خطرات کے بارے میں عوامی بیداری اور اس حوالہ سے خدشات میں اضافہ ہوا ہے۔ نتیجتاً شہری علاقوں نے خاص طور پر ایسے واقعات میں کمی ظاہر ہوئی ہے اور بچوں کی شادیاں ان علاقوں میں عملاً ممنوعہ فعل بن رہا ہے۔ تاہم معاشرے اور قانون نے اس روایت پر مکمل پابندی عائد نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ بندش کے قانون کی موجودگی میں بھی معاشرے اور قانون کی عدالت نے تسلیم کیا ہے کہ اگرچہ کم سنی کی شادی، بچے کی شادی کی بندش کے ایکٹ کی خلاف ورزی پر مستوجب سزا ہوگی، لیکن شادی صرف اس بنیاد پر غیر قانونی نہیں ہوگی۔[45]

ایک اور عنصر جس کی وجہ سے پاکستانی معاشرے کے بہت سے طبقات میں اس عمل کو ترجیح نہیں مل رہی ہے، وہ مذہب کی بڑھتی ہوئی بیداری ہے۔ ملک میں خواندگی کی شرح اب بھی نہایت افسوسناک حد

تک کم ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کل نسبتاً بڑی تعداد میں لوگوں کی مذہب کے اصل مآخذ تک براہِ راست رسائی بھی بڑھ گئی ہے، جن میں قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ شامل ہیں۔ گزشتہ چند عشروں میں مذہبی تعلیم میں خاصا اضافہ دیکھا گیا ہے۔ ملک کے اندر مختلف اسلامی شعبوں کے متعارف ہونے کے ساتھ اسلامی قانون میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اسکالروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس صورتحال نے عوام کے اندر ان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں اسلامی احکامات کی صحیح تشریح کرنے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اب زیادہ لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ شادی بنیادی طور پر شادی کرنے والے جوڑے کے درمیان ایک معاہدہ ہے اور اس عمل میں ان کی آزاد مرضی کو ترجیح دینا ہوگی۔

اس سلسلے میں شعور بیدار کرنے والے عوامل میں میڈیا کا بھی ایک کردار رہا ہے، جس نے جہاں ایک طرف کم عمر بچوں کی شادیوں میں پوشیدہ خطرات کو بے نقاب کیا ہے اور اُن کی حقوق سے محرومی کو واضح کیا ہے، وہیں دوسری طرف اس تناظر میں قانونی اور اسلامی شعور کو بھی بیدار کیا اور پھیلایا ہے۔ یوں اگرچہ اب بھی بچپن کی شادیاں کی جاتی ہیں لیکن انہیں بالعموم پسند نہیں کیا جاتا۔ بل کے محرّک نے اغراض و مقاصد و وجوہ کے بیان میں صحیح کہا ہے کہ غربت، ناخواندگی اور سماجی و ثقافتی عوامل وہ عناصر ہیں جو زیادہ تر بچپن کی شادیوں کا سبب بنتے ہیں۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو سماجی اور ثقافتی رسوم و رواج بھی ناخواندگی اور جہالت کی پیداوار یا غربت کے واضح نتائج ہیں۔ اگر ان موجود وجوہ و اسباب کو مؤثر طور پر دور نہیں کیا جاتا تو کوئی قانونی ضابطہ یا سزا اس سلسلے میں مؤثر نہیں ہو سکے گی۔

کم عمر بچوں کی زیادہ تر شادیاں والدین 'ونی' اور 'سوارا' جیسی رسوم کے دباؤ کے تحت کرتے ہیں۔ یہ بات پہلے ہی زیرِ بحث آ چکی ہے کہ یہ بُری رسومات معاشرے کے جاگیردارانہ طرزِ زندگی کی وجہ سے برقرار اور محفوظ ہیں۔ جن علاقوں میں تعلیم اور روزگار کے مواقع زیادہ ہیں، وہاں جہالت کے ایسے اقدامات کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ سرگرمی کے ساتھ قانونی اور انتظامی اقدامات کے ذریعے جاگیردارانہ کلچر کو ختم کیا جائے۔

بعض دوسری صورتوں میں والدین اپنے بچوں کی کم عمری میں شادی کے لیے حالات کے جبر کے تحت بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مہلک بیماری میں ملوّث بیوہ خاتون کو کوئی ایسا قابلِ بھروسہ شخص

نہ مل رہا ہو جو اس کی وفات کے بعد اس کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے، تو وہ اسی پر راضی ہو گی کہ بیٹی کی شادی ہو جائے اور وہ کسی ایسے گھر میں چلی جائے جہاں اس کی حفاظت ہو اور اس کا خیال رکھا جائے۔ اسی طرح ایک بے سہارا یتیم بچی کے لیے بہترین انتخاب اس کی کسی ایسے شخص کے ساتھ شادی ہو گی جو اس کو اس کی زندگی میں پناہ، لباس، خوراک اور عزت دینے کے لیے تیار ہو۔ گویا کم سنی کی شادی کو ترجیح نہ دینے کے باوجود اسے مکمل طور پر منع نہ کرنے میں جو دینی حکمت پوشیدہ ہے اس کا لحاظ کئی حوالوں سے مفید ہو گا۔ یہ مناسب نہیں ہو گا کہ کم سنی کی شادی کو علی الاطلاق غیر قانونی اور مستوجبِ سزا قرار دے دیا جائے۔

جدید رجحانات اور حالیہ ترقی نے بھی شادی سے متعلقہ امور پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ شادی کے لیے ضروری ہے کہ شادی کا خواہش مند خاندان کی دیکھ بھال کے لیے مناسب مالیاتی استحکام کا حامل ہو اور بدلتے ہوئے حالات میں بالعموم یہ مشکل ہے کہ متعلقہ شعبے میں مناسب تعلیم کے بغیر اچھی ملازمت مل سکے۔ ان لوگوں کو بھی جو کاروباری دنیا میں داخل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، مضبوط تعلیمی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ اس میدان میں آگے بڑھ سکیں۔ تعلیم کی وہ سطح جو بہتر آمدنی حاصل کرنے کے لیے کسی شخص کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کم سنی کی عمر گزارنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر ایک فرد کو خاندان کے قیام اور تحفظ کے لیے درکار مالیاتی استحکام حاصل کرنے کے لیے مزید تین سے چار برسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح پاکستان میں شادی کے وقت مرد کی اوسط عمر 25 سے 30 سال ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ لڑکیوں میں تعلیم کے رجحان میں اضافے کے ساتھ ساتھ شادی کرنے والے جوڑے کی عمر کے درمیان زیادہ فرق کو اکثر پسند نہیں کیا جاتا، اس لیے لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر بھی بڑھ کر عملاً 21 سال سے 25 سال تک اوسطاً ہو گئی ہے۔ معاشرے میں یہ تبدیلی قانونی اقدامات کے بغیر اور معاشرتی و اقتصادی عوامل کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔

شادی کے ادارے میں کارفرما ایک نمایاں عامل یہ ہے کہ یہ ادارہ ماورائے ازدواجی تعلقات روکنے اور عصمت کے تحفظ کا باعث ہے۔ حالیہ عرصے میں جہاں میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ہونے والی حالیہ ترقی کی کے نتیجے میں معلومات تک عام رسائی ممکن ہوئی ہے، وہاں ان سہولتوں کے غلط استعمال نے اخلاقیات اور رویوں کو بُری طرح نقصان بھی پہنچایا ہے۔ بہکاوے اور ترغیب کے اس ماحول میں یہ نہایت

ضروری ہے کہ شہوانی لذّت کے جائز ذرائع کو سب کے لیے آسانی کے ساتھ قابلِ رسائی رکھا جائے اور ہر ممکن حد تک شادی کرنے میں رکاوٹوں سے گریز کیا جائے۔

یہ درست ہے کہ معاشرتی اور مالیاتی عوامل کی بنا پر بچپن کی شادی کو پسند نہیں کیا جاتا، پھر بھی لوگ اس کو ناجائز اور ممنوع نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انہیں کسی وجہ سے ایسی شادی کرنی پڑے تو وہ قانون کی دسترس سے بچنے کے لیے راستے تلاش کر لیتے ہیں، چاہے یہ شادی کسی ظالمانہ رواج کے تحت کی گئی ہو یا حالات کے جبر کے تحت۔ مثلاً یہ دیکھا گیا ہے کہ بچپن کی شادی کے اکثر واقعات میں ملزم کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یہ شادی خاندان کی کسی عورت کے ایماء اور حکم پر اور مرد سرپرستوں کی مرضی کے بغیر ہوئی ہے۔ اس طرح ان کی یہ بات انہیں اس ایکٹ کی دفعہ 6 میں قید کی سزا سے عورتوں کو ملنے والے استثناء کو حاصل کرنے کے لائق بنا دیتی ہے، اور اس ایکٹ کے تحت کسی عورت کو سزا نہیں ملتی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن کی شادی پر بندش کے ایکٹ کے تحت عورتوں کو حاصل قید سے استثنیٰ ختم کر دی جائے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور اب جبکہ عورتوں کے لیے قید کی سزا کے نہایت برے اثرات کے احساس کے تحت ان کے لیے قوانین میں نرمی کی جا رہی ہے، یہ بات قرینِ انصاف نہیں ہوگی کہ بچپن کی شادی کی بندش کے ایکٹ میں عورتوں کو قید کی سزا میں دیے ہوئے استثنیٰ کو ختم کر دیا جائے۔ تاہم قانون سازوں کو یہ احساس کرنا ہوگا کہ لوگ ہمیشہ ایسے قانون سے بچ نکلنے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں، جو ان کے عقائد سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ کوئی ایسا قانون جس کو عوام کی حمایت حاصل نہ ہو، لوگ اس کی پابندی بھی نہیں کرتے۔ اصل تبدیلی معاشرتی سطح پر ہونے والی کوشش سے ہوگی اور اگر لوگ ذہناً تیار نہ ہوں تو کوئی قانون معاشرے کو بدلنے اور طرزِ فکر میں تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتا۔ بچپن کی شادی کے واقعات میں کمی کی جا سکتی ہے، اگر ناخواندگی، غربت اور جاگیرداری کو علم، روزگار اور عدل و انصاف سے تبدیل کر دیا جائے۔

بچپن کی شادی کی متعدد معاشرتی، مالیاتی اور دیگر متعلقہ جہتیں ہیں، اور اس حوالے سے موجودہ یا مجوزہ قانون کے تحت مقدمہ بازی اور سزا پر مبنی حل اپنے اندر مزید پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھا جائے اور پھر اس کا جامع حل نکالا جائے، جس سے نہ صرف بچپن کی

شادیوں کی حوصلہ شکنی کی جاسکے بلکہ اس مسئلہ کی دوسری جہتوں پر بھی غور کیا جاسکے۔ یہ تجویز پورے اطمینان کے ساتھ دی جاسکتی ہے کہ ایسے حل کی صورت میں سماجی اور انتظامی اقدامات سامنے آئیں گے جن سے زندگیوں میں قانونی اور تعزیراتی اقدامات نہیں، عوامی بیداری اور خوشحالی آئے گی۔

سفارشات

- بچپن کی شادیوں کے مسئلہ کو ایک ایسے نئے انداز میں حل کیا جائے جس سے اس رواج کی حوصلہ شکنی ہو لیکن دوسری طرف بچپن کی ایسی شادیوں کی گنجائش ختم نہ کی جائے جن کا کوئی جواز موجود ہو۔
- بچپن کی شادیوں کی خرابیوں پر غور کرنے کے لیے لوگوں کے ضمیر کو مخاطب کیا جائے۔
- غربت، ناخواندگی اور عدم ترقی کو جاہلانہ رجحانات اور رسوم و رواج کے بنیادی اسباب قرار دیتے ہوئے ان کا سدّ باب کیا جائے۔
- معاشرتی بیداری کی مہمات اور خواندگی میں اضافہ عوام کے رویوں اور سوچنے کے انداز میں تبدیلی لائیں گی نہ کہ محض قانون۔
- جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر کے خاتمے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

بچوں کی کفالت کے لیے لازمی عبوری حکم

عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) بل 2008ء

عنوان: عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) بل 2008
پیش کار: وفاقی وزیر قانون
بتاریخ: 18 اگست 2008ء
کیفیت: 19 اگست 2009ء کو قومی اسمبلی سے منظور ہوا۔ 15 اکتوبر 2009ء کو سینیٹ سے ترمیم کے ساتھ منظور ہوا۔ پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں پیش نہ ہو سکا اور زائد المیعاد ہو گیا۔

اس بل کا مقصد عائلی عدالتوں کے ایکٹ 1964ء کی دفعہ 17-الف کی تبدیلی تھا۔ تجویز کردہ دفعہ 17-الف کو اگر اپنا لیا جاتا تو عائلی عدالتوں کے لیے لازم قرار پاتا

کہ وہ بچوں کی کفالت کے دعویٰ کے ابتدائی مرحلے میں ہی عبوری طور پر یہ طے کردے کہ مقدمے کے دوران بچوں کا والد ایک متعین رقم طے کردہ عرصے کی ہر مدت کے بعد بچوں کے نفقہ کے طور پر ادا کرے گا۔ مجوزہ دفعہ 17-الف کا متن یہ تھا:

''17-الف: حکمِ امتناعی برائے کفالت:

عائلی عدالت:

(الف) بچوں کی کفالت کے دعویٰ میں تحریری بیان داخل کیے جانے کے فوری بعد عدالت کفالت کے لیے ایک عبوری حکم جاری کرے گی، اور

(ب) کفالت کے لیے کسی دوسرے دعویٰ کی صورت میں سماعت کے کسی مرحلے پر کفالت کے لیے عبوری حکم جاری کر سکے گی۔ جس کے تحت پیشگی ادائیگی ہر ماہ کی چودہ تاریخ تک کر دی جائے گی اور نہ کرنے کی صورت میں عدالت حق دفاع منسوخ کرتے ہوئے فیصلہ صادر کر سکے گی۔''

یہ بل قومی اسمبلی نے کسی ترمیم کے بغیر منظور کر لیا تھا، تاہم سینیٹ نے اسے ترمیم کے ساتھ منظور کیا، جس کے بعد مجوزہ دفعہ کی شق (الف) یوں ہوگئی:

''(الف) کسی بچے کی کفالت کے لیے دعویٰ میں مدعا علیہ کی طرف سے پیش ہونے کے فوراً بعد کفالت کے لیے عبوری حکم جاری کرے گی۔''

اس بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ ان الفاظ میں بیان کیے گئے تھے: ''اس بل کا مقصد کفالت کے لیے دعویٰ میں سماعت کے ابتدائی مرحلے میں بچوں کو نان نفقہ کی فراہمی کے ذریعہ فوری سہولت فراہم کرنا ہے۔''

موجودہ قانون اور عمل

کفالت کا معاملہ عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کی دفعہ 9 میں طے کیا گیا ہے۔ اس دفعہ کے تحت بیوی کا اپنے شوہر پر ناقابلِ تردید حقِ کفالت تسلیم کیا گیا ہے، جسے کسی مضبوط اور جائز وجہ کے بغیر

روکا نہیں جا سکتا۔46 تاہم والد کے ذمہ بچوں کا حقّ کفالت مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء (Code of Criminal Procedure, 1898) میں مذکور ہے، تاہم اسے مسلسل عدالتی فیصلوں نے ایک تفصیلی اور مستحکم حق کی حیثیت دی ہے۔ یہ عدالتی احکامات جو پے در پے کئی فیصلوں میں سامنے آئے، دراصل اسلامی احکامات سے ماخوذ ہیں جو پاکستانی ثقافت کی تشکیل میں ایک بنیادی جزو ہیں۔47 اس طرح عام ہونے والے اسلامی قاعدے کے مطابق باپ اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کی بلوغت تک اور بیٹیوں کی شادی تک ان کی کفالت کرے۔ اگر بچے اپنی ماں کی سپردگی میں ہوں، تو بھی والد اس فریضے سے بری الذمہ نہیں ہوتا۔

عائلی عدالتوں کے ایکٹ مجریہ 1964ء کی دفعہ 17-الف کو عائلی عدالتوں کے (ترمیمی) آرڈیننس مجریہ 2002ء (2002ء کے 55ویں آرڈیننس) کے ذریعہ شامل کیا گیا تھا۔ اس دفعہ کی رُو سے: ''کفالت کے لیے دعویٰ کی سماعت کے کسی بھی مرحلے پر عائلی عدالت نفقہ کا عبوری حکم جاری کر سکتی ہے، جس کے تحت ادائیگی ہر ماہ کے 14 ویں دن کی جائے گی، جس میں ناکامی کی صورت میں عدالت مدعا علیہ کے حقِ دفاع کو ختم کر کے دعویٰ کا فیصلہ کر سکتی ہے''۔

گویا اس دفعہ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ اس کا اطلاق صرف بیوی کی کفالت سے ہے یا بچوں کی کفالت سے بھی ہے۔ لیکن عدالتوں کا تعامل اوپر بیان کردہ طرزِ عمل کے مطابق ہی رہا ہے۔ بچوں کی کفالت کا دعویٰ دائر ہونے پر عدالت والد کی طرف سے جوابِ دعوی داخل کیے جانے بعد حکماً نفقہ کی رقم عبوری طور پر طے کر دیتی ہے، جو دعویٰ کی کارروائی کے دوران واجب الادا ہوتی ہے۔ موجودہ قانون کے مطابق یہ حکم عدالت کی صوابدید پر منحصر ہے، جس کا استعمال وہ مختلف حقائق کے پیشِ نظر کرتی ہے۔ مثلاً عدالت ان مقدمات میں یہ عبوری حکم جاری نہیں کرتی جن میں مدعا علیہ نے بچوں کے جائز اولاد ہونے کو چیلنج کیا ہو اور یہ قرار دیا ہو کہ وہ اس کے بچے نہیں ہیں۔

مشاہدات

بچوں کی کفالت سے متعلق قانون اگرچہ ضابطۂ فوجداری کا حصہ ہے لیکن دراصل موجودہ قانون جو

دراصل مسلسل عدالتی عمل سے وجود میں آیا ہے، اس سے مختلف اور اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ قانونی روایت اس قدر مستحکم ہو چکی ہے کہ اس بل نے بھی موجودہ تجویز سے قبل اس سے متلق دفعہ کو عائلی قوانین میں شامل کرنے یا مجموعہ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 488 میں ترمیم کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہٰذا اس بل میں بچوں کی فوری مدد کے طریقہ کار کو موضوع بنایا گیا اور تجویز کیا گیا کہ جوں ہی بچوں کا والد عدالت میں اپنا جوابی بیان داخل کرے گا (جس کی رُو سے وہ دعوی میں مذکور بچوں کو اپنی اولاد تسلیم کرے گا) تو اس کے لیے یہ تو لازم ٹھہرے گا کہ وہ ان کے لیے نان نفقہ ادا کرے، اور عدالت اس سلسلے میں حکم جاری کر دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ عدالت کے پاس اب بھی بیوی کی کفالت کے سلسلے میں صوابدیدی اختیار ہے لیکن اس دفعہ کے شامل ہونے کے بعد بچوں کی عبوری کفالت کے سلسلے میں وہ عارضی حکم جاری کرنے کی پابند ہو جاتی۔

اس بل میں کارفرما سوچ خاصی معقول نظر آتی ہے۔ اگرچہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 488 صرف اس صورت میں والد کو نفقہ کی ادائیگی کا پابند بناتا ہے جب اس کے پاس کافی وسائل دستیاب ہوں لیکن عدالتی طرزِ عمل یہ ہے کہ بچے کا والد ہر حال میں اس کی ضروریات کے لیے اخراجات دینے کا پابند ہے، حتیٰ کہ غربت اور کمزور مالی حیثیت بھی باپ کو اس فریضہ کی ادائیگی سے نہیں روکتی اور اس کو اس امر کی اجازت نہیں ہے کہ اپنے کم سن بچوں کو کفالت کے جائز حق سے محروم رکھے۔[48] بچوں کی کفالت کے لیے دائر دعویٰ کی صورت میں عدالت کو اس پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ آیا نفقہ قابل ادائیگی ہے یا نہیں۔ یہ بنیادی اصول طے شدہ ہے اور عدالت کو صرف اس رقم کا تعین کرنا ہے جو ہر ماہ ادا کی جائے گی۔ اگرچہ اس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ شخص اس بچے کا باپ ہونا تسلیم کرے، جس کے لیے کفالت کا دعویٰ دائر کیا گیا ہے۔

شوہر کے لیے اپنی بیوی کی کفالت بھی ضروری ہے اور وہ اس کی خوراک، لباس اور رہائش کی فراہمی کا پابند ہے۔[49] لیکن شوہر کا اپنی بیوی کو نان نفقہ دینے کا فرض اُس وقت معطل کیا جا سکتا ہے جب بیوی کسی جائز وجہ کے بغیر شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات اور سکونت چھوڑ دے اور کسی جواز کے بغیر اس کی

نافرمانی کرے۔50 بیوی کی کفالت کے لیے دائر دعویٰ میں موجود ایسے عوامل کے پیش نظر عدالت اپنی صوابدید پر اُس وقت تک کے لیے عبوری حکم جاری کرنے کو مؤخر کر سکتی ہے جب تک یہ مطالبہ معقول وجوہ کی بناء پر جائز نظر آتا ہو۔

تبصرہ

پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے میں یہ ایک تسلیم شدہ سماجی قاعدہ ہے کہ بیوی کی کفالت شوہر کی ذمہ داری ہے، جبکہ باپ کی حیثیت سے اس کو اپنے بچوں کی ضروریات کی دیکھ بھال اور ان کی خواہشات کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ بیشتر صورتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور عشروں اور نسلوں سے لاکھوں خاندان انہی بنیادوں پر مضبوط اور خوشگوار رشتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کفالت کا مسئلہ زوجین کے درمیان تنازعہ پیدا ہونے اور ان کے درمیان طلاق یا اس کے بغیر علیحدگی ہو جانے کی صورت میں اٹھتا ہے۔ جوں ہی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل افراد شادی کے معاہدے میں داخل ہوتے ہیں تو ان پر ایک دوسرے کے حقوق وفرائض وجود میں آجاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ناگزیر صورت میں یہ شادی ختم ہوتی ہے تو وہ تمام حقوق وفرائض یک بیک ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اسلامی احکامات کے مطابق جاری رہتے ہیں۔51 تاہم یہ امر افسوسناک ہے کہ بعض اوقات طلاق کے ذریعہ یا اس کے بغیر علیحدگی کی صورت میں مرد نہ صرف اپنی بیوی یا مطلقہ 52 کو بلکہ بچوں کو بھی نان نفقہ کی ادائیگی سے انکار کر دیتے ہیں اور یوں اس حوالے سے اسلام کے احکامات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان علاقوں اور برادریوں میں جہاں معاشرتی ڈھانچہ ابھی تک برقرار ہے اور بزرگوں کے کردار کو تسلیم کیا جاتا ہے، ایسے معاملات مقامی سماجی چلن کے مطابق حل کر لیے جاتے ہیں، اور بالعموم اس حل میں فریقین کے حقوق کی اطمینان بخش طور پر ضمانت موجود ہوتی ہے۔ ایسے اقدامات نہ صرف دونوں فریقوں کے لیے بلکہ معاشرے کے لیے بھی فائدہ مند ہوتے ہیں کیونکہ یہ فیصلہ باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے ہوتا ہے، اور برادری کے بزرگ اس پر عملدرآمد کو یقینی بناتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نان نفقہ کا مسئلہ ایسی صورت میں پیدا نہیں ہوتا جہاں زوجین کی علیحدگی مبارات 53 کے ذریعہ عمل میں آئی ہو۔ لیکن طلاق کے زیادہ تر معاملات میں نان نفقہ کا مطالبہ عدالتوں

کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ عائلی عدالتیں سماعت سے قبل کے مرحلے میں فریقین کے درمیان سمجھوتہ اور مصالحت کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔54

اصل بل میں موجود تجویز بچوں اور ان کی ماں کے حقوق کے لیے موجودہ تشویش کی غماز ہے اور اگر قانون کے مطابق جوابِ دعویٰ، دعویٰ دائر کیے جانے کے 30 دن کے اندر داخل کر دیا جائے55 تو ایسی تجویز پر عمل بہت مناسب ہوتا۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ بالعموم اس قانون پر عمل نہیں کیا جاتا اور مدعا علیہ جواب دعوی دائر کرنے کے لیے اضافی وقت لے لیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کافی عرصے تک اپنے حق سے محروم رہتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اگرچہ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ یک طرفہ فیصلہ کر دیں، لیکن یک طرفہ فیصلہ مدعا علیہ کو ایک اور بہانہ فراہم کرتا ہے کہ وہ ایسے فیصلے کو کسی نہ کسی اعلیٰ عدالتوں میں بہانے چیلنج کر کے دعویٰ کو طول دے۔

ایسے تمام واقعات میں جہاں عدالت کو بچوں کی کفالت کے لیے دعویٰ کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے، یہ بہترین صورت ہے کہ باپ کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ شروع ہی سے بچوں کو عبوری کفالت کے لیے ادائیگی شروع کر دے۔ زیرِ نظر بل میں بنیادی طور پر دی گئی تجویز کی منظوری مثبت اقدام ہوگا۔ یہ نہ صرف بچوں کو فوری طور پر عبوری امداد فراہم کرے گا، جیسا کہ بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں کہا گیا ہے، بلکہ ماؤں پر غیر ضروری دباؤ کو بھی روکے گا۔ اس طرح فریقین کے درمیان مصالحت کے امکان میں اضافہ اور کمسن بچوں کے حقوق کے تحفظ کا باعث بھی ہوگا۔

سینیٹ میں کی جانے والی ترمیم اگرچہ بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ فکرمندی ظاہر کرتی ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایسی صورت حال کو نظر انداز کر دیا ہے جہاں مدعا علیہ بچے کا باپ ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔

قانون میں ترمیم کے لیے بہتر صورت یہ ہوگی کہ بل کے اصل اور سینٹ کی طرف سے ترمیم شدہ حصوں کو یکجا دیکھا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جوں ہی مدعا علیہ عدالت کے سامنے پیش ہو، عبوری کفالت کا حکم جاری کر دیا جائے۔ عدالت کو البتہ ایسا حکم جاری کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، اگر وہ رسمی یا

غیر رسمی جواب میں بچے کی ولدیت سے انکار کر دے۔ امکان ہے کہ اس سے معاملے کی باریکیوں کو سلجھایا جا سکے گا۔

موجودہ اور تجویز کردہ قوانین میں مدعا علیہ کے حقِ دفاع کو اس صورت میں ختم کرنے کی صورت پیدا کی گئی ہے، اگر وہ عبوری کفالت کی رقم ادا کرنے میں ناکام ہو جائے اور اپنی ناکامی کی وجہ بیان کرنے کے لیے فراہم کیے گئے موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا ہو۔ عام طور پر عدالتیں اس دفعہ کے تحت کارروائی کرنے سے پہلے ان وجوہ پر غور کرتی ہیں جو مدعا علیہ اپنی ناکامی کی صورت میں پیش کرتا ہے، یا کم از کم اُسے ازالے کے لیے ایک موقع ضرور دیتی ہیں۔ اس حد تک لچک نہ صرف فراہمی انصاف کے لیے ضروری ہے بلکہ اپیل کے ذریعہ مزید مقدمے بازی سے بچنے کے لیے بھی لازمی ہے۔ اگر یہ خدشہ ہو کہ اس لچک کو مدعا علیہ کو تکلیف دینے کے لیے غلط استعمال کیا جا سکتا ہے، تو عدالت کو اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ مدعا علیہ کے حقِ دفاع کو ختم کرنے کے بجائے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ دے۔ اس صورت میں مدعا علیہ مقدمے میں اپنے سارے حقوق سے محروم نہیں ہوگا، بلکہ وہ صرف اپنی شہادت پیش کرنے کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اسے عدالت میں پیش کردہ گواہوں پر جرح کرنے کا پورا حق برقرار رہے گا۔

نامکمل قانون سازی

قانون سازی کے لیے طے شدہ قواعد کے مطابق پارلیمنٹ کے ایک ایوان کا منظور کردہ کوئی بل دوسرا ایوان اگر ترمیم کے ساتھ پاس کرے تو اس ترمیم کو اس کے جواز کے ساتھ پہلے ایوان میں دوبارہ پیش کرنا اور منظور کروانا ہوگا۔ اگر کوئی ترمیم دوسرے ایوان میں مسترد ہوتی ہے اور بل اس دوسرے ایوان سے واپسی کے 90 دن کے اندر پاس نہیں ہوتا تو اس بل پر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں غور ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ بل سینیٹ کی طرف سے ایک ترمیم کے ساتھ قومی اسمبلی کو واپس بھیجا گیا۔ اگرچہ بچوں اور عورتوں کے مفاد پر مبنی یہ بل حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا تھا، جسے قومی اسمبلی منظور بھی کر چکی تھی، لیکن اسے ترمیم شدہ صورت میں نہ تو مقررہ 90 دن میں قومی اسمبلی سے منظور کروایا جا سکا اور نہ ہی یہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں منظور ہوا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس سینٹ سے اس بل کی منظوری کے بعد منعقد نہیں ہوا۔ تیرہویں پارلیمنٹ کا اپنی مدت کے دوران 13 بار مشترکہ

اجلاس ہوا،[56] جن میں ہر سال یعنی پانچ مرتبہ صدارتی خطاب کے لیے اور 8 بار قومی نوعیت کے اہم معاملات پر غور کے لیے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ حکومت نے ایسے کسی اجلاس میں اتنی اہم قانون سازی کی طرف توجہ نہیں دی۔

سفارشات

- اس تجویز کو 14ویں قومی اسمبلی میں زیرغور لایا اور جلد از جلد پاس کیا جائے۔
- چونکہ والد اپنے بچوں کی کفالت کا تمام حالات میں پابند ہے، عدالتوں کو اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ مقدمے کی سماعت کے دوران اور اسے حتمی طور پر نمٹانے سے پہلے تک عبوری انتظام کے طور پر ماہانہ رقم کا تعین کر سکے۔ عبوری کفالت کا حکم مدعا علیہ کے عدالت میں پیش ہونے اور بچوں کی ولدیت تسلیم کرنے کے فوراً بعد جاری کیا جانا چاہیے۔
- عدالتیں اس بات کو یقینی بنائیں کہ جوابِ دعویٰ مقررہ وقت کے اندر داخل ہو جائے۔
- بچوں کی کفالت کے حق کو عائلی قانون میں واضح طور پر تسلیم کیا جائے۔
- ایسے معاملات کو جو عدالتوں میں جائے بغیر بھی حل کیے جا سکتے ہیں، سلجھانے کے لیے معاشرتی، سیاسی اور مصالحتی کونسلوں کو نچلی سطح پر مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔

اپنا دودھ پلانے والی ماں کی کفالت کا بندوبست

مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2009ء

عنوان: مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) بل 2009ء
پیش کار: جسٹس ریٹائرڈ فخر النساء کھوکھر، پاکستان پیپلز پارٹی
بتاریخ: 21 اپریل 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد

اس بل کے ذریعہ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کی دفعہ 9 میں ایک ذیلی دفعہ شامل کرنے کی تجویز تھی۔ اس مجوزہ ذیلی دفعہ میں کہا گیا ہے کہ ''ایک بیوی جو

مطلقہ ہے اور عدّت کی مدّت گذر چکی ہے لیکن پچھلے نکاح سے کمسن بچے کو چھاتی کا دودھ پلا رہی ہے، وہ اس کمسن کو دو سال کی دودھ پلائی کے لیے اپنے سابق خاوند سے نان نفقہ کا دعویٰ کر سکتی ہے، اور اگر سابق خاوند کا انتقال ہو جائے تو وہ یہ مطالبہ اس کی جائیداد یا قانونی ورثاء سے کر سکتی ہے، جیسے بھی صورتِ حال ہو۔''

اس بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں:

''اس بل کا مقصد مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1961ء کی دفعہ 9 میں ترمیم کر کے ان خواتین کو، جن کو طلاق ہو چکی ہے اور عدّت کی میعاد گزر چکی ہے لیکن پچھلے نکاح سے کم سن بچے کو اپنا دودھ پلا رہی ہیں، قرآن مجید کے حکم کے مطابق سابق شوہر سے اور اگر اس کا انتقال ہو گیا ہے تو یہ حق بچے کے دادا، دادی سے یا مرحوم خاوند کی جائیداد سے، کفالت کا حق دلانا ہے۔''57

موجودہ قانون اور عمل

مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1961ء کی دفعہ 9 کا تعلق بیوی کی کفالت سے ہے، اور اس کا حوالہ پہلے بحث میں آ چکا ہے۔ اس دفعہ کے تحت وہ بیوی جس کی مناسب کفالت اس کا شوہر نہ کر رہا ہو، یونین کونسل کے چیئرمین کو درخواست دے سکتی ہے، جو اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے ایک مصالحتی کونسل تشکیل دے گا۔ مصالحتی کونسل ایک سرٹیفکیٹ جاری کرے گی جس میں رقم کا تعین ہوگا، جسے خاوند کفالت کے طور پر ادا کرے گا۔ شوہر یا بیوی متعلقہ کلکٹر کے پاس درخواست دے سکیں گے، جس میں سرٹیفکیٹ پر نظرِ ثانی کی استدعا ہو۔ اس پر بھی گزشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے کہ چونکہ اس دفعہ میں بچوں کے حقِ کفالت کا ذکر نہیں، اس حق کو عدالتی عمل کے ذریعہ تسلیم اور قائم کیا گیا ہے۔

مشاہدات

چونکہ والد قانون کے مطابق اپنے بیٹوں کی کفالت کا ان کی بلوغت کی عمر اور بیٹیوں کی کفالت کا ان کی شادیوں تک ذمہ دار ہے، ایک کمسن بچے کی ماں کو بھی حق ہے کہ وہ بچے کے لیے نان نفقے کا دعویٰ کر سکے۔ تاہم ایک مطلقہ عورت اپنے لیے صرف عدّت کی میعاد کے دوران ہی کفالت کی حقدار ہے، اس

کے بعد نہیں۔[58] عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت جس کو طلاق ہو چکی ہے، لیکن وہ پچھلے نکاح سے ہونے والے بچے کو اپنا دودھ پلا رہی ہے، اسے پہلے ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچے کی کفالت کے لیے دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔ اس بل کی منظوری کا مطلب یہ ہوتا کہ کم سن بچے کو دودھ پلانے والی ماں کی کفالت کے حق کو دو سال کے عرصے کے لیے قانوناً بھی تسلیم کر لیا جاتا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید نے بچے کو دو سال تک ماں کا دودھ پلانے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

تبصرہ

دودھ پلانے والی ماں کے دودھ پلانے کی میعاد کے دوران حقِ کفالت کو تسلیم نہ کرنا قرآن کے واضح حکم کے منافی ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے پارہ کی آیت 233 میں دودھ پلانے والی ماں کو ان سہولیات کا حق دار قرار دیا گیا ہے جن سے وہ شیر خوار بچے کی مناسب طور پر دیکھ بھال اور پرورش کر سکے۔ وہ اپنے بچے کے والد سے اور اس کی وفات کی شکل میں اس کے قانونی ورثاء یا اس کی جائیداد سے اپنا دودھ پلانے کے حقِ کفالت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ بیان کردہ آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا، کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کر دو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔''
(البقرہ۲:۲۳۳)

یہ بل قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کے مطابق نظر آتا ہے۔ اس قانون کی منظوری سے بچوں کو

پورے دوسال تک دودھ پلانے کے رجحان کو فروغ ہوگا۔

تاہم اس تجویز میں یہ تحدید ہونی چاہیے کہ دودھ پلانے والی ماں کا پہلے شوہر پر حقِ کفالت ختم ہو جائے گا اگر وہ خاتون دوسری شادی کرلے۔ ایسی صورت میں سابقہ شوہر بچے کی پرورش اور کفالت کا ذمہ دار ہوگا، جب کہ عورت کی کفالت کا ذمہ دار نیا شوہر ہوگا۔

عائلی قوانین کے انتظامات کے تحت خاندان سے متعلق معاملات کو مصالحتی عدالتوں کے ذریعہ مقامی سطح پر حل کیا جانا چاہیے۔ مصالحتی کونسلیں تشکیل دینا متعلقہ یونین کونسل کے چیئرمین کی ذمہ داری ہے، جو چیئرمین اور زیرِ تصفیہ معاملے کے فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہوگی۔[59] لیکن مقامی حکومتیں اکثر غیر فعال ہوتی ہیں اور اگر قائم ہوں تو بھی مختلف قسم کی رکاوٹوں اور مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔ اس لیے عمومی خیال یہی ہے کہ یہ طریق کار مطلوب معیار کے مطابق نتائج ظاہر نہیں کر سکا لیکن اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں کہ مصالحتی کونسل کا کوئی فائدہ سامنے نہیں آیا۔

سفارشات

یہ بل ایک ایسی تجویز پر مشتمل تھا جو نہ صرف عورتوں کے حق میں ہے بلکہ یہ قرآنی حکم کا تقاضا بھی ہے۔ اس کی بنیاد پر قانون سازی کی جانی چاہیے۔ تاہم یہ وضاحت ہونی چاہیے کہ والد کی بچے کی ماں کی کفالت کی ذمہ داری اس وقت ختم ہو جائے گی جب عورت دوسری شادی کرلے گی۔

کمسن بچوں کی ماں کو لازمی سپردگی

سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی افراد کا (ترمیمی) بل 2008ء

اُس وقت کے وزیرِ قانون کی طرف سے متعارف کرائے گئے اس مسودۂ قانون کا مقصد سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی افراد کے ایکٹ مجریہ 1890ء کی دفعہ 12 کی ذیلی دفعہ (۱) کے بعد مندرجہ ذیل شرطیہ جملے کا اضافہ تھا۔

''بشرطیکہ جہاں کم سن بچے لڑکا ہونے کی صورت میں سات سال اور لڑکی ہونے کی صورت میں 16 سال کی عمر کو نہ پہنچے ہوں، عدالت سماعت کی پہلی تاریخ کو کمسن کو ماں کے حوالے کرنے اور باپ کو بچے سے ملاقات کا حق دینے کا عبوری حکم جاری کرے گی۔''

سینیٹ نے اس بل کو ترمیم کے ساتھ منظور کیا اور ترمیم شدہ متن یوں ہے:

''بشرطیکہ کمسن بچے لڑکا ہونے کی صورت میں سات سے نو سال اور لڑکی ہونے کی صورت میں نو سے گیارہ سال کی عمر کو نہ پہنچے ہوں، عدالت سماعت کی پہلی تاریخ کو ایسے کمسن بچے کو ماں کے حوالے کرنے اور باپ کو اس سے ملاقات کرنے کا حق دینے کا عبوری حکم جاری کرے گی۔''

عنوان: سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی بچوں کا (ترمیمی) بل 2008ء
پیش کار: فاروق ایچ نائیک، وفاقی وزیر قانون
بتاریخ: 20 اگست 2008ء
کیفیت: 19 اگست 2009ء کو قومی اسمبلی سے منظور ہوا۔ 15 اکتوبر 2009ء کو سینیٹ سے ترامیم کے ساتھ منظور ہوا۔ پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں پیش نہ ہوسکا اور زائد المیعاد ہوگیا۔

اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں کہا گیا ہے:

''اس بل کے ذریعہ سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی افراد کے ایکٹ مجریہ 1890ء میں ایک ترمیم تجویز کی گئی ہے، جس کا مقصد کمسنی کی عمر کے دوران کم عمر بچوں کی سپردگی حاصل کرنے کا حق محفوظ رکھنا ہے، جو کمسن کے مفاد میں ہوگا۔''

موجودہ قانون اور عمل

سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی کے ایکٹ مجریہ 1890ء (1890ء کا آٹھواں ایکٹ) ان معاملات سے متعلق ہے جہاں کسی شخص کو کمسنی، دیوانگی یا معذوری کی بناء پر کسی سرپرست کے تحفظ اور نگرانی میں دینا پڑتا ہے۔ جس شخص کو سرپرست کی حفاظت اور نگرانی میں دیا جاتا ہے، اُس کو وارڈ (زیرِ حفاظت یا زیرِ سرپرستی) کہا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق جب کوئی فرد عدالت میں کسی شخص کے لیے سرپرست مقرر کرنے کی درخواست دائر کرتا ہے تو عدالت حکم دے سکتی ہے کہ اس کمسن کو پیش کیا جائے اور عدالت

عارضی طور پر اس فرد اور اس کی جائداد کو کسی کی سرپرستی میں دینے اور جب مناسب خیال کرے دوبارہ عدالت میں پیش کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔

اس کا عملی طور پر مطلب یہ ہے کہ عدالت کسی کمسن/ دیوانے/ معذور کو عارضی طور پر سرپرست کے تقرر کے لیے دی گئی درخواست کے زیر سماعت رہنے تک کسی موزوں فرد کی تحویل میں دے سکتی ہے۔ ایکٹ کی دفعہ 7 کے مطابق کسی کمسن، دیوانے یا علاوہ ازیں معذور فرد کے لیے سرپرست مقرر کرنے کی بنیادی سوچ ایسے فرد کی فلاح و بہبود ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں عدالتی فیصلوں میں فیصلہ کن عامل یہی رہا ہے۔

قانون اور عدالتی نظائر کے تحت بچے کی فلاح کا تعین کرنے کے لیے عدالت کو کم از کم نو (9) عوامل کا خیال رکھنا ہوگا، جن میں عمر، جنس، کمسن کا مذہب، مجوزہ سرپرست کا کردار، مجوزہ سرپرست کی صلاحیت، بچے اور مجوزہ سرپرست کے درمیان رشتہ کی قربت، مرحوم والدین کی خواہش، مجوزہ سرپرست کا کمسن یا اس کی جائداد سے موجودہ یا سابقہ تعلق، اور خود کمسن کی ترجیح، اگر وہ اس عمر کا ہو کہ اپنی ترجیح کا تعین اپنی ذہانت سے کر سکے۔60

مشاہدات

اس وقت عدالتیں سرپرست کا تقرر کرتے وقت کمسن بچے 61 کی فلاح و بہبود کو بطور رہنما اصول سامنے رکھتی ہیں۔ زیر بحث بل میں کم عمر بچوں کی فلاح و بہبود کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے طے کرنے کی تجویز دی گئی تھی اور تجویز کیا گیا تھا کہ لڑکا سات سال کی عمر تک اور لڑکی نو سال سے کم عمر تک لازماً اپنی ماں کی تحویل میں رہے گی۔

تبصرہ

سرپرست کے تقرر کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے جب ایک بچہ یا ناتواں شخص (لڑکا یا لڑکی) اپنے فطری سرپرست کی نگرانی سے محروم ہو جائے۔ گویا بچے کی تحویل کا مقدمہ بالعموم اسی صورت میں دائر کیا جاتا ہے جب والدین میں طلاق یا بصورتِ دیگر علیحدگی ہو چکی ہو۔ بیشتر صورتوں میں ایسے معاملات

خاندان کے اندر موجود نظم کے ذریعے باہم مشاورت سے ہی حل کر لیے جاتے ہیں اور عدالت کے ذریعہ سرپرست کی تقرری کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم اگر سرپرست کی تقرری کا مقدمہ عدالت کے سامنے دائر کیا جاتا ہے تو عدالت بچے کی فلاح و بہبود کے اصول سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ لفظ فلاح و بہبود کا مطلب مادّی اور روحانی فلاح و بہبود ہے، اور اس کو اسی وسیع مفہوم میں لینا چاہیے۔ بچے کی جسمانی، مالیاتی اور ذہنی فلاح کے ساتھ اخلاقی اور مذہبی نشوونما کا بھی پہلو بھی مدنظر رکھا جانا اہم ہے۔62

دنیا کے بیشتر قانونی نظاموں کی طرح اسلامی قانون میں بھی باپ اپنی اولاد اور اس کی ملکیتی اشیاء کا فطری سرپرست ہوتا ہے۔ حنفی فقہ 63 کی تمام رائج کتب کے مطابق ماں ایک لڑکے کو جب تک وہ سات سال کا نہ ہو جائے، اور لڑکی کو جب تک کہ وہ بلوغت کی عمر کو نہ پہنچ جائے، اپنی تحویل میں لینے کا حق رکھتی ہے۔ اس عرصے کے دوران جبکہ بچہ ماں یا کسی اور رشتہ دار کی تحویل میں رہے، باپ کی بچے پر نگرانی بھی جاری رہتی ہے اور مالی کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ صرف باپ پر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بچے کی عملی اور قانونی تحویل باپ کے پاس ہی رہتی ہے، اگرچہ بچہ جسمانی اور حقیقی طور پر ماں یا دوسری رشتہ دار عورتوں کے پاس ہوتا ہے۔ اکثر کتب میں یہ اتفاق بھی پایا جاتا ہے کہ باپ اپنے بچوں کی تحویل کا حقدار اس وقت ہوتا ہے جب بچہ لڑکا ہونے کی صورت میں سات سال کا اور لڑکی ہونے کی صورت میں بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے۔64

لیکن جیسا کہ قانون میں بھی درج ہے، بچوں کی فلاح و بہبود کو مقدم رکھنے کے لیے ہر معاملے کو اس کی خاص نوعیت کے لحاظ سے دیکھنا ہوگا۔ اور وہ تمام امور جن کے پیشِ نظر عدالت کوئی فیصلہ کرتی ہے، دفعہ 17 میں وضاحت سے موجود ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اگر بچے کی فلاح کے منافی ہو تو بعض صورتوں میں ماں کو بھی کمسن بچی کو تحویل سے محروم کیا جاسکتا ہے یا بعض اوقات بیٹے کی عمر سات سال سے زائد ہونے کی صورت میں بھی اسے باپ کی تحویل میں نہ دینے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔65

اس تناظر میں دیکھا جائے تو قانون میں تجویز کردہ ترمیم غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ عمومی اصول کے موافق ہے لیکن یہ اصول پہلے ہی عدالتوں کے پیشِ نظر رہتا ہے اور عدالتی صوابدید ختم

کرنے سے بعض صورتوں میں بچے کی فلاح و بہبود کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔اس سے انکار نہیں کہ ماں کو پوری دنیا میں اپنے بچوں کے لیے بہت مہربان اور محبت کرنے والی سمجھا جاتا ہے۔لیکن ایسی صورتحال بھی پیش آسکتی ہے کہ وہ غیر معمولی حالات کی وجہ سے اپنے بچوں کی مؤثر دیکھ بھال نہ کر سکے۔وہ دوسری شادی کرسکتی ہے اور اس کا نیا گھر اس کے پہلے خاوند سے بچوں کے لیے امن وسکون کی جگہ شائد نہ ہو، یا وہ ایسے ماحول میں رہ رہی ہو جہاں ایسی زندگی گزار رہی ہو جو بچے کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے منافی ہو، یا وہ کسی ایسی ذہنی یا جسمانی معذوری میں مبتلا ہو کہ بچے کی نشوونما کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔

اگر بل کے محرکین نے کم عمر بچے کو اس کی ماں کے حوالے کرنے کے معاملے میں شریعت پر انحصار کیا ہے تو پھر قانون کا حصہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ جوں ہی کم سن لڑکا سات سے نو سال اور لڑکی نو سے گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو عدالت بچے کو باپ کے حوالے کرنے اور ماں کو اس سے ملاقات کرنے کے حق کا عبوری حکم جاری کرے گی۔لیکن یہ بھی مناسب نہ ہوگا بلکہ یہ اختیار عدالت کے پاس ہی برقرار رہنا چاہیے کہ وہ زیرِ سرپرستی بچے کے بہترین مفاد میں مقدمے کا فیصلہ کرے۔

یہ تذکرہ بھی مناسب ہے کہ کم سن بچے کی حضانت کے حوالے سے موجود قانون میں کسی ترمیم کی ضرورت بالعموم محسوس نہیں کی گئی اور حقوقِ نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والے اداروں اور افراد کی طرف سے بھی ایسا کوئی مطالبہ نمایاں طور پر سامنے نہیں آیا۔حقیقت یہ ہے کہ تمام تر خامیوں کے باوجود عدالتوں کو عام طور پر عوام کا اعتماد حاصل ہے، اور کمسن بچے کی فلاح و بہبود کا تعین کرنے کے ان کے عزم کا بھی ہمیشہ احترام کیا جاتا ہے۔

یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس وقت رائج عدالتی طرزِ عمل میں والدین میں سے کسی ایک یا دیگر دعوے داروں میں سے کسی کو ترجیح دینے کے لیے بچے کی رائے بھی لی جاسکتی ہے، الّا یہ کہ وہ بہت کم سِن ہو۔اگر قانون کو مجوزہ ترمیم کے مطابق دوٹوک اور بے لچک بنا دیا جائے تو وہ بچہ بھی جو اپنی رائے کے اظہار کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنا یہ کردار کھو بیٹھے گا۔

بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ اس نوعیت کا قانون خود ماؤں کے لیے بھی سہولت کا باعث نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک بچے کی ماں نے دوبارہ شادی کر لی ہے، اور وہ خود کو اس صورتحال میں نہیں پاتی کہ

وہ نئے گھر میں اپنے بچوں کو اپنے پاس رکھ سکے۔ ایسے میں اگر بچے کا باپ سرپرستی کی درخواست دائر کرے تو مجوزہ صورت میں عدالت کو یہ حکم جاری کرنا پڑے گا کہ نامناسب حالات کے باوجود بچوں کو ماں کے حوالے کیا جائے۔ ایسے میں یہ ہر ایک کے لیے خسارے کا سودا ہوگا۔ مجوزہ قانون سازی پیچیدہ حالات میں مناسب ترین حل تلاش کرنے میں عدالتی صلاحیت کو متاثر کرے گی اور اس کو پابند کر دے گی کہ وہ ایک مخصوص حکم ہی جاری کرے، چاہے حالات بدیہی طور پر بھی کم سن بچے کی فلاح و بہبود کے سراسر منافی ہی ہوں۔

قطع نظر اس کے کہ اس ترمیم کے منفی یا مثبت پہلو کیا ہو سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ بل قومی اسمبلی نے کسی بھی ترمیم کے بغیر اور سینیٹ نے ایک ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا تھا۔ ترمیم شدہ بل نہ تو دوبارہ قومی اسمبلی سے منظور کروایا جا سکا اور نہ ہی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس نے اس پر توجہ دی۔ یہاں تک کہ اسمبلی کی مدت ختم ہوگئی۔ اس رویے کو نرم ترین الفاظ میں بھی غیر سنجیدگی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔

سفارش

عدالتیں بچوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے میں ماں کی محبت سمیت متعدد عوامل کو پیش نظر رکھتی رہی ہیں، اور عام طور پر بچے کے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کے حق کو تسلیم کرتی رہی ہیں۔ اس عدالتی طرزِ عمل میں جنس کی بنیاد پر امتیاز کا شائبہ بالعموم نظر نہیں آیا۔ اس لیے موجودہ قانون میں تجویز کی گئی ترمیم غیر ضروری اور غیر مناسب معلوم ہوتی ہے۔

گھریلو تشدّد سے تحفّظ اور اس کی روک تھام

گھریلو تشدّد (تحفّظ اور روک تھام) کا بل 2009ء

یہ بل، جس کا مقصد ''عورتوں اور بچوں کو گھریلو تشدّد سے روکنے اور انہیں تحفّظ فراہم کرنے کے اقدامات کو ادارہ جاتی شکل دینا،''[66] تھا، پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ مشیر وزیر اعظم برائے ترقیٔ خواتین محترمہ یاسمین رحمٰن نے 12 اگست 2008ء کو قومی اسمبلی میں پیش کیا تھا،[67] جس کو قومی اسمبلی نے 4 اگست

2009ء کو منظور کیا۔ یہ بل قومی اسمبلی سیکریٹریٹ سے سینیٹ بھیجے جانے کے 90 دن کے اندر سینیٹ میں منظور نہ کیا جاسکا۔ اور دستور میں 18 ویں ترمیم سے پہلے رائج دستور سازی کے طریق کار کے مطابق دونوں ایوانوں کے ارکان پر مشتمل مصالحتی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کی سفارشات پیش کیے جانے سے قبل ہی 18 ویں ترمیم منظور کر لی گئی اور یہ کمیٹی ہی تحلیل قرار پائی۔[68]

عنوان: گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) کا بل 2009ء
پیش کار: قومی اسمبلی میں محترمہ یاسمین رحمٰن، مشیر وزیر اعظم، پاکستان پیپلز پارٹی
سینٹ میں محترمہ نیلوفر بختیار، پاکستان مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 12 اگست 2008ء (قومی اسمبلی)
کیفیت: یہ بل قومی اسمبلی سے 4 اگست 2009ء کو منظور ہوا، تاہم مقررہ مدت میں سینیٹ میں منظور نہ ہوسکا اور بعد ازاں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں بھی پیش نہ ہوسکا۔ چنانچہ زائد المیعاد ہوگیا۔

بعد میں یہی بل پاکستان مسلم لیگ (ق) کی سینیٹر نیلوفر بختیار نے سینیٹ میں پیش کیا اور سینیٹ نے 20 فروری 2012ء کو اسے منظور کرلیا۔ طریقِ کار کے مطابق اسے پھر قومی اسمبلی سے پاس ہونا تھا، لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ اس تجویز کو اولاً 2008ء میں قومی اسمبلی ہی میں پیش اور بعد ازں منظور کیا گیا تھا اور باوجود اس کے کہ سینٹ سے منظوری سے چند ہی دن بعد یعنی مارچ 2012ء میں قومی اسمبلی کا 40 واں اجلاس بھی منعقد ہوا، اس بل کو ایوان کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے 12 ویں مشترکہ اجلاس میں اس بل کو اس پہلی کاوش کے تسلسل کے طور پر ایجنڈے کا حصہ بنایا گیا، جو 2008ء میں شروع ہوکر 2010ء میں 18 ویں ترمیم کے بعد رُک گئی تھی۔[69] یہ بل 5 اپریل 2012ء کو مشترکہ اجلاس میں زیرِغور آیا، جس پر پاکستان مسلم لیگ (ن) اور جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ارکان نے تحفظات کا اظہار کیا اور اس کا بغور جائزہ لینے کی استدعا کی۔ چونکہ یہ بل دو ایوانوں کی متعلقہ کمیٹیوں سے پاس ہوچکا تھا، اس لیے ایک رسمی لیکن اہم اجلاس دوسرے دن 6 اپریل کو بلایا گیا۔[70] پیشتر اس کے کہ اس بل پر تمام جماعتوں کا اتفاق رائے حاصل ہوتا، پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس اپنا ''ایجنڈا مکمل ہونے پر'' ختم کر دیا گیا،[71] لیکن گھریلو تشدّد کے اس بل پر

کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

تیرہویں قومی اسمبلی نے اپنے آخری دنوں میں 8 مارچ 2013ء کو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک قرارداد کے ذریعے آئندہ منتخب ہونے والی قومی اسمبلی سے درخواست کی کہ وہ اس بل پر غور کرے اور اسے منظور کرے۔[72]

اس مسوّدۂ قانون میں گھریلو تشدّد کے واقعات کی روک تھام اور متأثرہ فرد کے تحفظ کا ہمہ جہتی طریقہ کار تجویز کیا گیا تھا۔ یہ طریقہ کار حفاظتی کمیٹیوں اور حفاظتی افسران کے ذریعے گھریلو تشدّد کی روک تھام اور متأثرہ افراد کو بچانے پر مشتمل تھا۔ اس میں ان افعال کی تعریف بھی کی گئی تھی جن کا ارتکاب گھریلو تشدّد کے زمرے میں آتا ہے۔

بل کے مطابق ''گھریلو تشدّد میں بالارادہ کیے گئے وہ سارے اقدامات شامل ہیں، لیکن ان تک محدود نہیں ہیں، جو ایسی خواتین، بچوں یا دیگر کمزور افراد کے خلاف صنفی بنیاد پر یا دیگر جسمانی و نفسیاتی بدسلوکی پر مبنی ہوں، جو ملزم کے رشتہ دار ہوں یا رہے ہوں۔''[73] مزید وضاحت کے مطابق اس تعریف میں 'حملہ کرنا، جان سے مارنے کی دھمکی، مجرمانہ طاقت، مجرمانہ ترغیب، زخمی کرنا، شرارت اور حبسِ بے جا کے وہ جرائم بھی شامل ہیں، جو تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے کے تحت قابلِ سزا ہیں۔ ان کے علاوہ جو افعال گھریلو تشدّد میں شامل ہیں، ان میں معاشی، جسمانی اور جنسی بدسلوکی، بری نیت سے تعاقب، کسی مرد یا عورت کی مرضی کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونا، زبانی اور جذباتی بدسلوکی اور متأثرہ شخص کے ساتھ ظالمانہ اور غلط سلوک قابلِ ذکر ہیں۔

مجوّزہ طریق کار کے مطابق گھریلو تشدّد سے متأثر فرد مجسٹریٹ کی عدالت میں استغاثہ دائر کرسکتا ہے۔ ایسے میں عدالت درخواست کی وصولی کے تین دن کے اندر سماعت کی تاریخ مقرر کرے گی اور 30 دن کے اندر مقدمے کو نمٹا دے گی۔ مطمئن ہونے پر، کہ گھریلو تشدّد ہوا ہے، عدالت متأثر فرد کے حق میں تحفّظ کا حکم جاری کرسکتی ہے اور ملزم کو گھریلو تشدّد کے ارتکاب، ایسے تشدّد کی مدد اور حوصلہ افزائی کرنے، متأثرہ فرد کی تعلیم یا ملازمت کی جگہ داخل ہونے سے باز رہنے کا حکم جاری کرسکتی ہے۔ عدالت 'حکم برائے

سکونت' بھی جاری کرسکتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملزم متأثرہ فرد کو گھر سے بے دخل یا تنگ نہ کرے گا یا اس کی گھر رہائش گاہ میں داخل نہ ہوسکے گا۔ اس ضمن میں عدالت ملزم کو یہ حکم بھی دے سکتی ہے کہ وہ متأثرہ فرد کے لیے متبادل رہائش کا انتظام کرے۔ متأثرہ فرد کے تحفظ کو یقینی بنانے کی غرض سے دیگر کئی اقدامات اور طریقے بھی بل میں ذکر کیے گئے تھے۔ عدالت مقدمے کی سماعت کے دوران کسی بھی مرحلے پر مدعا علیہ کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ متأثرہ فرد کو یا اس کے بچوں کو عائلی قوانین کے تحت آمدنی کے نقصان، طبی اخراجات، جائیداد کے ضائع ہونے کے عوض مالی اعانت فراہم کرے۔

بل کے مطابق اگر متأثرہ فرد کم سِن ہو تو عدالت اُس بچے یا بچی کو سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی افراد کے ایکٹ مجریہ 1890ء کے مطابق مقرر کردہ کسی شخص کی تحویل میں اور اگر ایسا فرد بالغ ہے تو عدالت اُسے کسی حکومتی ادارے یا رجسٹرڈ رضا کار تنظیم جیسی سہولت فراہم کرنے والے کسی ادارے کی عبوری تحویل میں دینے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔

تحفظ کے حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں ملزم کو کم از کم 6 ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال اور ایک لاکھ روپے جرمانہ کی سزا دی جائے گی، اور اس طرح وصول ہونے والی رقم متأثرہ فرد کو دی جائے گی۔ اس کے بعد خلاف ورزی پر سزا دُگنی ہو جائے گی۔ بل میں صوبائی حکومتوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ہر تحصیل میں اس ایکٹ کے مقاصد کے لیے حفاظتی کمیٹیاں قائم کریں۔ یہ حفاظتی کمیٹیاں سب ڈویژنل پولیس افسر (مرد یا عورت)، ایک خاتون ایس ایچ او اور دو خواتین کونسلروں پر مشتمل ہوں گی۔ ان حفاظتی کمیٹیوں کو استعمال کے لیے اس قدر اختیارات دیے جائیں گے جن میں متأثرہ فرد کو اس کے حقوق سے آگاہ کرنا، اس کے طبی علاج میں مدد کرنا، محفوظ جگہ منتقلی میں تعاون کرنا، قانون کے تحت درخواست یا رپورٹ کی تیاری میں مدد کرنا اور گھریلو تشدد کے واقعات کا سرکاری ریکارڈ رکھنا شامل ہیں۔

صوبائی حکومت کو ہر تحصیل میں ایک محافظ افسر مقرر کرنا ہوگا، جو حفاظتی کمیٹی کو گھریلو تشدّد کے واقعات سے آگاہ کرے گا، متأثرہ فرد کی خواہش پر اس کی طرف سے عدالت میں درخواست دائر کرے گا، متأثرہ فرد کے لیے قانونی امداد کو یقینی بنائے گا، متأثرہ فرد کا طبی معائنہ کرائے گا اور بل میں جن دوسرے

فرائض کا ذکر ہے، ان کو سرانجام دے گا۔

ان حکومتی اور نجی اداروں کو جو خدمات فراہم کرتے ہیں، وہی تحفظ فراہم کیا جائے گا، جو سرکاری ملازمین کو استحقاق اور استثناء (قانون) کے تحت حاصل ہے۔ اور ان کا اختیار ہوگا کہ وہ گھریلو تشدّد کے واقعات کا ریکارڈ رکھیں، متاثرہ فرد کا طبی معائنہ کرائیں اور متاثرہ فرد کے تحفظ اور اس کی امداد کو یقینی بنائیں۔

بل میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ گھریلو تشدّد کے ارتکاب کی غلط رپورٹ دینے پر سزا دی جائے گی، جو 6 ماہ تک قید یا پچاس ہزار روپے تک جرمانہ ہوگی یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

موجودہ قانون اور عمل

اس وقت گھریلو تشدّد پر کوئی مخصوص قانون موجود نہیں۔ ایسے کسی واقعہ کی صورت میں معاملے کو تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء کے مطابق نمٹایا جاتا ہے۔ بل نے ازخود متعدد جرائم کو تعزیراتِ پاکستان کے حوالے سے گھریلو تشدّد کی تعریف میں شامل کیا ہے، جن میں زخمی کرنا، حملہ کرنا، مجرمانہ طاقت کا استعمال وغیرہ شامل ہیں۔

عائلی عدالتوں (ترمیمی) آرڈیننس مجریہ 2002ء کے ذریعہ متعدد جرائم کو پہلے ہی عائلی عدالتوں کے دائرہ کار میں لایا جاچکا ہے، جہاں زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کے جرم کا شکار ہو، ایسے جرائم میں سر اور چہرے کا ایسا ہلکا زخم جس میں متاثرہ شخص کی ہڈی نظر نہ آرہی ہو، ایسا زخم لگانا جس سے جلد پھٹ جائے اور خون بہے، غیر قانونی رکاوٹ، غیر قانونی حراست، ایک عورت کی عصمت کی توہین کی غرض سے آوازیں کسنا اور اشارے کرنا شامل ہیں۔

مشاہدات

بل کا مقصد گھریلو تشدّد کے خلاف ایک پورے نئے ڈھانچے کا قیام تھا۔ اس میں حفاظتی کمیٹیوں کی تشکیل اور محافظ افسروں کی تقرری اہم اور بنیادی اہمیت رکھتی تھی، جب کہ مجسٹریٹ درجہ اوّل کے لیے یہ اختیار تجویز کیا گیا تھا کہ وہ گھریلو تشدّد کے واقعات کا نوٹس لے اور متاثرہ شخص یا اس کے مقرر کردہ فرد کی

درخواست پر فیصلے کرے۔ مجوزہ صورت میں مجسٹریٹ کی عدالت کو یہ اختیار بھی حاصل ہونا تھا کہ سرپرستوں اور زیرِ سرپرستی افراد کے ایکٹ مجریہ 1890ء کے تحت ضلعی عدالتوں (District Courts) کے مخصوص اختیارات استعمال کر سکے۔ اس بل کی ایک نمایاں خصوصیت غیر حکومتی تنظیموں (این جی اوز) کو بااختیار بنانا اور ان کو ایسے استحقاق اور استثنیٰ تفویض کرنا تھا، جو ضابطہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 21 کے تحت صرف سرکاری افسروں کو حاصل ہوتے ہیں۔

تبصرہ

گھریلو تشدّد سماجی زندگی کی ایسی تلخ حقیقت ہے جو تمام معاشروں اور ثقافتوں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یہ صرف ان معاشروں تک محدود نہیں ہے جو خواندگی، روزگار کی سہولتوں، قانونی آسانیوں اور خواتین کے اختیار کے حوالے سے پسماندہ ہیں، بلکہ دنیا کے بہت ہی ترقی یافتہ ممالک اور علاقے بھی، جہاں قانونی نظام بڑا مستحکم ہے، اس لعنت کی روک تھام میں ناکام ہو چکے ہیں۔[74] بالعکس، ان ممالک میں بعض رپورٹوں کے مطابق حالیہ برسوں کے دوران گھریلو تشدّد کے واقعات میں اضافہ ظاہر کیا گیا ہے۔[75]

گھریلو تشدّد کے واقعات کی روک تھام اور متاثرین کے تحفظ کا بل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ایسے واقعات چار دیواری میں پیش آنے کی وجہ سے سامنے نہیں آپاتے اس لیے بل اس معاملے کو نجی دائرے سے نکال کر عام دائرے میں لانے کی ایک سعی تھی تاکہ ایسے واقعات ختم یا کم از کم ہو سکیں۔

اس بل کو ایک بار پڑھنے سے قاری کو پہلا تأثر یہ ملتا ہے کہ اگرچہ بل گھریلو تشدد ہو جانے کے بعد کی صورتِ حال پر خاصی توجہ دیتا ہے لیکن گھریلو تشدّد کی روک تھام کے اقدامات تجویز نہیں کرتا۔ عدالت، تحفظ کمیٹیاں، محافظ افسران اور خدمات فراہم کرنے والے افراد کا کردار اس وقت ہی شروع ہوتا ہے جب گھریلو تشدد کا کوئی واقعہ واقع پیش آچکا ہو۔ جو سوچ اس مسودہ قانون میں کارفرما ہے اس میں گھریلو تشدّد کو بھی دیگر جرائم کی طرح ایک جرم ہی تصوّر کیا گیا، نہ کہ ایک ایسی معاشرتی بُرائی، جو متعدد جرائم کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے کسی اصلاحی طریقِ کار اور ڈھانچے کے بغیر سزاؤں کے نفاذ کے ذریعہ اس کا حل تلاش کرنے

کی کوشش کی گئی۔

بل میں گھریلو تشدّد کی جو تعریف کی گئی ہے ان کو مختلف اقسام میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

جسمانی تشدّد

(الف) تشدّد کے بعض واقعات جسمانی طور پر واضح نشان چھوڑ سکتے ہیں۔ اگر زخم لگ جائے، حملہ کیا جائے، مجرمانہ دہشت یا مجرمانہ طاقت کا استعمال کیا گیا ہو یا ملزم اس اقدام کے ذریعہ کسی خاتون کی عصمت اور پاک دامنی کی توہین کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، تو ان تمام ایسے واقعات میں ثبوت اور گواہ موجود ہوں گے۔ بعض اوقات میڈیکل رپورٹ بھی مدد دے سکتی ہے، اور دوسری واقعاتی شہادت بھی کسی نتیجے پر پہنچا سکتی ہے۔ ایسے واقعات سے تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء اور ضابطہ فوجداری مجریہ 1889ء کے تحت معمول کے طریقہ کار کے مطابق نمٹا جائے گا۔

تاہم یہاں اس امر کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ دوسرے جرائم سے متاثرہ کسی فرد کی طرح، گھریلو تشدّد کے شکار افراد کو بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی سُستی، عدم تعاون بلکہ توہین آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اکثر متاثرہ افراد کسی بدسلوکی کی صورت میں مدد حاصل کرنے کے لیے پولیس سے رابطہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے، اور گریز یا صلح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس بل میں موجودہ طریق کار کو اپنانے کی بجائے مناسب سمجھا گیا کہ عدالت میں استغاثہ دائر کیا جائے، تحفظ کی فراہمی کے لیے پولیس کی بجائے ایک نیا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے اور سماجی اداروں کو ویسے ہی استحقاقات اور استثناءات دے دیے جائیں، جن سے پولیس افسران مستفید ہوتے ہیں۔ غور کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک تجویز میں کئی قباحتیں اور مشکلات موجود ہیں۔ اس لیے اصل مسئلے سے پہلوتہی کرنے کی بجائے بہتر رویہ یہ ہے کہ پولیس کے ڈھانچے اور طرزِ عمل کی اصلاح کی جائے۔ اس سے گھریلو تشدّد کی تعریف میں شامل کم از کم چند جرائم کی روک تھام کسی نئے ادارے کے قیام اور پیچیدہ طریق کار اختیار کیے بغیر کی جا سکے گا۔

(ب) جان بوجھ کر یا غفلت سے متاثرہ شخص کو چھوڑ دینا بھی گھریلو تشدّد میں شمار کیا گیا ہے۔

تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء کی دفعہ 328 میں کہا گیا ہے کہ اگر 12 سال سے کم عمر کے بچے کا باپ یا ماں یا اس بچے کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی دوسرا شخص اُسے چھوڑ دے تو وہ سات سال تک کی سزائے قید اور جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہوگا۔ اگر جرم دفعہ 328 کے ذیل میں نہ آتا ہو اور متاثرہ شخص کے کسی عضو یا جسم کا کوئی حصہ یا اس کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے تو ترک کرنے کی غفلت کے ملزم کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 336 کے تحت سزا دی جائے گی۔ اگر گھر میں کسی کو ترک کر دینے کی وجہ سے نقصان پہنچا ہو تو دیکھنا ہوگا کہ آیا ملزم قانونی طور پر متاثرہ شخص کا خیال رکھنے کا پابند تھا یا نہیں۔ اگر متاثرہ فرد ملزم کی بیوی یا بچہ ہے تو پھر دیکھ بھال کرنے کا حق قانون کے تحت حاصل ہوتا ہے، لیکن کسی ایسے شخص کو ترک کرنے کا ذمہ دار بالعموم قرار نہیں دیا جا سکتا جو اس شخص کی کفالت کا قانونی طور پر پابند نہیں تھا۔[76]

(ج) گھریلو تشدد کی تعریف میں 'جسمانی بدسلوکی' کا ذکر چوٹ، حملے، مجرمانہ طاقت، مجرمانہ دباؤ وغیرہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس اصطلاح کی اس طرح تعریف کی گئی ہے: ''ایسا اقدام یا رویّہ جس سے متاثرہ شخص کو جسمانی تکلیف پہنچے، کسی عضو، جسم کے کسی حصے یا زندگی کو نقصان یا خطرہ ہو یا اس کی صحت یا نشوونما میں گڑبڑ پیدا ہو اور اس میں حملہ، مجرمانہ طاقت یا مجرمانہ دباؤ بھی شامل ہے۔'' مذکورہ بالا تمام اقدامات جن کے کرنے یا نہ کیے جانے کا ذکر اس تعریف میں شامل ہے، پہلے ہی تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ کے تحت قابلِ سزا ہیں اور گھریلو تشدد کے حوالے سے موجود قانون کے تحت عائلی عدالت کے دائرۂ اختیار میں بھی آتے ہیں۔ موجودہ قانون (تعزیرات پاکستان) کے سولہویں باب میں انسانی جسم کے خلاف تمام ممکنہ جرائم کو متعین کیا گیا ہے۔ ان میں دفعہ 337-ایل میں ایسی چوٹوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جس سے صرف تکلیف ہوتی ہو اور اس کے دوسرے جسمانی اثرات ظاہر نہ ہوں۔ بل میں استعمال کردہ اصطلاح ''جسمانی بدسلوکی'' کا مفہوم اس سے مختلف نہیں۔

معاشی بدسلوکی

گھریلو تشدّد کے اقدامات میں بطور جرم معاشی بدسلوکی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تعریف

متاثرہ شخص کو ان اقتصادی اور مالیاتی وسائل سے محروم کرنا جس کے استعمال یا استفادے کا وہ گھریلو رشتہ کی وجہ سے استحقاق رکھتا تھا، لیکن یہ متاثرہ فرد، اس کے بچوں، کسی مشترکہ یا علیحدہ جائیداد، جس کا مالک متاثرہ فرد ہو، گھر کے کرائے سے متعلق ادائیگی اور کفالت تک محدود نہیں۔

اس تعریف کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ ''اصل میں وسائل کیا ہیں، جن کے استعمال یا استفادے کا متاثرہ فرد کو خانگی تعلق کی بنیاد پر حق حاصل ہے؟'' بادی النظر میں یہ تعریف اس سوال کا جواب تین ایسے حقوق کا ذکر کر کے دیتی ہے، لیکن استحقاق کو ان تین حقوق تک محدود نہیں رکھتی۔ ان میں (۱) متاثرہ فرد اور اس (خاتون) کے بچوں کی گھریلو ضروریات، (۲) متاثرہ فرد کے پاس موجود ملکیتی مشترکہ یا الگ جائیداد کے استعمال یا استفادے کا حق اور (۳) کفالت کا حق شامل ہیں۔

قانون کے معنی میں حق ایسا اختیار، استحقاق یا ملکیت ہے، جس کا کوئی شخص قانونی دعویٰ کر سکتا ہو یا جو اخلاقی طور پر واجب ہو۔[77] حق دار اپنے حق کو سرکاری بندوبست کے ذریعے نافذ کرنے کا مطالبہ اس صورت میں کر سکتا ہے، جب وہ حق ریاست کے قانون میں تسلیم شدہ ہو۔ وہ حق جو نوعیت میں صرف اخلاقی ہو، اس کا نفاذ قانون کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے دوست کو کسی ریستوران میں کھانے پر مدعو کرے مگر وہ نہ آئے تو دوست کے خلاف مقدمہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مدعو شخص کا دعوت قبول کرنے کا حق اپنی نوعیت میں اخلاقی تھا۔

جہاں تک گھریلو رشتے سے پیدا ہونے والے حقوق کا تعلق ہے، وہ بہت سے ہیں اور گھر میں ہر فرد کے ایک دوسرے پر ہیں، لیکن یہ عام طور پر اخلاقی نوعیت کے حقوق ہوتے ہیں۔ قانون کے موجودہ نظام میں جو قانونی حقوق ہیں، وہ صرف بیوی اور بچوں کے حقوق ہیں جو بالترتیب خاوند اور باپ پر عائد ہوتے ہیں۔ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کی دفعہ 9 کے تحت ایک شخص اپنی بیوی کی کفالت کرنے اور زندگی کی تمام ضروریات پوری کرنے کا پابند ہے۔ اسی طرح باپ اپنے بیٹے کی بلوغت اور بیٹی کی شادی تک اولاد کی کفالت کا پابند ہے۔ ان حقوق کی تنفیذ عائلی عدالتوں کے ایکٹ مجریہ 1964ء کی دفعہ 5 کے تحت کی جاتی ہے۔

قانون گھریلو رشتے کی بنیاد پر کسی دیگر مالیاتی حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر قانون کسی بیٹے سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے والدین کی کفالت کرے، چاہے وہ ضعیف یا غریب ہوں۔ قانون بیوی سے بھی تقاضا نہیں کرتا کہ وہ اپنے شوہر پر خرچ کرے، اگرچہ وہ بے روزگار یا معذور ہی ہو۔ ایک یتیم اپنے مالدار چچا سے قرابت کی بنیاد پر کسی حق کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ اسلام میں صلہ رحمی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور گھریلو رشتوں کی وجہ سے ہر شخص کا دوسرے پر حق ہوتا ہے۔ لیکن ملکی قانونی ڈھانچے میں یہ حقوق محض اخلاقی قرار پاتے ہیں۔ ان حقوق کا قانون کے ذریعے نفاذ کروانے سے پہلے انہیں قانونی بنیاد فراہم کرنا ہوگی۔ اس لیے موجودہ صورت میں ''معاشی بدسلوکی'' کی اصطلاح بے معنی اور غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔

تاہم اگر کفالت کے اسلامی تصوّر 'کفالہ'78 کو نافذ کرنے کے لیے قانون سازی کی جاتی ہے، جس کی سفارش اسلامی نظریاتی کونسل 79 بھی کرچکی ہے، تو اس نوعیت کی بدسلوکی کے خلاف بھی قانون سازی مفید ہوسکتی ہے۔

جنسی بدسلوکی

بل کے مطابق جنسی بدسلوکی سے مراد جنسی نوعیت کا ہر ایسا فعل ہے جو بدسلوکی پر مبنی ہو یا توہین آمیز ہو یا کسی بھی اور طرح متاثرہ شخص کے وقار کو مجروح کرتا ہو۔ عمومی مفہوم میں جنسی نوعیت کے افعال مجامعت کی حد تک بڑھے ہوئے یا محض اس جانب اشارے اور کوشش تک محدود ہوسکتے ہیں۔ تعزیراتِ پاکستان کی دفعات 375، 376 اور 377 اور اس کا بیسواں باب اور جرمِ زنا (نفاذِ حدود) آرڈی نینس مجریہ 1979ء ایسی مختلف صورتوں سے متعلق ہیں جب جنسی نوعیت کا کوئی واقعہ پیش آچکا ہو۔ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 509 ان حالات سے متعلق ہے، جب کوئی شخص الفاظ کی ادائیگی، اشاروں یا آوازوں کے ذریعے یا کوئی چیز دکھا کر کسی خاتون کی عصمت کی توہین کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ اس طرح جنسی نوعیت کے اقدامات، خواہ وہ گھر کے اندر یا باہر ہوں، تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے میں موجود دفعات کے تحت مؤثر طور پر قابلِ مواخذہ ہیں۔

چونکہ بل میں گھریلو سطح کے معاملات کو دائرۂ قانون میں لانے کی تجویز دی گئی تھی، اس لیے اس تناظر میں یہ یاد دلانا اہم ہے کہ زوجین کے درمیان ازدواجی تعلقات خاندان کی بنیاد ہیں۔ ایک غیر مشروط تعریف، جیسا کہ بل میں دی گئی تھی، اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ اس کی بنیاد پر ''ازدواجی زنا'' (Marital rape) کے تصوّر کو متعارف کرانے کی کوشش کی جائے، جو پاکستانی معاشرے میں کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ معاشرے میں عصمت و آبرو کا فروغ اسلام کے اہم معاشرتی مقاصد میں سے ہے اور اسلام اِن مقاصد کا حصول معاشرے کی خاندانی اقدار کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ افراد کی جنسی خواہشات جائز رشتوں کے ذریعے اطمینان بخش طور پر پوری ہوں تاکہ ان فطری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے غیر ضروری مواقع کی تلاش نہ کی جائے۔

زبانی یا جذباتی بدسلوکی

مسودۂ قانون میں زبانی یا جذباتی بدسلوکی کی تعریف یوں کی گئی تھی کہ اس سے مراد ملزم کا متاثرہ فرد سے مسلسل توہین آمیز طرزِ عمل، جس میں (۱) توہین کرنا یا استہزا (۲) جسمانی تکلیف پہنچانے کی دھمکی اور (۳) جھوٹا مقدمہ قائم کرنے کی دھمکی شامل ہیں، لیکن یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ یہ تعریف انہی تین قسم کے افعال تک محدود نہیں ہے۔

جسمانی تکلیف پہنچانے کا خطرہ مجرمانہ دھمکی کی تعریف میں آتا ہے، جو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 503 میں کی گئی ہے۔ نیز یہ جرم پہلے ہی ان جرائم میں شامل ہے جو گھریلو تشدّد کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے اس جرم کو زبانی اور جذباتی بدسلوکی کے ذیل میں بھی ذکر کرنا محض تکرار اور الجھن کا ہی باعث ہوگا۔

بدنیتی سے مقدمہ بازی بھی ایک جرم ہے اور ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 25 کے تحت اس حوالے سے قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ جھوٹ یا تنگ کرنے کے مقصد سے دائر کیے گئے دیوانی مقدمات ضابطہ دیوانی مجریہ 1908ء کی دفعہ 35-الف کے تحت آتے ہیں۔ جب کہ بدنیتی کے مقدمے میں ملوث کرنے کی دھمکی تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 503 کے ذیل میں آتی ہے۔

بہرحال یہ یاد رکھنا ہوگا کہ انسانوں کے درمیان طویل عرصہ تک قائم رہنے والے ہر رشتے میں کبھی کبھار یا کسی خاص مرحلہ پر اختلاف یا نااتفاقی کا پیدا ہو جانا معمول کا حصہ ہے۔ ایسے اختلافات بعض اوقات مخالفتوں اور لڑائی جھگڑوں کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی فطری ہے کہ کسی نزاع یا جھگڑے کے دوران فریقین ایسی باتیں کرتے ہیں جو دوسرے فریق کے لیے خوش کن نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود عام مشاہدہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فریقین ایک بار پھر خوشگوار تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ یوں یہ لڑائی جھگڑے اور حجت بازی قدرتی انسانی رویے کا حصہ ہیں، اور انہیں جرم قرار دے دینا قرینِ عقل نہیں ہوگا۔ ایسی بیشتر صورتوں میں کوئی فرد جو کچھ کہتا ہے، ممکن ہے وہ درحقیقت ایسا نہ سوچتا ہو۔ ایسے واقعات کی بنیاد پر خاندان کے امور میں ریاست کی مداخلت بہت غیر دانش مندانہ بات ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ زندگی کے بارے میں مختلف افراد کے رویئے اور تصورات مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو کسی لفظ سے بُری طرح تکلیف محسوس ہو سکتی ہے تو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا شخص یا کسی دوسری کیفیت میں وہی فرد اس لفظ سے لطف اندوز ہوتا ہو جب کہ کوئی تیسرا فرد اس پر غور کرنے تک کی زحمت گوارا نہ کرے۔ اس لیے عدالت کے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو سکتا ہے کہ کون سے الفاظ کا مطلب تشدّد تھا اور کون سے الفاظ عمومی انداز میں کہے گئے تھے اور ان کا مقصد دوسرے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا۔

بُری نیت سے تعاقب کرنا

بل میں موجود تعریف کے مطابق تعاقب کرنے کا مطلب متأثرہ مرد یا عورت کی مرضی کے خلاف اس کا پیچھا کرنا، تنگ کرنا اور اشارے کرنا یا اس عمارت یا جگہ کے باہر یا قریب اُسے دیکھنا یا کوچہ گردی کرنا ہے، جہاں متأثرہ فرد رہتا یا کام کرتا یا کاروبار کرتا یا عام طور پر آتا جاتا ہو۔

یہ بڑی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ خواتین، بالخصوص نوجوان خواتین، کو عام نقل و حرکت کے دوران پریشان کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعاقب کی تعریف میں بیان کیے گئے رویے بلاشبہ توہین اور ذلّت آمیز ہیں اور ان کی روک تھام معاشرتی اور قانونی دونوں طریقوں سے ہونی چاہیے، لیکن ان کا تعلق بنیادی طور پر گھریلو تشدّد سے نہیں ہے۔ تعاقب کے ذیل میں ذکر کردہ افعال بالعموم اجنبی کرتے ہیں اور

کسی گھریلو رشتہ دار کی طرف سے ایسے کسی واقعہ کا سامنے آنا شاذ و نادر ہی ہوگا۔ اگر تعاقب کے خلاف قانون سازی گھریلو تشدّد کے حوالے سے کی گئی تو قانون کا دائرہ کار بڑا محدود ہوگا، اور اس سماجی بُرائی کی مؤثر طور پر روک تھام نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے تعاقب کے ذیل میں آنے والے افعال پر پابندی ہونی چاہیے اور ان کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 509 میں ترمیم کے ذریعے قابلِ سزا قرار دینا چاہیے۔

معاشرے کے قابلِ احترام حصے کے طور پر خواتین کے مقام اور مرتبے کو بلند کرنا ہوگا۔ تعاقب، ذو معنی الفاظ اور اشاروں کے استعمال، گھورنے اور کوچہ گردی کرنے جیسے افعال کی مکمل روک تھام قانون کی طاقت سے نہیں کی جا سکتی۔ انسانی رویئے اخلاقیات اور کسی فرد کے تصورِ حیات کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ ان اندرونی عوامل کے علاوہ بعض بیرونی عناصر بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کے طرزِ عمل اور کردار کو متعین کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا شخص جو اشتہا انگیز ماحول میں رہ رہا ہو، اگر اس سے ایسے بد افعال صادر ہوتے ہیں تو انفرادی طور پر چاہے قصور اسی کا ہو لیکن پورا دوش صرف اسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ ایک بہتر معاشرے کے قیام کے لیے شرم و حیا پر مبنی ثقافت کو فروغ دینا ہوگا، جہاں عورتیں اور مرد دونوں ان حدود کی پابندی کریں جو ایک صاف ستھری معاشرت کی بنیاد بنیں اور جو ان کے مذہب نے قائم کی ہیں اور معاشرے میں عرصے سے رچی بسی ہیں۔

کوئی دیگر ظالمانہ اور استحصالی رویہ

اس بل کی ایک خاصیت جو بہت واضح تھی، وہ اس کی لامحدودیت تھی۔ مختلف جرائم کے لیے وضع کردہ تعریفوں میں خاصی تفصیل دینے کے بعد بھی یہ وضاحت کی گئی تھی کہ اس تعریف کا دائرۂ کار یہیں تک محدود نہیں ہے، اس طرح مجوزہ قانون کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے لیے ہر ممکن طرزِ بیان اختیار کیا گیا تھا۔ شاید کچھ لوگ اسے بل کی خوبی سمجھیں لیکن حقیقت میں یہ بہت بڑی خامی ہے، جس سے یہ مسودۂ قانون دوچار تھا۔ گھریلو تشدد کی تعریف میں پندرہ قسم کے افعال کو شامل کرنے کے باوجود بھی اس بل کے مجوزین دیگر ظالمانہ اور استحصالی رویوں کو شامل کرنا نہیں بھولے، جس سے مجوزہ بل کو غیر محدود دائرۂ کار دیا جا سکے۔

اوپر کی گئی بحث کی روشنی میں دلچسپ امر تو یہ ہے کہ اس بل میں گھریلو تشدد کے تصور کی وضاحت کے لیے بیان کی گئی ہر وضاحت نے اس مسودہ کے ابہام میں اضافہ ہی کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کبھی واضح طور پر بتا نہیں سکے گا کہ بل کی تعریف کے مطابق گھریلو تشدّد سے کیا مراد ہے۔ گھریلو تشدّد کی اس تعریف کی وجہ سے معمولی نجی معاملات بھی عام دائرے میں لائے جا سکیں گے۔

گھریلو تشدّد کے تنازعات کو حل کرنے کا طریقہ

ہونا یہ چاہیے تھا کہ بل میں گھریلو تشدد کا باعث بننے والے مسائل کو حل کرنے اور ان تنازعات کو طے کرنے کا طریقِ کار درج کیا جاتا جو تشدد کا باعث بنے ہوں اور پوری کوشش یہ کی جائے کہ خانگی زندگی کو معمول پر لایا جا سکے۔ اس کے برعکس، یہ بل اس مفروضے کا حامل نظر آتا ہے کہ ایک بار جب گھریلو تشدّد کا واقعہ ہو گیا، خواہ وہ زبانی ہو، جذباتی یا جسمانی، تو معاملہ آخری حد تک پہنچ گیا۔ کسی بھی عام جھگڑے یا لڑائی کی طرح اس صورت میں بھی متأثرہ فرد کے لیے واحد اور مناسب ترین صورت یہی تجویز کی گئی ہے کہ وہ ملزم کے خلاف مجسٹریٹ کے پاس استغاثہ دائر کرے اور اپنے باپ، ماں، بھائی یا کسی قریبی عزیز کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دے۔

بل میں یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ خدمات فراہم کرنے والے غیر سرکاری ادارے یا افراد متأثرہ فرد کی فلاح و بہبود کے لیے اس کے خاندان کے دوسرے افراد کی نسبت زیادہ مخلص اور ہمدرد ہوں گے۔ اس لیے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ایسا مرد یا عورت، جو خود کو گھریلو تشدّد کا متأثرہ سمجھے، وہ جب مجسٹریٹ کے پاس جائے تو مجسٹریٹ نہ صرف ملزم کو گھریلو تشدّد کے ارتکاب سے بلکہ متأثرہ فرد تک رسائی سے بھی روک دے گا۔ اس طرح رشتوں کے درمیان عملاً ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں خانگی انداز میں معاملے کے حل کا امکان معدوم ہو کر رہ جائے گا۔ تجویز کردہ صورت یہ تھی کہ عدالت خدمات فراہم کرنے والے ادارے کو کہہ سکتی ہے کہ وہ متأثرہ مرد یا خاتون کو اس کے قانونی حقوق سے آگاہ کرے اور اس کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ بل میں اسی طرح کے فرائض حفاظتی کمیٹیوں اور محافظ افسروں کے لیے بھی تجویز کیے گئے ہیں۔ ان عاملین، یعنی عدالت، حفاظتی کمیٹیوں، محافظ افسر اور خدمات فراہم کرنے والوں میں سے کسی کو یہ

ذمہ داری نہیں دی گئی کہ وہ فریقین کے درمیان صلح اور سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں اور اختلاف کی وجہ ختم کریں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس بل کی قومی اسمبلی سے منظوری پر تحفظات کا اظہار کیا تھا، اور یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اس شکل میں یہ بل نہ ختم ہونے والے خاندانی جھگڑوں کا باعث بنے گا، اور نتیجتاً طلاق کی شرح میں اضافہ ہوگا۔80

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ گھریلو تشدّد کے تمام واقعات کو لازماً خاندان کے دائرے کے اندر ہی حل کیا جائے اور گھر کی چار دیواری کے اندر تشدّد کے کسی بھی واقعہ کا محض اس بناء پر مقدمہ درج نہ کرایا جائے کہ وہ نوعیت کے اعتبار سے گھریلو ہیں۔ اگر کوئی واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا سنگین ہو کہ تعزیراتِ پاکستان کے تحت جرم کی تعریف پر پورا اترتا ہو تو اسے وقوعہ کے جگہ کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یا اس بنا پر کہ متاثرہ فرد اور ملزم کے درمیان کوئی رشتہ ہے۔ اس کے باوجود عمومی طور پر خاندانی تنازعہ اور جرم میں فرق کرنا ہوگا، اور یہ فرق پہلے سے نافذ قانون میں مناسب انداز میں ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان جرائم کو عائلی عدالتوں کے ذریعے طے کرنے کا انداز اپنایا گیا ہے۔

معاملے کو طے کرنے کے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا گیا تھا ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے معاشرے میں مفید ہو، جہاں خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے، اور تاثر بھی یہی ملتا ہے کہ اس بل کا پورا تصور مغربی معاشرے اور نظام پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس پاکستانی معاشرے میں خاندان کو ایک ایسا ادارہ سمجھا جاتا ہے جس میں اگرچہ باہم حقوق و فرائض کی کوئی متعین اور لگی بندھی تعریف نہیں ہے لیکن صدیوں کے تعامل کے نتیجے میں یہ حقوق، فرائض اور استحقاقات ہر ایک کو معلوم ہیں اور ان کے تعین میں عام طور پر عمر اور رشتے کی نوعیت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خاندان میں یہ حفظِ مراتب بعض افراد کو دوسروں کی زندگیوں پر کچھ حقوق عطا کرتا ہے، جو کسی فرد کی آزادی اور حق خود اختیاری کے منافی تو نہیں ہوتا لیکن تجربے، محبت اور شفقت کی بنیاد پر اہمیت بھی چاہتا ہے۔ ایسی رہنمائی حاصل کرنے والا شخص خود اخلاقی طور پر شکر گزار ہوتا ہے، اور اپنے بڑوں کے مقررہ قواعد اور ضابطوں کی پابندی کرتا ہے، اور تابعداری کی وجہ وہ احترام بنتا ہے، جو وہ شخص خاندان میں اپنے بڑوں کے لیے رکھتا ہے۔ یہ ایک معاشرتی ڈھانچہ ہے، جس میں ہمیشہ مکالمے، تنازعات، اختلاف بلکہ لڑائی جھگڑوں تک نوبت پہنچ جانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ تاہم

ایسے اختلافات اور تنازعات کا یہ لازمی مطلب نہیں کہ تنازعے کے فریقین ایک دوسرے کے بدخواہ ہیں۔ عام طور پر اختلافات حجت بازی کی ایک لہر کے بعد مدھم پڑ جاتے ہیں اور زندگی رواں دواں رہتی ہے۔

خانگی تنازعات طے کرنے کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے، جو سنگین خاندانی جھگڑے کی صورت میں کسی بیرونی ترغیب کے بغیر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ طریق کار خاندان کی تباہی کے خلاف ایک محافظ کا کردار ادا کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں خاندانی نظام، خاص طور پر شہری علاقوں میں، ایک تبدیلی سے گزر رہا ہے۔ اس لیے یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاندانی لڑائی جھگڑوں اور تنازعات کو حل کرنے کا متبادل ملکی نظام سماجی اقدار کی روشنی میں وضع کرے۔ قانون سازی کے ذریعے قرآن پاک کی اس ہدایت کو بھی نافذ کرنا چاہیے جو سورۃ النساء آیت نمبر 35 میں بیان کیا گیا ہے، جس کے مطابق یہ ہدایت کی گئی ہے کہ زوجین کے درمیان تنازعہ کی صورت میں دونوں خاندانوں کو ایک ایک نمائندہ منتخب کر کے انہیں زوجین کے دوران مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی سوچ مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1981ء کے تحت مصالحتی کونسل میں اختیار کی گئی ہے، اور وہ ایسے حالات کو طے کرنے میں مفید ثابت ہوئی ہے۔

قبل ازیں 2002ء میں خاندانی عدالتوں کے ایکٹ 1964ء میں ایک ترمیم کے ذریعے گھریلو تشدّد کی روک تھام کے لیے کوشش کی گئی تھی، جس سے متعدد جرائم (اوپر بیان کیے گئے) عائلی عدالتوں کے دائرۂ اختیار میں آ گئے۔ یہ وہ جرائم ہیں جن کے ارتکاب کا امکان گھریلو جھگڑوں کے سلسلے میں ہونے کا امکان ہوسکتا ہے۔ اس قانون کا مقصد گھریلو تشدّد کے متاثرین کو عدالتوں میں قانونی مدد فراہم کرنا اور ان کے مقدمات کے منصفانہ اور سستے طریقے سے فیصلے کرانا ہے۔ اس قانون میں انسانی جسم کے خلاف تمام جرائم کو شامل نہیں کیا گیا اور زیادہ سنگین جرائم کو فوجداری مقدمات کے طور پر عام قوانین پر چھوڑ دیا گیا۔

عائلی عدالتوں کے آرڈیننس 2002ء کی ایک خامی یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار صرف ایسے حالات تک محدود ہے جہاں جرم زوجین میں سے کسی ایک نے دوسرے کے خلاف کیا ہو۔ عائلی عدالتوں کے ایکٹ کی دفعہ 5 میں ترمیم کر کے مزید مؤثر اور اس کے تحفظ کو خاندان کے اندر تمام افراد تک وسیع کیا جاسکتا ہے۔

عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) آرڈیننس مجریہ 2002ء اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ نہ صرف گھریلو تشدد کے واقعات کو بطور جرم تسلیم کیا بلکہ حصول انصاف کی مناسب تر صورت بھی وضع کی۔ ایسے جرائم کو عائلی عدالتوں کے دائرۂ اختیار میں لانے سے اس امکان میں اضافہ ہوگیا ہے کہ عائلی عدالتوں کے لیے موجود طریقِ کار کے مطابق خاندان کے بزرگوں کو شامل کر کے فریقین کے درمیان مصالحت اور سمجھوتہ ہوسکتا ہے اور خاندان مزید ٹوٹ پھوٹ سے بچ سکتا ہے۔

اس بل کی سب سے تعجب انگیز بات یہ تھی کہ یہ بل قانون سازی کے تمام مراحل سے گزرا۔ اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینٹ نے منظور بھی کیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی خامیوں، تکرار، ابہامات کو دور نہ کیا جاسکا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری ادارے اس کے متن اور روح پر ایک دوسرے کے خلاف متضاد نظریات کا اظہار کرتے رہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے مسودے پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا تو قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں نے اس کو سراہتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کے تحفظات کو غیر ضروری قرار دیا۔[81] اس لیے تمام تحفظات کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر وسیع تر بحث کی ضرورت بہت واضح ہے۔

سفارشات

- گھریلو تشدّد کے معاملے کو ملکی اور معاشرتی دائرہ کار میں رہتے ہوئے سمجھنا ہوگا، اور اس کے خاتمے کے لیے مغربی معاشروں میں رائج بنے بنائے حل کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔
- گھر میں ہونے والے جرائم اور معمولی تلخ کلامی اور جھگڑوں کو الگ رکھا جائے۔ سنگین جرائم کا تصفیہ معمول کی عدالتوں کے ذریعہ اور چھوٹے جرائم کا عائلی عدالتوں کے ذریعہ کرلیا جائے۔ انسانی زندگی اور تعلقات میں اتار چڑھاؤ کے قدرتی مظاہر کو جرم تصور نہ کیا جائے، اور بالعموم خانگی زندگی میں ریاستی مداخلت کو محدود رکھا جائے۔
- ایسا نظام وضع کیا جائے کہ کسی گھر میں تنازعہ پیدا ہوجانے کی صورت میں قریبی رشتہ داروں کو متحرک اور حل کے لیے شامل کیا جائے۔ ایسی کوششوں کو مصالحتی کونسلوں کے ذریعہ باقاعدہ بنایا جاسکتا ہے۔ تاہم

گھریلو تشدّد کے ممکنہ متاثرہ افراد کے لیے ایک مؤثر قانونی تحفظ ضرور موجود رہنا چاہیے۔

- پولیس اور عدالت کے ضابطوں کو ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے دوستانہ، ذمہ دارانہ، جوابدہ اور مؤثر بنانا ہوگا۔ لازمی طور پر کوشش کرنی چاہیے کہ ریاستی مشینری پر عوام کے اعتماد کو بحال کیا جائے۔
- نئے ادارے قائم کرنے کے بجائے موجود اداروں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے پر توجہ دی جائے۔
- قبیح تعاقب کرنے کی عادت کی روک تھام کے لیے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 509 میں ترمیم کی جائے۔

خواتین کا احترام

خواتین کی عزت کے تحفظ کا بل 2009ء

اسلام کی تعلیمات کے مطابق خواتین کو باعزت مقام دلانے 82 کا یہ بل تجویز کرتا تھا کہ خواتین کے خلاف تشدّد کے واقعات معاشرتی بیداری کے ذریعہ حل کیے جائیں۔ بل کے مطابق عورتوں اور مردوں کے درمیان تعاون، ہمدردی، اخلاص اور فرمانبرداری کے ماحول کو فروغ دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف یکساں قوت رکھنے والوں کے طور پر لا کھڑا کیا جائے۔ اس بل میں کہا گیا ہے کہ شہریوں کے حقوق چھیننے کے بجائے ان کے متعلقہ فرائض کے حوالے سے حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی تربیت کی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور عام مسلمان خواتین کے احترام کے حوالے سے روایات کی تشہیر کی جائے، جن میں ان کی خواتین کے لیے شفقت اور تشویش ظاہر ہوتی ہے۔ بل میں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ خواتین کے خلاف گھر کے اندر اور کام کی جگہ تشدد کو قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا جائے۔ یونین کونسل کی سطح پر مصالحتی کونسلیں قائم کی جائیں جن میں گھریلو تنازعات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے تین افراد کو شامل کیا جائے۔ تمام

عنوان: خواتین کی عزت کا بل 2009ء
پیش کار: شیریں ارشد خاں، پاکستان مسلم لیگ (ن)
بتاریخ: 6 اکتوبر 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

گھریلو تشدد کے تنازعات کو ان مصالحتی کونسلوں کے ذریعے حل کیا جائے، جن میں ملزم کے لیے ایسی سزا کا تعین کیا جائے جس سے معاشرے میں گھریلو تشدد کے واقعات کی مؤثر روک تھام ہو سکے۔

بل کے محرک نے بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا:

''چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں خواتین کو ان کے مذہب اور آئین کے مطابق تحفظ حاصل ہے اور ایک بے بس اور مظلوم عورت اکثر روایتی رسوم و رواج کے بھیس میں تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ اس لیے اس بل کے ذریعہ عورتوں کے وقار کے تحفظ کو یقینی بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے''۔

مشاہدات

یہ بل عمومی نوعیت کے خیالات اور رہنما اصولوں پر مشتمل ایک بیانیہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بل کی تیاری میں قانونی پس منظر اور سمجھ رکھنے والا کوئی شخص شامل نہیں رہا ہے۔ اس بل میں تجویز پیش کی گئی تھا کہ ''خواتین کے خلاف گھر اور کام کی جگہ پر ہونے والے ہر قسم کے تشدد کو غیر قانونی قرار دیا جائے''، لیکن اس میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تعریف نہیں کی گئی۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ گھریلو تشدد کے تمام اقدامات قابل دست اندازی پولیس ہوں گے جس کا مطلب گھریلو معاملات میں پولیس کی براہ راست مداخلت ہے۔ اس کے برخلاف بل نے عدالتوں کے بجائے مصالحتی کونسلوں کو گھریلو تشدد کی سزا کا تعین کرنے والی اتھارٹی بھی تجویز کیا ہے۔ بل میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ مصالحتی کونسلیں کس طرح اس اختیار کو استعمال کریں گی اور اپنے احکامات پر عمل کے لیے کون سے اختیارات سے کام لیں گی۔

تبصرہ

قانون قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہوتا ہے، جس سے سیاسی طور پر منظّم معاشرہ میں حقوق وجود میں آتے، فرائض عائد ہوتے اور اختیارات تفویض ہوتے ہیں جس کی پشت پناہی ریاست اور دستور کرتا ہے۔ معروف طریق کار کے مطابق زیر غور بل کو مسودۂ قانون کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دراصل مقاصد اور اصولوں کا ایک بیان تھا جو قانون سازی کے عمل میں ملحوظ رہنے چاہییں۔

تاہم اس بل میں پاکستان کی معاشرتی بنیادوں کو اچھی طرح سمجھا گیا تھا اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ

وسلم کی زندگی کو ذاتی اور عوامی زندگی کے تمام حصوں میں رہنمائی کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو عام کیا جائے اور لوگوں کو اس یقین پر آمادہ کیا جائے کہ ان کے عورتوں کے لیے کیا فرائض ہیں اور ان کی عورتوں کے ساتھ نرمی کا کیا اجر آخرت میں ان کو ملنے والا ہے تو خاندان میں عورت کا مقام و مرتبہ سزا کے کسی نظام کے بغیر ہی بلند ہو جائے گا۔ تاہم یہ اہم ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کے اسکالرز کی مشہور کتب میں دی گئی رہنمائی اور ۷ویں سے ۱۹ویں صدی عیسوی تک مسلم حکمرانوں کی مثالوں اور نظائر کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اپنایا جائے۔

سفارش

محرک کی سوچ بڑی قیمتی ہے جس کا اظہار صنفی امور پر قانون سازی کے دوران ہونا چاہیے۔

.....

حواشی

1۔ محترمہ ماروی میمن قومی اسمبلی میں خواتین کے لیے مخصوص نشست پر پاکستان مسلم لیگ (ق) کی طرف سے رکن اسمبلی تھیں۔ انہوں نے 22 جون 2011ء کو قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دیا، اور بعد ازاں پاکستان مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئیں۔

2۔ عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کی دفعہ 3۔

3۔ ثالثی کونسل عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ 1961ء کے تحت قائم ہونے والا ایسا ادارہ ہے جو اس قانون کے تحت آنے والے کسی مسئلہ کے حل کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ ثالثی کونسل چیئرمین اور فریقین میں سے ایک ایک نمائندہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کونسل کا چیئرمین یونین کونسل کا چیئرمین (ناظم) یا اس کی غیر موجودگی میں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ فرد ہوتا ہے۔

4۔ عائلی عدالتیں ایکٹ 1964ء کے مطابق عائلی عدالتیں کسی بھی مقدمہ کے دائر ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر اسے نمٹانے کی پابند ہیں (بمطابق دفعہ 12۔الف)۔ اس عدالت میں دائر کیے جانت والے کسی بھی مقدمے کی فیس صرف پندرہ روپے مقرر ہے۔

5. PLD 1971 Lah. 139; PLD 1983 FSC 518

6۔ عدّت سے مراد کسی خاتون کے شوہر کے انتقال یا طلاق واقع ہو جانے کے بعد کا مقررہ عرصہ ہے جس میں وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ عدت کا مقصد کسی شک وشبہ کے بغیر یہ جاننا ہے کہ مطلقہ یا بیوہ حاملہ ہے یا نہیں تاکہ شادی ختم ہونے کے بعد اگر اس کے ہاں بچے کی ولادت ہو تو اس کے والد کا تعین واضح طور پر ہو سکے۔

7۔ جان کیرن کراس (John Cairncross) نے کثرتِ ازدواج کے بارے میں بریفالٹ (Briffault) کا یہ قول نقل کیا ہے: ''یورپین جنسی قوانین سے کوئی بھی دیگر انحراف، چاہے یہ کوئی گناہ ہی ہو، اس کے مقابلے میں، کم تر ہی سمجھا گیا۔''

Cairncross, John, *After Polygamy was made a Sin: The Social History of Christian Polygamy,* 1974: Routledge and Kegan Paul Ltd., P.1

8۔ ایضاً

9۔ سورہ النساء کی آیت نمبر 3 کا ترجمہ یہ ہے: ''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔''

اس آیت میں جو شرط بیان کی گئی ہے اس کا پس منظر جنگِ احد میں صحابۂ کرام کی بڑی تعداد میں شہادت تھی، جس کے نتیجے میں متعدد خواتین بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے تھے۔ عبداللہ یوسف علی نے اپنے معروف انگریزی ترجمۂ قرآن میں اس آیت کے ذیل میں اس حوالے سے مذہبی روایت کو یوں بیان کیا ہے کہ ''واقعہ تو گزر گیا لیکن اصول باقی رہا۔'' یعنی قرآن کی یہ ہدایت صرف اس خاص حالت کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصولی ہدایت ہے جو دیگر حالات میں بھی قابلِ اطلاق ہے۔

10۔ کثرتِ ازدواج کے مسئلہ پر 1962ء میں 209 مسلم علما کے مشترکہ بیان کو ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ دیکھیے:

Rahman, Dr. Tanzilur, "Muslim Family Laws Ordinance: Islamic and Social Survey" Karachi: Royal book Co. 1997, Pp. 125-31.

11۔ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961ء کی دفعہ 9۔

12۔ پیش کار نے یہ تجویز اس آرڈیننس کی دفعہ 7 کے تحت رکھی ہے جو طلاق کے بارے میں ہے۔

13۔ اگرچہ یہ بجائے خود المیہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں طلاق یافتہ عورت کی دوسری شادی کو مشکل تر بنا دیا گیا ہے۔

14۔ uardians and Wards Act, 1890 (Act VIII of 1890) کی دفعات 7 اور 17۔

15. Mulla, D.F., *Principles of Muhammadan Law,* Para 370.

16۔ چوہدری وجاہت حسین، ڈاکٹر دونیا عزیز، جام میر محمد یوسف، میاں ریاض حسین پیرزادہ، محترمہ فضہ جونیجو، ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ، ہمایوں سیف اللہ خان۔

17۔ یہی بل سینیٹ میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کی ڈاکٹر دونیا عزیز نے پیش کیا۔

18. 1979 CLC 462

19. PLD 1974 Lah. 78

20۔ شریعت کے مطابق باہمی رضامندی سے طے کردہ جرمانہ جو جرم کرنے والا نقدی یا منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی شکل میں ولی کو ادا کرے گا۔ (تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 310 کی تشریح)

21۔ انگریزی کے لفظ Rape کے لیے اردو میں ''زنا بالجبر'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

22۔ قتلِ عمد: جانتے بوجھتے جان سے مارنا، یعنی کسی کو جان سے مارنے کی نیت سے کوئی ایسا عمل کرنا جس سے موت واقع ہو جائے۔ (تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 300)

23۔ قصاص سے مراد جرم کی نوعیت ہی کی سزا ہے، یعنی مجرم نے کسی کے جسم کا کوئی عضو ضائع کیا ہو تو مجرم کے جسم کا بھی وہی

عضو ضائع کیا جائے۔ اگر اس نے کسی کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو مقتول کے ولی کے حق کے طور پر مجرم کو موت کی سزا دینا۔

24۔ فتاویٰ قاضی خان، مصطفائی پریس، دہلی، ص 157

25. Tanzil-ur-Rahman, Dr., *A Code of Muslim Personal Law,* Karachi: Hamdard Academy, 1978, p. 67

26۔ خلع: نکاح ختم ہونے کی ایسی صورت جو باہمی رضامندی سے لیکن بیوی کے اصرار پر ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:
Mulla, D.F., Principles of Muhammadan Law, para 319

27. Mulla, D.F., Principles of Muhammadan Law, para 250

28. Tanzil-ur-Rahman, *A Code of Muslim Personal Law,* Karachi: Hamdard Academy, 1978, p.17

29۔ حق بخشوائی: لفظی مطلب ہے اپنے حق سے دستبردار ہونا یا اپنا حق معاف کروانا۔

30۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا پریس ریلیز، 30 دسمبر 2006ء۔ دیکھیے:
http://www.cii.gov.pk/pressrel/recom.pdf (accessed on July 2, 2010)

31. www.islamawareness.net/Marriage/Qur'an/news1.html (accessed on June 15, 2010)

32۔ ایضاً

33۔ ''سوارا'' یا ''ونی'' کے ناموں سے ملک کے مختلف حصوں اور قبائل میں ایک رواج ہے، جس میں کسی جھگڑے کی صورت میں ملزم خاندان کی کوئی عورت مظلوم خاندان کے کسی مرد کے نکاح میں دے دی جاتی ہے۔ اصولاً اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان جھگڑا ختم ہو جائے۔

34۔ کاروکاری: ''کارو'' کا لفظی مطلب ہے ''کالا مرد'' اور ''کاری'' کا مطلب ہے ''کالی عورت''۔ یہ اصطلاح دیہی سندھ کے ایک رواج کے لیے استعمال ہوتی ہے جس میں ایک عورت اور/یا ایک مرد کو غیر اخلاقی عمل کرنے یا ایسا عمل کرنے کے شبہ میں قتل کر دیا جاتا ہے۔

35۔ ''قابلِ دست اندازی پولیس'' ایک ایسا اقدام ہے جس میں پولیس افسر مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کے دوسرے شیڈول یا وقت کے کسی دیگر لاگو قانون کے مطابق کسی بھی ملزم کو وارنٹ کے بغیر گرفتار کر سکتا ہے۔
(Section 4(1)(f) of Code of Criminal Procedure, 1898)

36۔ صحیح بخاری، کتاب 7، حدیث 70۔

37۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث 1874۔

38. Mulla, D.F., *Principles of Muhammad Law,* sec. 272

39۔صحیح بخاری، کتاب 7، جلد 62، حدیث 4۔

40. PLD 1969 Pesh. 134

41. 2001 CLC 1273

42. Mulla, D.F., Principles of Muhammadan Law, Section 370

43۔اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق سے متعلق منشور کی تمہید۔

44. Joint general recommendation/general comment No. 31 of the Committee on the Elimination of Discrimination against Women and No. 18 of the Committee on the Rights of the Child on harmful practices available at 'http://tbinternet.ohchr.org/Treaties/CEDAW/Shared%20Documents/1_Global/CEDAW_C_GC_31_CRC_C_GC_18_7557_E.doc'

آخری مرتبہ رسائی بتاریخ 14 فروری 2015ء

45. PLD 1962 Kar 442

46. 2003 CLC 1450

47. 2000 CLC 1725

48. PLD 2001 Lah 188

49. 2003 CLC 1213

50. 1990 CLC 1908

51. 2000 CLC 1725

52۔ عدّت کے عرصہ کے دوران

53۔ مبارات: (لفظی مطلب مقابلہ یا مسابقت)۔نکاح ختم ہونے کی ایسی صورت جو زوجین کے باہمی اتفاقِ رائے سے وقوع پذیر ہو۔مبارات کی پیش کش زوجین میں سے کسی بھی ایک کی جانب سے آسکتی ہے اور جب دوسرا اسے منظور کرلے تو فسخِ نکاح کا عمل مکمل ہوجاتا ہے۔دیکھیے: Principles of Muhammadan Law by D.F. Mullah

54۔عائلی عدالتیں ایکٹ مجریہ 1964، دفعہ 10

55۔عائلی عدالتیں ایکٹ مجریہ 1964، دفعہ 9

56۔ پارلیمنٹ کا پہلا مشترکہ اجلاس 20 ستمبر 2008ء کو، دوسرا 8 تا 22 اکتوبر 2008ء، تیسرا 28 مارچ 2009، چوتھا 26 اکتوبر 2009ء، پانچواں 24 نومبر 2009، چھٹا 7 تا 9 دسمبر 2009، ساتواں 5 اپریل 2010، آٹھواں 19 دسمبر 2010، نواں 22 مارچ 2011ء، دس واں 13 اور 14 مئی 2011ء، بارہواں 20 مارچ تا 12 اپریل 2012ء اور تیرہواں 21 مئی 2012ء کو ہوا۔

57۔ مجوزہ ذیلی دفعہ اور اغراض ومقاصد اور وجوہ کا بیان یہاں کسی تبدیلی کے بغیر شامل کیا گیا ہے۔

58. Mulla, D.F., Principles of Muhammadan Law, Section 579

59۔ مسلم عائلی قوانین آرڈی ننس، 1961ء کی دفعہ 2۔

60. 1981 CLC 78

61۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ زیرِ سرپرستی بچہ نابالغ رکم سن ہو، تاہم چونکہ اکثر مقدمات میں کم سن بچے کے لیے سرپرست کا تقرر کیا جاتا ہے اس لیے ''کم سن کی سپردگی'' اور ''کم سن کی بہبودی'' وغیرہ اصطلاحیں عام طور پر مستعمل ہیں۔

62. 1974 SCMR 305

63۔ فقۂ حنفی: شریعت کی عدالتی تعبیرات کا وہ کام جو امام ابوحنیفہ (699 تا 765 عیسوی) اور ان کے شاگردوں نے انجام دیا۔

64. PLD 1963 Lah. 534

65. PLD 1981 Lah. 393

66۔ بل کا ابتدائیہ۔

67۔ مسلم لیگ (ق) کی محترمہ نیلوفر بختیار نے یہی بل معمولی تبدیلیوں کے ساتھ سینیٹ میں پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا:
The Domestic Voilence (Prevention and Protection) Bill, 2012

68۔ دیکھیے: ایکسپریس ٹریبیون، 2 اگست 2010ء۔

69۔ دیکھیے:

National Assembly, Orders of the Day, March 20, 2012
http://www.na.gov.pk/uploads/ documents/ofday200312_12js.pdf (accessed on February 6, 2013)

70۔ دیکھیے:

National Assembly Debates, April 5, 2012
http://www.na.gov.pk/uploads/documents/1335241184 _564.pdf (accessed on February 6, 2013)

71۔ دیکھیے:

National Assembly Debates, April 12, 2012
http://www.na.gov.pk/uploads/documents/ 1335241522_pdf (accessed on February 6, 2013)

72۔ دیکھیے:

National Assembly Resolution on International Women's day, http://www.na.gov.pk/en/resolution _detail.php?id=89 (accessed on March 10, 2013)

73۔ بل کی دفعہ 4۔

74۔ مثال کے طور پر دیکھیے:

Bureau of Justice statistics on domestic violence in USA http://hjs.ojp.usdoj.gov/content/intimate/ ipv.cfm;

یورپ کے حوالے سے مزید دیکھیے:

http://www.eurowrc.org/01.eurowrc /04.eurowrc_en/26.en_ewrc.htm (both accessed on June 22, 2010)

75۔ دیکھیے: اصمعی، ثروت جمال، ''عورت، مغرب اور اسلام''، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، 2015ء

76۔ اس موضوع پر مزید بحث آگے آئے گی۔

77. Black's Law dictionary (word: Right)

78۔ کفالہ: یہ اسلام کے سماجی نظام کا مخصوص تصور ہے، جس میں ہر فرد کی آمدنی یا ملکیت میں دوسروں کا بھی حق ہے۔ خصوصاً جو قریبی رشتہ دار ہوں، خواہ وہ گھر کے بوڑھے افراد ہوں یا کم سن یا عورتیں۔ ان سب کی حفاظت اور کفالت خاندان کے دیگر افراد کے ذمہ واجب ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Khurshid Ahmad, Family Life in Islam., Leicester: Islamic Foundation, 1974

79۔ دیکھیے:

Council of Islamic Ideology, Final Report on Examination of Laws, Dec. 1996: Islamabad, pp.269, 291-293

80۔ دیکھیے:

Daily Dawn, http://archives.dawn.com/archives/37631 (accessed on February 2, 2013)

81۔ دیکھیے:

Daily Dawn, http://archives.dawn.com/archives/37631 (accessed on February 2, 2013)

82۔ بل کا ابتدائیہ۔

باب دوم

جرائم سے متعلق قوانین اور مسوّداتِ قوانین

اس باب میں تیرھویں قومی اسمبلی کے منظور کردہ قوانین اور اس کے سامنے قانون سازی کے لیے پیش کی گئی تجاویز کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ذیل میں ضمانت، تیزاب کے حملے، قذف، جہیز سے متعلق قتل، بدلِ صلح میں عورتوں کو دینا، سزائے موت اور انسانی تجارت کے موضوعات شامل ہیں۔

ضمانت کا قانون

قانون ہر شخص کو بے گناہ تصوّر کرتا ہے، جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کی آزادی اور خود مختاری سے محض شبہ کی بنیاد پر محروم نہ کیا جائے۔ اس لیے ضابطۂ فوجداری مجریہ 1898ء جرائم کو قابلِ ضمانت اور نا قابلِ ضمانت کے درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ قابلِ ضمانت وہ جرائم ہیں جن میں جرم کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کا الزام جس شخص پر ہے اس کا آزاد رہنا معاشرے کے لیے خطرے کا باعث تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں اگر عدالت کے پاس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ خود کو نا قابلِ رسائی بنا کر ممکنہ تحقیقات یا مقدمہ سے بچنا چاہتا ہے تو ملزم کو ریاست کی تحویل سے رہا کر کے ایک یا زائد افراد کو یہ ذمہ داری دی جا سکتی ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اس کی موجودگی کی ضمانت دیں۔

نا قابلِ ضمانت جرائم میں ضمانت کو بطور حق طلب نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہر فرد کے حقِ آزادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدالتیں ایسے نا قابلِ ضمانت جرائم میں بھی ضمانت دے سکتی ہیں جن میں قید کی سزا 10 سال سے کم ہو اور اس سے انکار صرف ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 497 کے تحت استثنائی صورت میں ہوگا۔ قانوناً عدالتوں کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ضمانت کے معاملے میں کم عمر بچوں (16 سال سے کم)، خواتین، بیماروں یا معذوروں سے نرمی برت سکیں۔

ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 497 ضمانت سے متعلق ہے۔ اس دفعہ میں 2001ء کے 55ویں اور 2006ء کے 13ویں آرڈیننس کے ذریعے ترامیم کی گئیں۔[1] اوّل الذکر ترمیم نے ایسے ملزم کو حاصل سہولت کو ختم کر کے قانون کو سخت بنا دیا تھا جس کے خلاف مقدمے کی سماعت ایک متعین حد سے بڑھ جائے جبکہ ثانی الذّکر ترمیم کے ذریعے ملزم خواتین کے لیے بالخصوص سہولت حاصل ہوئی۔ حال ہی میں ضابطہ فوجداری (ترمیمی) ایکٹ 2001ء نے دفعہ 497 کو تقریباً اسی شکل میں بحال کر دیا ہے جس

میں وہ 2001ء سے پہلے تھی، اور ملزم خواتین کے لیے سہولت فراہم کرتے ہوئے 2010ء کے پانچویں آرڈیننس کو منسوخ کر دیا گیا۔ یہ سارا عمل اگرچہ قانون سازی کے تین مراحل کے ذریعہ مکمل ہوا، مگر وہ ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتا تھا۔ ذیل میں موجود بحث اس سلسلے میں اب تک کی آخری قانون سازی (2011ء کے آٹھویں ایکٹ) پر مبنی ہے، جب کہ مذکور دونوں قوانین کا تذکرہ اسی نسبت سے کیا گیا ہے۔

ضابطہ فوجداری (ترمیمی) ایکٹ 2011ء

اس ایکٹ کے ذریعے ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 426 اور 497 میں ترمیم کی گئی جب کہ ضابطہ فوجداری (ترمیمی) آرڈیننس 2010ء (2010ء کے پانچویں آرڈیننس) کو منسوخ کیا گیا ہے۔ اس قانون کا مقصد ایسے ملزمان کو سہولت فراہم کرنا ہے جو محض اس لیے جیلوں میں پڑے ہیں کہ ان کے مقدمات پر کارروائی عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار سمیت متعدد دوسری وجوہ کی بناء پر عرصہ دراز تک شروع ہی نہ ہو سکی۔

اس ایکٹ کے تحت ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جائے گا:

- اگر وہ ایسے جرم کا ملزم ہو جس کی سزا موت نہیں ہے، اگر وہ مسلسل ایک سال تک زیرِ حراست رکھا جا چکا ہو اور اس کے مقدمے کی سماعت مکمل نہ ہوئی ہو۔ خاتون ہونے کی صورت میں یہ حقِ ضمانت 6 ماہ سے زائد جیل میں رہنے پر حاصل ہوگا۔
- اگر اس پر موت کی سزا کے حامل جرائم میں سے کسی کا الزام ہو اور اس کی حراست کی مدّت دو سال سے زیادہ ہو جائے۔ ملزم عورت کے لیے یہ مدّت ایک سال ہوگی۔

اسی طرح جس عدالت میں اپیل دائر کی گئی ہو وہ بھی ملزم کو ضمانت پر رہا کر دے گی:

- اگر اسے تین سال تک کی سزا دی گئی ہو اور اس کی اپیل کا فیصلہ سزا سنائے جانے کے بعد 6 ماہ کے اندر نہ ہوا ہو۔
- اگر اسے تین سے سات سال کے درمیان قید کی سزا دی گئی ہو اور اس کی اپیل کا فیصلہ سزا کے ایک سال کے اندر نہ ہوا ہو۔

● اگر اسے عمر قید یا سات سال سے زیادہ قید کی سزا دی گئی ہو اور اس کی اپیل کا فیصلہ سزا کے دو سال کے عرصے کے اندر نہ ہوا ہو۔

یہ رعایت پہلے سے سزا یافتہ ایسے مجرم کو نہیں دی جائے گی جس کو کسی جرم میں موت یا عمر قید کی سزا ہوئی ہو یا ایسے شخص کو جو ٹرائل یا اپیل کورٹ کی رائے میں ایک سخت جان، عادی اور خطرناک مجرم ہے یا دہشت گردی کے کسی ایسے فعل میں ملوّث ہے جو موت یا عمر قید کی سزا کا مستوجب ہے۔

مشاہدات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 497 گزشتہ چند برسوں کے دوران بڑی تبدیلیوں سے گزری ہے۔ 2001ء کے 54ویں آرڈیننس نے اس دفعہ میں جوہری تبدیلیاں کیں، اور وہ جملۂ شرطیہ (proviso) ختم کر دیا جس کی وجہ سے کسی شخص کو اس بنیاد پر ضمانت پر رہا کیا جا سکتا تھا کہ اس کے خلاف مقدمے کی سماعت اس کی کسی کوتاہی کے بغیر طویل عرصے سے زیرِ التواء ہے۔

2010ء کے پانچویں آرڈیننس[2] نے دفعہ 497 میں مزید ترمیم کی اور عام استثنٰی کی شق سے خواتین کے ذکر کو حذف کر کے ملزمہ کے حوالے سے مخصوص شرائط (provisos) متعارف کرائی گئیں۔ اس ترمیم کی رُو سے تمام ناقابلِ ضمانت جرائم ملزمہ خواتین کے لیے قابلِ ضمانت قرار پائے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عورتوں کی ضمانت ہر صورت میں منظور کر لی جائے گی، سوائے ان واقعات کے جن میں وہ دہشت گردی، مالیاتی بدعنوانی، قتل اور ایسے جرائم میں مطلوب ہوں، جن کی سزا موت یا 10 سال قید دی جا سکتی ہو۔ تاہم عدالت کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ اگر مقدمے کے حقائق اور حالات کے مطابق ملزمہ بہتر سلوک کی حق دار ہو تو وہ ایسے مقدمات میں ضمانت بھی منظور کر سکتی ہے۔

مذکورہ بالا جرائم میں ملوّث ایسی خواتین بھی ضمانت کا حق حاصل کر سکتی ہیں جن کے مقدمے کی سماعت ان کی حراست کے بعد 6 ماہ کے دوران مکمل نہ ہوئی ہو، بشرطیکہ یہ تاخیر ملزمہ یا اس کے نمائندہ کے کسی فعل کا نتیجہ نہ ہو۔

ضابطہ فوجداری (ترمیمی) ایکٹ 2011ء نے 2010ء کے پانچویں آرڈیننس کو منسوخ کرتے ہوئے ضمانت کے قانون (دفعات 426 اور 497) میں دستیاب رعایتوں کو بحال کیا ہے۔

تبصرہ

2010ء کا پانچواں آرڈیننس تقریباً 5 سال (2001-2006ء) نافذ رہا۔ 2006ء سے پہلے عدالت مقدمے کے حالات کے اعتبار سے عورتوں، بچوں اور بیمار یا معذور افراد کی ضمانت منظور کر سکتی تھی، اور اس میں مختلف جرائم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ کمزور اور ضعیف لوگ تمام مقدمات میں سہولت حاصل کر لیتے تھے۔ 2010ء کے پانچویں آرڈیننس نے دہشت گردی، مالیاتی بدعنوانی اور قتل کی ملزم خواتین کو الگ کر دیا اور قرار دیا کہ ان کو ایسی دوسری خواتین کے مقابلے میں ضمانت کا حق نہیں ہوگا جو ایسے جرائم میں ملوّث ہوں گی جن کی سزا 10 سال یا عمر قید یا موت ہوگی۔ اس وجہ سے اس آرڈیننس کو عام عورتوں کو درپیش مشکلات کو کم کرنے کے سلسلے میں ایک پیش قدمی کے بجائے ایک سیاسی اقدام کے طور پر دیکھا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اس قانون کو سیاسی وجوہ پر مبنی قرار دیا، جس کا مقصد پارٹی کی چیئر پرسن بینظیر بھٹو (مرحومہ) کو نشانہ بنانا تھا، جو اس وقت مالیاتی بدعنوانی[3] کے متعدد الزامات کا سامنا کر رہی تھیں۔ اس قانون کو ''خواتین دشمن'' اور عدلیہ کی آزادی کو کم کرنے کی کوشش بھی قرار دیا گیا۔[4]

اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد چاروں صوبوں اور وفاقی دارالحکومت کی جیلوں سے تقریباً 1200 خواتین کو رہا کیا گیا۔[5] یہ واقعی بے گناہ خواتین کے لیے تو بہت بڑی سہولت تھی، جو محض اس بناء پر جیلوں میں تکلیف دہ زندگی بسر کر رہی تھیں کہ ان کے خلاف مقدمات کی سماعت مکمل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ امکان بھی واضح ہے کہ گرفتار شدہ بعض خواتین منشیات اور انسانی تجارت، چوری، ڈاکہ زنی، اغواء اور زنا[6] جیسے سنگین جرائم میں ملوّث گروہوں سے بھی وابستہ ہوں۔ بعض اوقات مذکورہ جرائم ان جرائم سے زیادہ سنگین نظر آتے ہیں، جن کے لیے آرڈیننس میں نرمی دکھائی گئی تھی۔ زیادہ المناک بات یہ ہے کہ ''دہشت گردی''[7] اور ''مالیاتی بدعنوانی''[8] کی اصطلاحوں کے معنی کے اعتبار سے مبہم اور وسیع ہونے کی وجہ سے استغاثہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ اس قانون میں دی گئی سہولت میں یہ امکان موجود تھا

کہ مجرم گروہ اور جتھے عورتوں کو جبراً اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کریں اور اس قانونی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھیں۔ اس لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اس عرصے میں منشیات کی سمگلنگ[9] اور اغواء[10] میں عورتوں کے استعمال میں اضافہ دیکھا گیا۔ 2010ء کے اس آرڈیننس کی ایک اور خامی یہ بھی تھی کہ اس سے قبل دفعہ 497 میں نہ صرف عورتوں بلکہ 16 سال سے کم عمر بچوں، بیماروں اور معذوروں کے لیے بھی نرم گوشہ موجود تھا اور اس طرح اس میں تمام کمزور اور غیر محفوظ افراد کے لیے سہولت موجود تھی۔ عورتوں کے بارے میں مخصوص شقوں کے اضافے نے یہ پیغام دیا کہ حکومت درحقیقت کمزور اور نادار طبقات کے حقوق کے تحفظ میں دلچسپی نہیں رکھتی بلکہ اس کا یہ اقدام صرف حقوقِ نسواں کی تحریک کا غیر معتدل ردّعمل ہے، جب کہ معاشرے کے دوسرے کمزور اور ناتواں لوگوں کے حقوق کی وکالت کے لیے کوئی مضبوط آواز نہیں تھی، اس لیے انہیں ضمانت میں وہ رعایتیں نہیں دی گئیں جو عورتوں کو دی گئی تھیں۔ یہ تو واضح ہے کہ بیشتر صورتوں میں عورتوں کے مقابلے میں بچوں، بیمار اور معذور افراد کو زیادہ تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ضابطہ فوجداری (ترمیمی) بل کو جون 2008ء میں وزیر قانون وانصاف نے قومی اسمبلی میں پیش کیا تھا، جس کا مقصد نافذ العمل قانون مجموعہ ضابطہ فوجداری (ترمیمی) آرڈیننس کی خامیوں کو دور کرنا تھا۔ بالآخر یہ بل منظور ہوا اور 18 اپریل 2011ء کو قانون بن گیا۔ اس قانون میں مجموعۂ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعات 426 اور 497 میں جو تبدیلیاں کی گئیں وہ ذیل میں بیان کی گئی ہیں:

<u>دفعہ 426</u>: دفعہ 426 کی ذیلی دفعہ 1-الف، 1972 کے بارہویں آرڈیننس کے ذریعہ شامل کی گئی تھی اور اس نے ان لوگوں کے لیے ضمانت کی رعایت متعارف کرائی تھی جو عدالتوں میں مقدمات کی زیادتی اور دیگر وجوہ کی بناء پر اپیلوں کے التواء کے دوران جیلوں میں بدترین زندگی گزار رہے تھے، اور ان کی اپیلوں کا فیصلہ معقول مدت کے دوران نہیں ہو رہا تھا۔ قانون نے ایسے واقعات کا نوٹس لیا اور قرار دیا کہ ایسے تمام حالات میں جہاں ایک شخص کو ماتحت عدالت سے سزا ہوئی اور اس نے فیصلہ سے یا ماتحت عدالت کے کسی حکم سے خود کو متاثرہ شخص سمجھتے ہوئے اعلیٰ عدالتی فورم پر اپیل دائر کرنے کو ترجیح دی ہو، اُسے

ان وجوہ کی بناء پر تکلیف برداشت نہیں کرنی چاہیے جس کے لیے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، یا جس کا وہ ذمہ دار نہیں تھا۔ یہ دفعہ تقریباً دو عشروں تک نافذ العمل رہی، لیکن 2001ء میں آرڈیننس کے ذریعہ منسوخ کر دی گئی۔ 2011ء کے آٹھویں ایکٹ نے نہ صرف سابقہ اصول کو بحال کر دیا، بلکہ اسے مزید مفصل بنا کر بہتر بنانے کی کوشش بھی کی۔ یہ دفعہ سزا یافتہ افراد کے درمیان جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتی اور تمام افراد کے لیے یکساں سہولتوں کو پیش کرتی ہے۔ تاہم عدالت کو حقائق کی بنیاد پر مقدمات کی تفصیلات کا جائزہ لینے کا اختیار دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو ضمانت پر رہا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

دفعہ 497: تاہم 2011ء کے آٹھویں ایکٹ نے دفعہ 497 میں جنس کی بنیاد پر تفریق کی ہے اس لیے ہمارے موضوع کے لحاظ سے یہ دفعہ، دفعہ 426 کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو گئی ہے۔

قانون میں سابقہ دفعات کی بحالی اور ان میں بہتری ایک ایسا خوش آئند اقدام ہے جس نے عوام کے منتخب نمائندوں کی مشاورت کے بغیر کی گئی ترامیم کو رد کیا۔ یہ ایکٹ عورتوں، معذوروں، بیمار اور کم عمر بچوں کے ساتھ یکساں دیکھ بھال اور تحفظ کا رویہ رکھتا ہے اور محض جنس کی بنیاد پر ملزمان میں تفریق نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ رعایت چند مخصوص جرائم تک محدود ہے اور نہ ہی کوئی جرم اس سے خارج ہے۔ یہ عدالت ہی کا اختیار ہے کہ مقدمے کے حقائق اور حالات پر غور کر کے اپنی صوابدید استعمال کرتے ہوئے ملزم کی رہائی یا حراست کا فیصلہ کرے۔

اس کے ساتھ ہی خواتین کے لیے زیادہ نرمی کا ثبوت دیتے ہوئے اس قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کی ضمانت سماعت کے ابتدائی مرحلے میں منظور نہیں ہوتی اور مقدمے کی سماعت ایک معقول وقت میں مکمل نہیں ہوتی تو اسے خصوصی رحم کا مستحق سمجھا جائے گا اور اسی حالت میں ایک سال گزارنے پر ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک ملزم مرد کے خلاف سزائے موت کے حامل جرائم کا مقدمہ ایک سال کی قید کے بعد بھی مکمل نہ ہونے پر اسے ضمانت پر رہا کیا جائے گا، جبکہ ایسے ہی حالات میں عورت کو چھ ماہ بعد رہا کر دیا جائے گا۔

ایکٹ نے جج کی صوابدید کو بحال کیا ہے، جس کو متعین حدود کے اندر استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اس

اسکیم میں اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ کسی ملزم کو اس کی آزادی سے ایک ایسے جرم کے لیے محروم نہ کر دیا جائے جس کو ایک معقول وقت کے اندر ثابت نہ کیا گیا ہو۔ قانون میں یہ احتیاط بھی موجود ہے کہ کوئی پختہ کار، مایوس اور عادی مجرم اس رعایت کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

حاصلِ کلام

مجموعہ ضابطہ فوجداری (ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء پارلیمنٹ کے کسی نہ کسی ایوان کے ایجنڈے پر تقریباً تین سال تک موجود رہا۔ جبکہ پارلیمنٹ، اور بالخصوص حکومت کو اس بل پر فوری توجہ دینی چاہیے تھی، جس کا مقصد 2001ء اور 2006ء کے نافذ کردہ آرڈیننسوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا ازالہ تھا۔ تاہم دیر آید درست آید کے مصداق یہ قانون سازی عام ملزمان، خصوصاً خواتین کی بعض مشکلات و مصائب کو کم کرنے کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔ قانون سازی کی ان کوششوں کے ساتھ اصل ضرورت خواتین کے بارے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے طرزِ عمل میں تبدیلی لانا ہے، چاہے وہ خواتین ملزم ہوں، سزا یافتہ یا دیگر۔

عدالتوں کو اس قانون کے تحت رعایت کی منظوری دیتے وقت بہت چوکنا اور محتاط رہنا ہوگا، تاکہ اس سے صرف وہی خواتین فائدہ اٹھا سکیں جو بے گناہ محسوس ہوں، اور جن کے خلاف استغاثہ معقول مدت گزرنے کے باوجود کوئی قابلِ اعتبار شہادت پیش نہ کر سکا ہو۔ عدالتوں کے لیے اس امر کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ عورتیں اضافی فائدے کی موجودگی کے باعث جرائم پیشہ گروہوں کا حصہ نہ بن جائیں۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ منشیات اور انسانی سمگلنگ اور اغواء میں خواتین کے ملوث ہونے کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

اہم تر بات یہ ہے کہ مقدمات اور بالخصوص فوجداری مقدمات کو جلد نمٹانے کی طرف توجہ دی جائے اور اس حوالے سے جہاں پولیس کو مناسب تربیت، افرادی قوت اور ساز و سامان سے لیس کیا جائے وہاں عدالتی امور میں بھی تاخیر کے عوامل کو دور کیا جائے۔

تیزاب کے حملے

حالیہ برسوں میں تیزاب سے حملوں کے نتیجے میں چہرے بگاڑنے اور تکلیف پہنچانے کے واقعات نے عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ معاشرے کے مختلف حلقے اس لعنت کے مکمل خاتمے کے لیے مناسب قانون سازی کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں۔ اگرچہ تیزاب کے حملے کسی جنس تک محدود نہیں ہیں اور مرد، خواتین اور بچے تیزاب حملوں کا شکار رہے ہیں،[11] لیکن اس حوالے سے قانون سازی کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے بالعموم حقوقِ نسواں سے متعلق ہی سمجھا جاتا ہے۔ تیرہویں قومی اسمبلی میں اس موضوع پر پیش کردہ مسوداتِ قانون (Bills) کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں بھی یہی تأثر نمایاں ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں اس بربریت کا شکار زیادہ تر عورتیں ہی رہی ہیں۔

یہ تمام چار بل جن پر یہاں بحث کی گئی، قومی اسمبلی میں مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے نجی اراکینِ اسمبلی کی طرف سے پیش کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک قانون سازی کے تمام مراحل طے کرتا ہوا قانون بن گیا، جب کہ ایک کو اس ایکٹ کے تسلسل میں متعارف کرایا گیا۔ ذیل میں پارلیمنٹ سے منظور کردہ ایکٹ پر تفصیل سے بات کی جائے گی، جبکہ تین دیگر مسودات پر مختصر تبصرہ ہوگا۔

فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء

یہ اس موضوع پر پہلا بل تھا، جس کا مقصد تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء میں مندرجہ ذیل دفعہ 337ایل۔الف کا اضافہ تھا، تاکہ کیمیائی مواد کے استعمال سے ہونے والے چہرے کے بگاڑ اور زخمی ہونے کو قابلِ سزا جرم قرار دیا جائے۔

''337ایل- الف: جو کوئی دوسرے شخص کو کیمیائی مواد وغیرہ کے استعمال کے ذریعہ چوٹ لگاتا، زخمی کرتا یا جسم کو سنگین نقصان

عنوان: فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء
پیش کار: شمشاد ستار بچانی اور بیگم حسنین، پاکستان پیپلز پارٹی
تاریخ: 30 جون 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

پہنچاتا یا انسانی جسم کو اس نیت سے بگاڑنے کا سبب بنتا ہے، کہ وہ کیمیائی مواد کو استعمال کر کے یا پھینک کر ایسی چوٹ یا زخم لگائے گا، زخمی کرے گا یا شدید جسمانی نقصان پہنچائے گا، یا انسانی جسم کو بگاڑے گا، اور اس طرح زندگی کو خطرے میں ڈالے گا، تباہ کرے گا، شکل بگاڑے گا یا کام کرنے سے معذور بنائے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ 10 سال تک قید کی سزا، دس لاکھ روپے تک جرمانہ اور نصف دیت کا سزاوار ہوگا۔''

بل نے ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کے شیڈول دوم میں بھی ایک ترمیم بھی تجویز کی ہے جس کے ذریعہ کیمیائی استعمال سے چوٹ یا شکل بگاڑنے کے جرم کو قابل دست اندازی پولیس، نا قابل ضمانت اور نا قابلِ مصالحت قرار دیا گیا ہے۔

بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

''اگرچہ معاشرے میں تشدّد میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن نوجوان لڑکیاں اور خواتین ایسے تشدد کا زیادہ شکار ہیں۔ بعض اوقات یہ تشدد بہت زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے، جب اس کا ارتکاب تیزاب جیسے خطرناک کیمیائی مواد کے استعمال کے ذریعہ کیا جائے۔ ایسے تشدد کی خبریں وقتاً فوقتاً اخبارات میں بھی شائع ہوتی ہیں، لیکن زیادہ تر واقعات میں متاثرین زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں یا ان کی شکل بگڑ جاتی ہے اور یا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جس کی تلخ یادیں ان کے خاندان میں رہ جاتی ہیں۔ لیکن قانون کی مبہم دفعات کی وجہ سے ملزمان کو فائدہ ہو رہا ہے، اور وہ سزا سے بچ نکلتے ہیں یا واجبی سی سزا پاتے ہیں۔ تاہم ضرورت ہے کہ ایسے تشدّد کا ارتکاب کرنے والے افراد کو مؤثر طور پر روکنے کے لیے سخت ترین سزائیں دی جائیں۔''

تبصرہ

یہ مسوّدہ قانون اس انداز میں تیار کیا گیا کہ خود اس کا مقصد بہتر انداز میں واضح نہیں ہو سکا۔ پھر بھی اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ تیزاب کے حملوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف چارہ جوئی کے لیے قانون سازی کی پہلی کوشش تھی۔ یہ بل سپریم کورٹ کے 20 نومبر 2009ء کے نائلہ فرحت کے مقدمے کے فیصلے سے بھی پہلے پارلیمنٹ میں متعارف کرایا گیا، جس میں عدالتِ عظمیٰ نے تیزاب سے ہونے

والے تشدّد سے متعلق قانون سازی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔[12]

یاد رہے کہ دفعہ J-337 پہلے ہی قانون کی کتاب کا حصہ ہے، جس کا تعلق زہر کے استعمال سے نقصان پہنچانے، یا دماغ کو مختل کرنے، مدہوش کرنے والی ادویات استعمال کرنے سے ہے، جو زیادہ تر کیمیائی مواد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے مجوزہ دفعہ کا عنوان زیادہ متعین اور تفصیلات زیادہ واضح ہونی چاہیے تھیں۔

ضابطہ تعزیراتِ پاکستان (ترمیمی) بل 2010ء

اس بل کا مقصد ضابطہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء میں دفعہ 335-الف کی شمولیت اور دفعہ 336 میں ترمیم تھا۔ مجوزہ دفعہ 335-الف کا مقصد چہرہ بگاڑنے کو درج ذیل الفاظ میں قابلِ سزا جرم بنانا تھا۔

''**335-الف**: جو کوئی کسی شخص کو بدصورت کرنے یا چہرے کو بگاڑنے کی نیت سے تیزاب پھینک کر یا آگ کے ذریعہ یا آتشیں ہتھیار کے ذریعہ بدصورت کرنے یا چہرہ بگاڑنے کا باعث بنتا ہے۔''

چہرہ بگاڑنے سے مراد یہ لی گئی ہے کہ:

''اس دفعہ میں چہرہ بگاڑنے کا مطلب تیزاب پھینک کر یا آگ کے ذریعہ یا آتشیں ہتھیار استعمال کر کے چہرے یا جسم کے کسی حصے کو بگاڑنا، اور کسی شخص کو معذور بنانا یا زخمی کرنا یا اس کی خوبصورتی، اعضاء کے تناسب اور ظاہری شکل کو بگاڑنا ہے۔''

تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 336 میں بھی ترمیم کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یہ دفعہ اس شخص کے لیے سزا کا اعلان کرتی ہے جو کسی شخص کو اس طرح نقصان پہنچائے کہ متاثرہ فرد کے کسی عضو کی صلاحیت تلف ہو جائے۔ بل میں اس دفعہ کے متن کو بھی مندرجہ ذیل متن سے تبدیل کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔

(ا) جو کوئی بھی تیزاب، آگ یا کسی آتشیں ہتھیار کے ذریعہ چہرے یا جسم کے عضو کے کسی حصے کو مستقل طور پر بگاڑے گا، اسے زیادہ سے زیادہ عمر قید اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی جو

اس کی جائیداد یا جائیداد میں اس کے حصہ سے وصول کیا جا سکے گا۔شرط یہ ہے کہ ہر ایسا جرم انسداد دہشت گردی کی عدالت میں قابل سماعت ہوگا۔''

اس بل کے بیان کردہ اغراض و وجوہ میں ذکر ہے کہ قانون کی موجودہ دفعات چہرہ یا جسم کے کسی حصے کو بگاڑنے کے لیے تیزاب پھینکنے کے بڑھتے ہوئے واقعات کا مؤثر احاطہ نہیں کرتیں اور قانون کی مناسب دفعات کی عدم موجودگی میں اس مخصوص موضوع پر قانون سازی کی اشد ضرورت ہے۔

تبصرہ

یہ بل اوپر ذکر کردہ بل سے اگلا قدم تھا اور اس کا مطمع نظر تیزاب کے حملوں تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ایسے تمام جرائم کا احاطہ کرتا تھا، جو کسی کا چہرہ بگاڑے یا جسمانی اعضا کو متاثر کر کے کسی فرد کو زندگی بھر کے لیے مشکلات کا شکار کر دے۔اس لیے اس مسودے میں تیزاب کے ساتھ آگ اور آتشیں مواد کے ذریعہ جسمانی بگاڑ پیدا کرنے کا بھی ذکر کیا گیا۔سزا بھی پہلے بل سے خاصی زیادہ تجویز کی گئی تھی۔دفعہ 336 کا اصل متن کا مجوزہ ترمیم سے موازنہ میں یہ بات اہم ہے کہ موجودہ قانون میں قصاص کا براہِ راست تذکرہ موجود ہے،یعنی کسی کے عضو یا جسم کے حصے کی صلاحیت کو نقصان پہنچانے والے کو اسلامی قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔جبکہ مجوزہ ترمیم نے عمر قید اور مقررہ رقم کے جرمانے کی متعین سزا تجویز کی ہے۔ ایسی کسی تبدیلی کے جہاں دیگر اثرات ہوں گے وہاں ایک واضح فرق تو یہ ہوگا کہ متاثرہ فرد اُس فائدے سے محروم ہو جائے گا جو موجودہ قانون میں موجود ہے۔اس وقت قانوناً اگر ممکن ہو تو دفعہ 336 کے تحت اتلاف صلاحیتِ عضو کی صورت میں اگر ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا، جب کہ متبادل صورت میں مجرم کے لیے 10 سال قید سخت یا قید محض اور اَرش کی ادائیگی لازم قرار دی گئی ہے۔اَرش کی رقم متاثر شخص کو قابل ادائیگی ہے، جو وہ علاج معالجہ یا کسی اور مقصد کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔اس کے بجائے بل نے جرمانے کے نفاذ کی تجویز دی تھی، جو ریاست وصول کرتی ہے اور قومی خزانے کا حصہ بنتا ہے۔

بل میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ صورت بگاڑنے کے جرم کو انسداد دہشت گردی کی عدالت میں قابل سماعت بنایا جائے۔اس سے بل کے محرک کا مطلوب یہ تھا کہ روزانہ سماعت کے ذریعہ سات دنوں

میں سماعت مکمل ہو جائے گی۔ لیکن اس جرم کو انسدادِ دہشت گردی کی عدالتوں کے دائرۂ اختیار میں شامل کرنے کے لیے انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997ء کے شیڈول سوم میں ترمیم لازم تھی جو بل کا حصہ نہیں تھی۔

فوجداری قانون (دوسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء

فوجداری قانون (دوسرے ترمیمی) ایکٹ نے دفعہ 332 میں ترمیم کی ہے، اور دو نئی دفعات 336- الف اور 336-ب کو تعزیراتِ پاکستان کے ضابطے میں شامل کیا ہے۔ دفعہ 332 میں جہاں چوٹ کی متعدد اقسام کی تعریف کی گئی ہے، صورت بگاڑنے کو ایک قسم کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا چہرہ بگاڑنا یا جسم کے کسی عضو یا عضو کے کسی حصے کو بگاڑنا یا جدا کر دینا، جو اس فرد کو معذور بنا دے، زخمی کر دے، گلا یا جھلسا دے یا اس کی ظاہری صورت اور اس کے تناسب کو خراب کر دے۔

عنوان: فوجداری قانون (دوسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء
پیش کار: ماروی میمن، پاکستان مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 26 جنوری 2010ء
کیفیت: 26 دسمبر 2011 کو قانون بنا۔

نئی شامل کی گئی دفعہ 336-الف میں گلانے یا جھلسانے والے کسی مواد سے پہنچنے والی چوٹ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''جو کوئی بھی جان بوجھ کر یا بالارادہ کسی جلانے والے مواد سے یا ایسے مواد سے جس کا نگلنا، سونگھنا، مَس کرنا یا جسم میں لے جانا انسانی جسم کے لیے نقصان دہ ہو، کسی کو چوٹ پہنچائے یا چوٹ پہنچانے کی کوشش کرے تو کہا جائے گا کہ اس نے جلانے والے مواد سے چوٹ پہنچائی ہے۔''

اس دفعہ کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ گلانے یا سڑانے والے مواد کا مطلب وہ مواد ہے جو انسانی جسم کے کسی عضو کو تباہ کرے، زخمی کرے، شکل بگاڑے یا اُسے کاٹ کر الگ کر دے اور اس میں ہر قسم کا تیزاب، زہر، آتش گیر مواد، گرم مواد، موذی چیز، آتشیں، یا دوسرا کوئی کیمیائی مواد، جو گلا دینے یا سڑا دینے کا اثر رکھتا ہو اور جو انسانی جسم کے لیے ہلاکت خیز ہے۔ گلا دینے یا جھلسانے والے مواد سے زخم پہنچانے کی سزا دفعہ

336-ب میں مذکور ہے، جو عمر قید یا کم از کم 14 سال قید اور کم از کم -/10,00,000 (دس لاکھ) روپے جرمانہ ہوسکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کے شیڈول دوم میں بھی ترمیم کی گئی ہے، جس کے مطابق گلانے یا جھلسانے والے مواد سے پہنچانے کا جرم ناقابلِ ضمانت اور ناقابلِ مصالحت ہوگا۔

مشاہدات

ابتدا میں اِس بل کا نام ''تیزاب کی روک تھام اور انسدادِ جرائم بل'' تھا، اور اسے پاکستان مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والی رکن اسمبلی ماروی میمن،[13] پاکستان مسلم لیگ (ن) کی بیگم شہناز شیخ اور انوشہ رحمٰن خان نے مشترکہ طور پر پیش کیا تھا۔ تیزاب سے بچ جانے والوں کی فاؤنڈیشن[14] کے مطابق یہ بل سپریم کورٹ کے نائلہ فرحت مقدمے کے فیصلے کی روشنی میں تیار کیا گیا، جس میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ

''بنگلہ دیش میں انسداد تیزاب جرم ایکٹ مجریہ 2002ء نافذ کر دیا گیا ہے، جس میں ایسے مقدمات میں ملوّث ملزم کو موت تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ہم اس پر یہ اظہارِ خیال کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان خواتین ڈویژن کے ذریعہ اس موضوع پر ویسے ہی قانون کے فروغ کے لیے غور کرسکتی ہے۔''[15]

بنگلہ دیش کے تیزاب کے جرم کی روک تھام کے ایکٹ مجریہ 2002ء کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں:

- تیزاب کو کنٹرول کرنے کی قومی کونسل فنڈ کا قیام
- بحالی کے مرکز کا قیام
- تیزاب متاثرین کے لیے علاج
- تیزاب متاثرین کے لیے قانونی سہولیات کی فراہمی
- تیزاب کی فروخت کی دکانوں کی تالا بندی اور تیزاب لانے، لے جانے میں مصروف ٹرانسپورٹ پر پابندی

- تیزاب بیچنے کے لائسنسوں کی فی الحال منسوخی
- تیزاب پھینکنے والوں کے لیے سزائے موت اور ایک لاکھ ٹکا جرمانہ
- خصوصی ٹریبونلز میں فیصلہ
- مجرم کی عدم موجودگی میں فیصلہ[16]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جرم کے لیے سزائیں اور اس کی روک تھام کا طریق کار وضع کرنے میں بل کے محرکین نے بنگلہ دیش کے اس قانون کو سامنے رکھا ہے۔ بل کے اصل مسودے میں زہر خورانی کے ایکٹ مجریہ 1919ء، مجموعہ ضابطۂ فوجداری مجریہ 1898ء اور مجموعہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔ اس طرح بل کا مقصد ایک پورا نظام وضع کرنا تھا، جس سے نہ صرف تیزاب سے متعلق جرائم کو روکا جائے بلکہ زہریلے مواد کی پیداوار، درآمد، سنبھالنے، تقسیم کرنے، استعمال، دوسروں کو فراہمی، اور خرید و فروخت کو باضابطہ بنانا تھا۔ اصل بل کو جو عنوان دیا گیا تھا اس سے تو تأثر یہ ملتا تھا کہ یہ صرف تیزاب سے متعلق جرائم کا احاطہ کرتا ہے، لیکن دراصل اس نے اپنے دائرہ اختیار میں آگ، گرم مواد، زہر، گلانے سڑانے والے مواد، بشمول تیزاب، آتشگیر اور آتشیں مواد کے استعمال سے ہونے والے متعدد جرائم کو بھی لیا ہوا تھا۔

پارلیمنٹ نے جو قانون پاس کیا ہے، وہ تعزیراتِ پاکستان ضابطہ مجریہ 1860ء اور ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء میں ترامیم تک محدود ہے۔ اس حوالے سے جو خلارہ گیا تھا اس کے حوالے سے یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت اس موضوع پر ایک جامع قانون تیار کر رہی ہے، جس کا مقصد تیزاب کی درآمد، پیداوار، نقل و حمل، خرید و فروخت، اپنے پاس رکھنے اور تیزاب کے استعمال کو کنٹرول کرنے اور اس کے گلانے اور سڑانے کے مواد کی حیثیت سے غلط استعمال کو روکنا اور تیزاب اور جلنے کے متأثرین کو قانونی امداد فراہم کرنا ہوگا۔[17]

2013ء تک قائم رہنے والی سابقہ حکومت اور اس کے بعد وجود میں آنے والی موجود حکومت فروری 2015ء تک مذکورہ بل متعارف کرانے میں ناکام رہی ہے، لیکن متعدد رپورٹس سے ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ تیزاب سے بچ جانے والوں کی فاؤنڈیشن، قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں، اقوام متحدہ کے ترقیاتی فنڈ برائے خواتین (UNIFEM) اور وزارت برائے ترقی خواتین جیسے دلچسپی رکھنے والے اداروں اور تنظیمات کے درمیان مشاورتی عمل کے نتیجے میں ایک مسودہ تیار بھی ہو گیا تھا،[18] جس پر وزارتِ قانون و انصاف کی نظر ثانی کی خبر بھی آئی تھی[19] جس سے امید بندھی کہ یہ عمل حتمی مرحلے تک پہنچ چکا ہے، تاہم اس کے بعد کوئی پیش رفت سامنے نہ آسکی۔ ذیلی بحث، بل میں شامل دیگر امور سے اس امید پر صرف نظر کرتے ہوئے صِرف منظور شدہ قانون تک محدود ہوگی کہ جو خلا محسوس کیا جا رہا تھا، اسے جلد پُر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تبصرہ

کسی کی صورت بگاڑنے کے لیے تیزاب کا استعمال اور اسے زندگی بھر کے لیے دکھ اور مصیبت میں مبتلا کر دینا ان تمام لوگوں کے لیے بڑی تشویش کی بات ہے جو انسانی زندگی کی اس کی ساری خوبصورتیوں اور حقوق کے ساتھ قدر کرتے ہیں۔ اگرچہ تیزاب کے حملے کسی صنف[20] تک محدود نہیں ہیں، لیکن زیادہ تر واقعات میں متاثر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ عورت یا اس کے والدین کا کسی شخص کے ساتھ شادی سے انکار یا ایسے شخص کو نظر انداز کرنا جو اسے پسند کرنے کا دعویدار ہے، عورت کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کا سبب بن جاتا ہے، اور یہ سزا صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی رضا اور وقار کو اہمیت دیتی ہے۔ کسی عورت کے چہرے کو بگاڑنا اس کے لیے صرف جلنے کی تکلیف اور درد کا ہی باعث نہیں ہوتا بلکہ اس کی پوری زندگی کو تکلیف دہ بنا دیتا ہے۔ تیزاب سے تشدد کا نتیجہ آنکھوں اور اعضاء کے ضائع ہونے، اعضاء کے گل سڑ جانے، فسادِ خون اور ناسور جیسے انفیکشن کی صورت میں بھی نکلتا ہے۔ تیزاب کے متاثرہ فرد کو متعدد مرتبہ پلاسٹک سرجری کروانے کے باوجود لوگوں کی نگاہوں سے چھپنا پڑتا ہے۔ ایسا واقعہ اسے سماجی طور پر الگ تھلگ، ذہنی طور پر پریشان اور جسمانی طور پر معذور کر دیتا ہے۔ عورتوں کے معاملے میں تو صورتِ حال یوں بھی زیادہ پریشان کن ہوتی ہے کہ اس کے چہرے پر باقی رہنے والے داغ کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ تعلق کی نشانی سمجھا جاتا ہے، اور اُسے اور اس کے خاندان کو ہمدردی اور پیار کے بجائے عوامی ناگواری

کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران ایسے جرائم سے بچنے کی ضرورت کا احساس اور اصرار کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ اس پس منظر میں اس موضوع پر قانون کی منظوری آگے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔

تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ کی دفعہ 332 میں زخمی کرنے کی تعریف میں کسی شخص کو درد، دکھ، نقصان، بیماری، معذوری سے دوچار کرنا یا زخم پہنچانا یا کسی شخص کے جسم کے کسی عضو یا حصے کو اُسے جان سے مارے بغیر بگاڑنا، معذور کرنا، علیحدہ کرنا شامل ہے۔ پھر چوٹ کی نوعیت اور سنگینی کے حوالے سے اس کی متعدد اقسام کا ذکر کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:

(ا) **اتلاف عضو:** کسی کے جسم کے کسی عضو یا ہاتھ پاؤں کو تلف کرنا، کاٹ دینا، علیحدہ کر دینا۔

(ب) **اتلاف صلاحیتِ عضو:** کسی کے جسمانی عضو کو بے کار کرنا، مستقل طور پر کام کرنے کی صلاحیت، طاقت یا اہلیت سے ناکارہ بنا دینا یا ہمیشہ کے لیے شکل بگاڑ دینا۔

(ج) **شجہ:** کسی شخص کے سر اور چہرے پر ایسا زخم لگانا جو اتلاف عضو کے مترادف یا اتلاف صلاحیتِ عضو کی تعریف میں نہ آتا ہو۔

(د) **جرح:** سر اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کو ایسا زخمی کرنا جو زخم کا نشان چھوڑ دے، خواہ عارضی یا مستقل؛ اور

(ہ) ہر قسم کے دوسرے زخم۔

شجہ اور جرح کی مزید تشریح کی گئی ہے، اور ہر معاملے کے لیے نقصان کی سنگینی کے لحاظ سے سزا تجویز کی گئی ہے۔ جیسے یہ ممکن ہے کہ شجہ کے باعث ہڈی ظاہر ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ہڈی اپنی جگہ سے اتر بھی سکتی ہے یا ٹوٹ سکتی ہے۔ کھوپڑی کو پہنچنے والی ضرب دماغ کی جھلّی کو چھو سکتی ہے یا اس کو پھاڑ بھی سکتی ہے۔ اسی طرح جرح کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ زخم جوفِ بدن [21] تک پہنچ جائے یا گوشت تک ہی محدود رہے۔ زخم کی ان تمام ممکنہ اقسام کی واضح طور پر تشریح کی گئی ہے اور ان کے مطابق سزائیں بھی متعین کی گئی ہیں۔ یہ پورا خاکہ اسلامی قانون کے مطابق ہے، جس میں ایک طرف قصاص فراہم کیا گیا

ہے، جہاں اس کا اطلاق ہوسکتا ہے، اور دوسری طرف سزا یافتہ مجرم کو ایک مخصوص رقم متاثرہ فرد کو ادا کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تعزیراتِ پاکستان کا مجموعہ تیز رفتار اور غفلت سے ڈرائیونگ یا غفلت کے کسی دوسرے فعل کے نتیجے میں، غلطی سے یا زہر کے استعمال سے پہنچنے والے زخم پر یا دیگر زخم، جو زندگی کو خطرے میں ڈال دیں یا جس کی وجہ سے شدید جسمانی درد پہنچے یا چند دن تک معذور بنا دے، سمیت ہر قسم کی سزاؤں کی مفصل تشریح بھی کرتا ہے۔

زیرِ نظر ترمیمی ایکٹ نے دفعہ 332 میں زخم کی تعریف میں صورت مسخ کرنے اور چہرہ بگاڑنے کو وضاحت کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ اگرچہ صورت بگاڑنے کا ذکر دفعہ 335 میں بھی موجود ہے، جہاں قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کی طرف سے دوسرے شخص کے چہرے کا بگاڑ زخم کی وجہ سے مستقل ہو جائے تو ایسے زخم کو اتلاف صلاحیتِ عضو تصور کیا جائے گا، اور اگر مجاز طبی ماہر کی رائے میں یہ ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا، لیکن اگر قصاص نافذ نہ ہو پائے تو مجرم کو دس سال تک قید اور اَرش کی ادائیگی کی سزا دی جا سکتی ہے، جو متاثرہ شخص کو قابلِ ادائیگی ہے۔22

اس ایکٹ نے تیزاب سمیت گلانے سڑانے والے مواد سے پہنچنے والے زخم کے لیے بھی سزا تجویز کی ہے۔ شامل کی جانے والی نئی دفعہ 336-ب کے مطابق پہنچنے والے زخم کی گہرائی اور نوعیت سے قطع نظر تیزاب سے حملہ کرنے والے مجرم کو قید کی سزا جو 14 سال سے کم نہیں ہوگی، دی جائے گی جب کہ اس پر جرمانہ بھی لاگو ہوگا جو دس لاکھ روپے سے کم نہیں ہوگا۔

یہ درست ہے کہ تیزاب سے ہونے والا زخم دوسرے زخموں سے مختلف ہوتا ہے، اور زیادہ تر واقعات میں جلد کے ریشوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے، گوشت گل کر ہڈیاں ظاہر ہوسکتی ہیں اور بعض واقعات میں تحلیل بھی ہوسکتی ہیں۔ اس المناک اذیت کا نتیجہ موت نہ ہو تو بھی یہ متاثرہ فرد کے جسم اور ذہن پر مستقل اثرات چھوڑتی ہے۔ اس درد اور تکلیف کا احساس مجرموں کے لیے سخت ترین اور غیر لچک دار سزاؤں کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ کیا ان سے متاثرہ فرد کو وہ فائدہ پہنچے گا جس کی اسے ضرورت ہے، اور کیا کم از کم دس لاکھ روپے جرمانے کا براہِ راست فائدہ اسے پہنچے گا، کیونکہ یہ

رقم تو بہرحال قومی خزانے میں جمع ہوجائے گی۔

اگرچہ مجموعہ تعزیرات میں قصاص کا قانون موجود ہے لیکن پاکستان میں قصاص کے قانون پر عملدرآمد اصلاً لاگو ہی نہیں کیا گیا۔ زیر بحث ایکٹ نے تو اس کا ذکر کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ اصولاً ہونا تو یہی چاہیے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے کو شدید جسمانی اور ذہنی تکلیف میں مبتلا کیا ہے، یا اس مرد یا خاتون کو مستقل معذوری یا جسمانی بیماری میں مبتلا کیا ہے تو اس کو اسی تکلیف میں مبتلا کیا جائے۔ اسلام میں جلانے کے ذریعہ قصاص سے منع کیا گیا ہے،[23] پھر بھی شریعت کے احکامات کے مطابق قصاص کا اطلاق کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر تیزاب کے حملے میں ایک عورت کی آنکھ ضائع ہوجاتی ہے، اس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے اور اس کے ابرو جل جاتے ہیں تو اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو 334 کے تحت آنکھ کے لیے قصاص دینے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اور دفعہ 336 کے تحت شکل بگاڑنے کے لیے 10 سال تک قید اور بالوں کو نقصان پہنچانے پر مزید 3 سال قید اور دیت کی رقم کے مساوی اَرش (جو 10 لاکھ روپے سے زیادہ ہے) ادا کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔ یہ سزا مزید جرائم کی روک تھام میں عمر قید سے زیادہ مؤثر ہوگی۔ علاوہ ازیں قانون کی ان اسلامی دفعات پر عمل سے متاثرہ فرد کو ایک معقول رقم حاصل ہوجائے گی جس کو وہ علاج معالجہ اور دوسری ضروریات زندگی کے لیے استعمال کر سکے گی۔ اس کا ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ بعض واقعات میں متاثرہ شخص کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا، جب تک جرم کے ارتکاب کرنے والے کے ساتھ وہی معاملہ نہ کیا جائے، جیسا اس نے متاثرہ فرد کے ساتھ کیا تھا۔ حال ہی میں ایران کی ایک خاتون نے بدلے میں اس شخص سے آنکھ کے بدلے آنکھ کا مطالبہ کیا ہے جس نے اس کے چہرے کو بگاڑنے اور اس کو اندھا کرنے کے لیے اس کے چہرے پر تیزاب کا ایک جار پھینک دیا تھا۔[24] اسلامی قانون کی روشنی میں یہ بات بہرحال سامنے رہنی چاہیے کہ قصاص کی صورت میں اس امر کا ہر وقت امکان رہتا ہے کہ متاثرہ فرد سزا پانے والے کو ہمدردی کے جذبے کے تحت یا مالیاتی پیشکش پر مجرم کو معاف کردے۔[25]

جرم کی سزا لازم ہوتی ہے جو اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں کو تکلیف پہنچائے اور اسے مزید جرائم کا ارتکاب کرنے سے روکے، لیکن مجرمانہ نفسیات کا مقابلہ مختلف سطحوں پر زندگی کے مختلف شعبوں

میں مسلسل اقدامات کے ذریعہ کرنا ہوگا۔ پالیسی سازوں کو جاننا ہوگا کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو معاشرے کے بعض افراد کو اس ظلم اور بربریت کی طرف لے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ نقصان پہنچانے کے لیے یہ سنگین اور تکلیف دہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس قانون کی منظوری کے بعد بھی رپورٹ کیے جانے والے واقعات میں کمی نظر نہیں آئی۔26 درحقیقت اقتدار پر فائز لوگوں کو ہر مجرمانہ فعل کے لیے محض سزائیں تجویز کرنے کی روِش سے آگے بڑھ کر سوچنا ہوگا۔ تعلیم، آگاہی اور تربیت کے ساتھ عملی مثالوں کو فروغ دینا اور قانون کی عمل داری و یقینی بنانے کے لیے مجموعی ماحول بہتر بنانے کی جامع حکمتِ عملی پر توجہ کی ضرورت ہے۔

سفارشات

- یہ قانون اچھی کوشش ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے، لیکن ضرورت ہے کہ اس کا دوبارہ جائزہ لیا جائے تاکہ قانون سازی کو تعزیرات کے ضابطے کے مجموعی خاکے کے مطابق لایا جائے، جس کی بنیاد قصاص اور دیت کے قوانین ہیں۔

- حکومت کو اس موضوع پر جامع قانون سازی کے عمل کو جلدی مکمل کرنا چاہیے تاکہ معاملے کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ممکن ہو اور جو ایک طرف مزید جرائم کے لیے سدّ راہ ہو تو دوسری طرف ایسے ضابطے بھی ترتیب دے جو تیزاب اور دوسرے جلانے والے مواد کی دستیابی اور ان کے مجرمانہ استعمال کو روک سکے۔ اس کے بعد صوبائی اور مقامی سطحوں پر بھی متعدد اقدامات کرنا ہوں گے۔ اس غیر انسانی عمل کے خاتمے کے لیے سب سے زیادہ ضروری سیاسی ارادہ اور نیت ہے۔

- اس قانون سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون سازوں نے تیزاب کے حملوں میں موجود وحشت اور سنگ دلی کا احساس کر لیا ہے اور ناقابل ردّ و بدل سخت سزاؤں کی ضرورت محسوس کر لی ہے۔ قانون سازوں اور عدلیہ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اسلام کے دیے گئے تعزیری قوانین نہ صرف متأثرہ شخص کو سہولت فراہم کرتی اور مجرم کو اس درد اور تکلیف کا احساس دلاتی ہے جو اس کے عمل کی وجہ سے پہنچتا ہے، بلکہ مستقبل میں ایسے جرائم سے مؤثر رُکاوٹ کا سبب بھی بنتی ہے۔

تیزاب پھینکنے اور جلانے کے جرم کا بل 2012ء

یہ بل فوجداری قانون (دوسرے ترمیمی) ایکٹ 2011ء کی منظوری کے بعد تیزاب اور جلنے سے ہونے والے تشدّد کے مکمل خاتمے کے لیے اگلے قدم کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اور اس کا مقصد جرم کے ان پہلوؤں کا ازالہ تھا جن کا احاطہ مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں سادہ ترمیم سے نہیں کیا جا سکتا تھا مثلاً تفتیشی طریقہ کار، متاثرین اور گواہوں کی حفاظت، سماعت کا طریقہ، متاثرہ فرد کی بحالی اور اس کو قانونی سہولتوں کی فراہمی، مالی مدد دینے اور نگرانی کے طریقے وغیرہ۔ بل میں تیزاب کے حملے (جو گلانے سڑانے والے مواد یا تیزاب سے ہو) اور آگ سے جلانے کے حملے (جو آگ یا دوسرے گرم مواد سے ہو) اور جس میں اگر متاثرہ شخص کی موت واقع ہو جائے، کے لیے موت یا عمر قید کی سزا تجویز

عنوان: تیزاب پھینکنے اور جلانے کے جرم کا بل 2012ء
پیش کار: عطیہ عنایت اللہ، پاکستان مسلم لیگ (ق)
تاریخ: 18 دسمبر 2012ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

کی گئی تھی۔ جان بوجھ کر تیزاب اور جلانے کے حملے سے زخم پہنچانے کے لیے موت یا عمر قید کی سخت سزا کی تجویز دی گئی۔ اس قانون کے تحت جرم کا ارتکاب کرنے کی کوشش، کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ سات سال کی قید اور -/100,000 (ایک لاکھ) روپے جرمانے کی سزا کا سزاوار قرار دے سکتی تھی۔ جرم میں مالی مدد کرنے، جرم میں تعاون کرنے اور ساتھ مل کر جرم کرنے کے لیے بھی سزا تجویز کی گئی۔ تجویز کیا گیا کہ اس قانون کے تحت تمام جرائم قابلِ دست اندازی پولیس اور نا قابلِ مصالحت اور نا قابلِ ضمانت ہوں۔ یہ بھی کہا گیا کہ مجرم سے وصول ہونے والے جرمانہ کی رقم کا کچھ حصہ متاثرہ شخص کو معاوضے کے طور پر ادا کیا جائے گا۔ بل کے مطابق تیزاب یا جلانے کی شکایت، پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر یا عدالت میں استغاثہ کے ذریعے درج کرائی جا سکتی تھی۔ تیزاب اور جلانے کے فعل سے متاثر فرد کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والے کی یہ قانونی ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ واقعہ کی پولیس کو رپورٹ کرے اور ایسے حملے کا شروع سے ریکارڈ رکھے۔ طبی عملے کے فرد کی یہ ذمہ داری بھی بتائی گئی کہ وہ زخموں کی تصویریں بنائے جو شہادت کا حصہ تصور کی جائیں۔ تصویریں لینے میں ناکامی پر ایسے شخص کے خلاف تادیبی کارروائی ہو سکتی تھی۔ متاثرہ شخص کو حکومت کے تحت چلنے والے تمام اسپتالوں اور دیگر سہولتوں میں مفت علاج فراہم کرنے

کی تجویز بھی بل کا حصہ تھی۔

یہ تجویز کیا گیا کہ اس جرم کی تفتیش ایسا پولیس افسر کرے گا جو انسپکٹر کے عہدے سے کم مرتبے کا نہیں ہوگا، جب کہ وہ تفتیش کو ایف آئی آر درج کیے جانے کے 14 دن کے اندر مکمل کرنے کا پابند ہوگا۔ تفتیش کی مدت میں مزید 14 دن کی توسیع عدالت کی اجازت کے ساتھ کی جا سکے گی۔ اگر تفتیش میں 60 دن سے زیادہ لگتے ہیں تو اس کا اثر متعلقہ جج یا تفتیشی افسر کی کارکردگی کے سالانہ جائزے پر پڑے گا۔ اگر جرم کی سماعت کرنے والی عدالت کی رائے میں تفتیش ضروری توجہ اور کوشش کو ظاہر نہیں کرتی تو عدالت سرسری سماعت کے بعد تفتیشی افسر یا دوسرے متعلقہ افسر کو قید کی سزا دے گی، جو دو سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوں گی۔ عدالت میں مقدمے کی سماعت روزانہ کی بنیاد پر ہوگی اور سات دن کے اندر مکمل کرنا ہوگی۔ عدالت سماعت کے دوران متاثرہ شخص کی درخواست پر حکومت کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ متاثرہ (مذکر یا مؤنث) فرد کو ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے عبوری امداد دے تا کہ وہ ہونے والے اخراجات اور نقصانات کو پورا کر سکے۔ اگر گواہ درخواست کرے تو عدالت گواہوں کے تحفظ کے لیے بھی اقدامات کا حکم دے سکتی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ تیزاب یا جلانے کے جرم کا ارتکاب کرنے کا ذمہ دار شخص موت یا عمر قید کا مستوجب ہوگا، اگر ایسے حملے سے کسی شخص کی موت واقع ہوگئی ہو، اور اگر ایسے حملے سے جان بوجھ کر زخمی کیا گیا ہو تو عمر قید سخت کی سزا دی جائے گی۔

بل نے تیزاب اور جلانے کی جرائم کے جائزے کے لیے وفاقی سیکرٹری داخلہ کی سربراہی میں ایک بورڈ کے قیام کی تجویز بھی پیش کی جو قانون کے مؤثر نفاذ، متاثرہ افراد کے علاج، بحالی اور قانونی امداد کی پالیسیاں وضع کرنے، تعلیمی پروگرام اور مہمات منظّم کرنے، ان معاملات پر تحقیق کرنے، تیزاب کے مجرمانہ استعمال کو روکنے کے قواعد مرتب کرنے اور قانون کا راستہ بنانے کے لیے تمام ضروری قدامات کرنے کا ذمہ دار ہوتا۔ تجویز کیا گیا کہ حکومت بورڈ کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایک آزاد فنڈ بھی قائم کرے گی، جو متاثرہ فرد یا ان کے زیر کفالت افراد کو اس وقت تک کی بنیادی ضروریات، قانونی امداد، رہائش اور گزارے کے لیے اخراجات فراہم کرے گا جب تک متاثرہ فرد یا زیر کفالت افراد میں سے کوئی مالی طور پر آزاد اور خاندان کی مالی امداد کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں تیزاب پھینکنے اور جلانے کے جرائم کے بڑھتے ہوئے واقعات کے ذکر کے علاوہ جرم کی پیچیدہ نوعیت اور سماجی عوامل کے پیش نظر ایک مخصوص اور جامع قانون سازی کی ضرورت کو اُجاگر کیا گیا۔ اس میں دستورِ پاکستان کے اصولوں اور ان بین الاقوامی معاہدوں کا ذکر کیا گیا ہے جن پر پاکستان نے دستخط اور ان کی توثیق کی ہے، اور جن میں انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ، بچے کے حقوق کا کنونشن، خواتین کیخلاف امتیاز کے خاتمے کا کنونشن اور سماجی و سیاسی حقوق کا بین الاقوامی کنونشن شامل ہیں۔

مشاہدات

فوجداری قانون (دوسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء (2011ء کا 25واں ایکٹ) جلانے والے مواد کے ذریعہ ہونے والے زخم کو ایسا جرم قرار دیتا ہے جس کی سزا عمر قید یا کم از کم 14 سال قید اور کم از کم جرمانہ -/10,00,000 (دس لاکھ) روپے ہوگا۔ گلانے اور سڑانے والے مواد کی تعریف ایک ایسے مواد کے طور پر کی گئی ہے جو انسانی جسم کے کسی عضو کو تباہ کرے، زخمی کرے، بدصورت کردے، یا ختم کردے اور اس میں ہر قسم کا تیزاب، زہر، آتشگیر مواد، گرم ہونے والا مواد، موذی اور نقصان دہ اشیاء، آتشیں یا دوسرا کیمیائی مواد جو گلانے سڑانے کا اثر رکھتا ہو اور انسانی جسم کے لیے مہلک ہو۔

اس بل نے تیزاب کے حملے اور جلانے کے حملے کے درمیان تفریق کی ہے لیکن ان سے متعلق یکساں اقدامات تجویز کرتا ہے۔ اس میں تجویز کی گئی سزا اس سے مختلف ہے جو مذکورہ بالا قانون میں دی گئی ہے۔

تبصرہ

اوپر ذکر کردہ ایکٹ کے ذریعہ تیزاب کے حملوں اور اس سے تعلق رکھنے والے واقعات کو زخم کے معمول کے جرائم سے الگ قابل سزا قرار دینا اس سنگین ترین جرم کی روک تھام کی طرف اہم مگر ناکافی قدم ہے۔ بعض خبروں کے مطابق اس قانون کے منظور ہونے کے بعد بھی تیزاب سے تشدد کے واقعات میں اضافہ دیکھا گیا۔[27] اس لیے مزید جامع قانون سازی کی ضرورت ہے۔ تاہم ایسی قانون سازی کو پہلے

سے منظور شدہ قانون پر استوار کر کے اسے مضبوط اور مفید تر بنانا چاہیے اور ابہام پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر پہلے قانون نے بعض نقائص ظاہر کیے ہیں جو بہتری چاہتے ہیں، تو ان کو قانون میں ترمیم کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے، یا اس قانون کو منسوخ کر کے بہتر اور مزید جامع اور مؤثر قانون لا کر ان کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر اس بل میں جرم کی جو تعریف کی گئی ہے وہ پہلے سے قانون میں موجود ہونے کی وجہ سے غیر ضروری بھی ہے اور موجود تعریف کی نسبت وسعت اور جامعیت میں کم تر بھی۔ جہاں تک سزاؤں کا تعلق ہے، جرم سے متاثرہ شخص کی موت واقع ہوجانے پر جرم کے مرتکب کو موت کی سزا دینا زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس بل میں تجویز کیا گیا تھا۔ اسی طرح بل اس جرم میں تعاون، اکسانے اور تیزاب اور جلانے کے حملے کی کوشش کو بھی احاطۂ جرم میں شامل کرتا ہے، جو ایکٹ میں مذکور نہیں ہیں اور ان پر تعزیراتِ پاکستان کے عام ضابطہ کے مطابق عمل ہوگا۔

زیرِ جائزہ بل کا مقصد تیزاب اور جلانے کے جرم کے خاتمے کے لیے رپورٹ درج ہونے اور متاثرہ شخص کے ابتدائی طبی علاج سے لے کر طویل علاج اور اس کی غذائی ضروریات کی فراہمی تک ایک مکمل نظام کا قیام تھا۔ تاہم یہ زیادہ پرجوش اور کچھ غیر حقیقت پسندانہ محسوس ہوتا ہے بالخصوص تفتیش اور سماعت کے لیے وقت کے تقرر اور مقررہ وقت سے زیادہ لینے پر سخت اقدامات سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تجویز مقدمہ بازی، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے بدعنوان، غیر حساس اور غیر منصفانہ رویوں اور عدالتوں میں طویل التواء سے متعلق شکایات کا نتیجہ ہے۔ اگر ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء میں تجویز کردہ طریقہ کار پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں نگرانی اور توازن کا نظام موجود ہے۔ اس بل میں، مثال کے طور پر، یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اگر ایک شخص پولیس کے انکار کی وجہ سے اپنا مقدمہ درج کرانے میں ناکام ہوجاتا ہے تو وہ اپنی شکایت براہ راست عدالت میں درج کرا سکتا ہے۔ درحقیقت ایسی صورت میں رائج الوقت قانون پہلے ہی متبادل حل فراہم کرتا ہے۔ قابلِ دست اندازی پولیس کے مقدمہ میں پولیس کے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کی صورت میں متاثرہ شخص سیشن جج سے (جو ضابطہ فوجداری کی دفعہ 22-اے کے تحت پولیس افسر کو حاصل اختیارات استعمال کرسکتا ہے) یا ضابطہ کی دفعہ 156 کی ذیلی دفعہ (3) کے تحت تفتیش کا حکم دینے کے لیے مجسٹریٹ سے رابطہ کرسکتا ہے، یا عدالت

میں براہِ راست اسی ضابطہ کی دفعہ 200 کے تحت شکایت درج کرا سکتا ہے۔[28] اس طرح پولیس پر ایک عدالتی نگرانی پہلے ہی قائم کر دی گئی ہے۔ اگر یہ طریقہ کار مؤثر نہیں ہے تو مسئلہ قانون میں نہیں بلکہ علم درآمد کے دائرے میں ہے۔

بالفرض یہ پورا طریقِ کار اپنے الفاظ اور ان کی روح کے مطابق بروئے کار بھی لایا جاتا ہے تو بھی بیشتر صورتوں میں تفتیش کو 14 دن کے اندر اور مقدمے کی سماعت کو ایک ہفتے میں مکمل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ تفتیش اور سماعت کے عمل میں درپیش مسائل اس قدر اہم اور پیچ در پیچ ہوتے ہیں کہ انہیں عجلت میں سلجھانا ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر عائلی قوانین کے ایکٹ مجریہ 1964ء کی دفعہ 12-الف کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ کے تحت عائلی عدالت کے لیے مقدمے کے اندراج کی تاریخ سے 6 ماہ کے اندر اس کا فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ مقدمے کا کوئی بھی فریق ضروری کارروائی کے لیے ہائیکورٹ میں درخواست دائر کر سکتا ہے۔ لیکن عملاً بیشتر صورتوں میں عائلی عدالتوں کے لیے مقررہ مدت میں مقدمات کی سماعت مکمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یعنی قانون میں مدت مقرر ہونے اور ہائیکورٹ کی مداخلت کا امکان ہونے کے باوجود ایسا نہیں ہو پاتا جب کہ بالعموم عائلی مقدمے بہت زیادہ تفتیش طلب بھی نہیں ہوتے۔

بل میں دی گئی تجویز تیزاب اور جلانے کے جرائم کی روک تھام، نگرانی اور ان پر قابو پانے کے پورے نظام کے طور پر اور متاثرین کی دیکھ بھال کے لیے ایک مخصوص بورڈ اور فنڈ کا قیام اس مسئلہ کو اجاگر کرنے، مزید توجہ حاصل کرنے اور بیداری پیدا کرنے میں مددگار ہو سکتی تھی۔ اس سے متاثرین اور ان کے خاندانوں کو کچھ مدد فراہم ہو جائے گی اور معاشرے میں بیداری اور احساس کے فروغ میں بھی معاون ہوتی۔

اگر یہ موضوع دوبارہ زیرِ بحث آتا ہے اور اسی انداز میں اس پر قانون سازی کی جاتی ہے تو یہ بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے ایسے کسی قانون کا اطلاق صرف دارالحکومت اسلام آباد کے علاقے تک محدود رہے گا۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد یہ موضوع صوبائی حکومتوں کے دائرہ کار میں آتا ہے، اور ہر صوبے میں الگ الگ واضح قانون سازی کرنا ہوگی۔ اس لحاظ سے پورے ملک میں ایک

جامع اور یکساں قانون اختیار کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر مشاورت ضروری ہے۔

اس بل کی بیشتر خوبیوں کے باوجود طریقہ کار کے موجودہ مسائل اور ان کے حل کے لیے گہرے غور و فکر کی گنجائش اور ضرورت موجود ہے۔ اس موضوع کو دوبارہ زیرِ غور لاتے ہوئے اس مسوّدے پر نظرِ ثانی اور اس کے متن اور سوچ کی مزید وضاحت مفید ہوگی۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے بل کی ان شقوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو سزاؤں سے متعلق ہیں۔ ان شقوں کے مطابق اگر تیزاب یا جلانے کے حملے سے کسی شخص کی موت واقع ہو جائے تو موت یا عمر قید اور تیزاب اور جلانے کے لیے جان بوجھ کر حملہ کرنے کی صورت میں زخم آنے پر موت یا عمر قید بامشقت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ تیزاب اور جلانے کے حملے کا نتیجہ ہمیشہ دو سزاؤں، یعنی موت یا عمر قید کی سزا کی صورت میں نکلتا ہے، خواہ اس سے موت واقع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یا موت کی وجہ قتلِ عمد تھی یا قتلِ خطا۔ زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آخر الذکر معاملے میں زخم کے لیے تو قیدِ سخت کی سزا تجویز کی گئی، جب کہ موت واقع ہو جانے کی صورت میں قید محض بھی دی جا سکے گی۔ اسی طرح تیزاب اور جلانے کے حملے کے لیے تو جرمانے کی سزا کا ذکر نہیں ہے لیکن تیزاب پھینکنے کے جرم کی کوشش کرنے، مدد کرنے، تعاون کرنے اور گٹھ جوڑ کرنے کی سزا دس لاکھ روپے جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ بل کی ایک اور شق کے مطابق جرمانے کی رقم کا ایک حصہ متاثرہ شخص کو معاوضے کے طور پر ادا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پوری زندگی کی تکلیف، اذیت اور مشکلات کا معاوضہ صرف چند ہزار روپے ہوگا۔ اور وہ بھی اصل مرتکب جرم نے نہیں بلکہ شریک جرم اور اس میں مدد کرنے والے کو ادا کرنا ہوگا۔ یہاں دوبارہ یاد دلانا مفید ہوگا کہ قصاص اور دیت کے اسلامی قانون کا اطلاق انسانی جسم کے خلاف جرائم کے امتناع اور روک تھام کا بہترین راستہ ہے۔

سفارشات

- یہ مسودہ موضوع پر مفید بنیاد فراہم کرتا ہے لیکن اس لعنت کی روک تھام کے لیے مفید سوچ کا حامل ہونے کے باوجود بہتری کا متقاضی ہے۔
- اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قانون کی کتاب میں تحریر شدہ قوانین، ان پر عمل کرانے

والے، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد اور مجاز اداروں کے عزم کی عدم موجودگی میں محض الفاظ ہیں۔ اداروں کی خراب کارکردگی سے پیدا ہونے والے مسائل محض قانون سازی سے حل نہیں ہو سکتے۔ سرکاری کارپردازوں میں حقیقی تبدیلی لانے کے لیے قانون، انصاف اور عوام کے حقوق کے ساتھ احساس ذمہ داری اور سچی وابستگی پیدا کرنے کے لیے تربیت، ترغیبات، احتساب اور مقصد سے وابستگی اور لگن ہیدا کرنے کے لیے عملی اقدامات کا ایک مربوط پیکج بنانے کی ضرورت ہوگی۔

- حکومت کو وفاقی اور صوبائی سطحوں پر تیزاب اور جلانے سے متعلق جرائم کو کنٹرول کرنے، تمام متعلقہ ذمہ داروں کو اعتماد میں لینے، واضح مطالعہ کرنے اور ان کی روک تھام کے لیے نفاذ کا طریق کار وضع کرنے اور ان جرائم کو روکنے اور متاثرین کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے کے لیے واضح اور جامع قانون سازی کرنے کے لیے مشاورتی عمل کو شروع کرنا چاہیے۔ ان میں تیزاب اور گلنے سڑنے والے مواد کی پیداوار، استعمال، ذخیرہ اور خرید و فروخت کے عنوانات بھی شامل ہونا چاہییں۔

قذف کا جرم

قذف کا جرم (نفاذ حد) کا (ترمیمی) بل 2008ء

اس بل کا مقصد (نفاذ حد) آرڈی نینس مجریہ 1979 میں تین نئی دفعات 18-الف، 18-ب اور 18-ج کو شامل کرنا تھا جن میں تجویز کیا گیا تھا کہ

۱۔ قذف کے مقدمے کو اس کے قائم کرنے کے 4 ماہ کے اندر مکمل ہونا چاہیے۔

۲۔ قذف کے مقدمے کی کارروائی کا کوئی حصہ عدالت کی واضح اجازت کے بغیر اخبارات یا الیکٹرانک میڈیا میں عام نہ کیا جائے۔

۳۔ قذف کے مقدمے کے شکایت کنندہ یا ملزم کو، اگر وہ غریب یا نادار ہو، وکیل فراہم کیا جائے۔

اس بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وہ خواتین جو قذف کے جرم (نفاذ حدود) آرڈی نینس مجریہ 1979 کے تحت زنا بالجبر یا ایسے ہی جرائم کا شکار ہوتی ہیں یا قذف کے جھوٹے الزام میں ملوث کی جاتی ہیں، ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف مقدمات کا اندراج کرانے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پولیس تفتیش مکمل کرنے میں لیت ولعل سے کام لیتی ہے اور اس کی عدم دلچسپی متاثرہ افراد کی مشکلات میں اضافہ کرتی ہے۔ استغاثہ کا مقدمے کی سماعت مکمل کرنے میں ٹال مٹول کا طرز عمل ان کی تکالیف میں مزید اضافے کا سبب بنتا ہے۔''

عنوان: قذف کے جرم (نفاذ حد کا (ترمیمی) بل 2008ء
پیش کار: کشمالہ طارق اور 7 دیگر ارکان قومی اسمبلی، پاکستان مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 12 اگست 2008ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

بل کا مقصد زنا بالجبر اور قذف کے متاثرہ فرد کو ایف آئی آر کے اندراج اور پولیس کی تفتیش کے علاوہ عدالت تک براہ راست رسائی بھی فراہم کرنا ہے۔

مشاہدات

قذف کی تعریف قذف کے جرم (نفاذ حد) آرڈی نینس 1979 میں، کسی شخص پر اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تحریری یا زبانی الفاظ، اشاروں یا کسی اور قابلِ دید فعل کے ذریعہ زنا کا جھوٹا الزام لگانا، کی گئی ہے۔ اس آرڈی نینس کے تحت کارروائی اس شخص یا اس کے جانشین یا ورثا کی جانب سے عدالت میں استغاثہ پر شروع کی جاسکتی ہے، جس کے خلاف قذف کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

تبصرہ

اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر کے مطابق انسان کی عزت اور اس کا وقار اس کے قیمتی ترین اثاثوں میں سے ایک ہے، جس کا ہر قسم کے حالات میں تحفظ کرنا اور برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں، جہاں انسان کی کردار سازی میں تقویٰ اور حیا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، زنا بدترین اور انتہائی نفرت انگیز جرائم میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے کسی رکن کے خلاف زنا کا جھوٹا الزام لگانا سنگین ترین جرائم میں سے ایک تصور کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ

سزا مقرر کی ہے کہ اگر ایک شخص کسی پر زنا کا الزام لگاتا ہے اور پھر وہ اپنے الزام کو سچ ثابت کرنے کے لیے چار گواہ پیش کرنے میں ناکام رہتا ہے، تو اسے شریعت کے احکامات کے مطابق 80 کوڑوں کی سخت سزا دی جائے گی۔[29]

دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی فرد، بالخصوص، خواتین کو بدنام کرنے اور اس کی عزت کو داغدار کرنے کے لیے زنا کرنے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ اگر معاملہ عدالتی چارہ جوئی تک پہنچے تو بیشتر صورتوں میں ایسے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے درکار شہادت پیش نہیں کی جاسکتی۔ ایسے میں ملزم تو بری ہو جاتا ہے لیکن اس وقت تک اس خاتون یا مرد کو سماجی حوالے سے شدید نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے، جس پر زنا کا الزام لگایا گیا ہو۔ ایسی صورت میں قذف کے جرم (نفاذ حد) آرڈی نینس مجریہ 1979 نے متاثرہ شخص کو زنا کا الزام لگانے والے کے خلاف قذف کی کارروائی کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لیکن اس مقدمے کی سماعت میں بعض اوقات برسوں لگ جاتے ہیں اور اذیت سے نجات پانے کے لیے درج کرایا گیا مقدمہ بجائے خود ایک تکلیف دہ عمل بن جاتا ہے۔ یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ کوئی ایسی بات جس کا تعلق اخلاقیات سے ہو، معاشرے اور بالخصوص میڈیا کی غیر ضروری دلچسپی کا محور بن جاتا ہے۔ ایسے مقدمے کی سماعت کی کارروائی کی اشاعت بھی شکایت کنندہ کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ روبیہ مہدی نے بالکل ٹھیک نشان دہی کی ہے کہ آرڈیننس کا مقصد زنا کے جرم (نفاذ حدود) آرڈیننس مجریہ 1979 کے غلط استعمال کو روکنا تھا تاکہ لوگ زنا کا الزام لگانے سے پہلے بار بار سوچ لیں، لیکن الزام لگانے میں کسی رکاوٹ کی عدم موجودگی اور قانون نافذ کرنے والے کارپردازوں کی نااہلی اور طویل التوا کی بناء پر متاثرہ فرد کی شہرت کو اتنا نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے کہ قذف آرڈیننس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔[30]

ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بل کے محرکین نے تین اہم تجاویز پیش کی تھیں۔ اگرچہ ان تجاویز کو اپنا لینے سے متاثرہ افراد بالخصوص خواتین کو سہولت مل سکتی تھی لیکن بدقسمتی سے اس بل کو پارلیمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ عوامی مفاد میں تجویز کردہ قانون سازی کے حوالے سے عدم دلچسپی پر ایسا رویہ عوام کو قانون سازوں کی ترجیحات کے بارے میں حیران کر دیتا ہے۔ مزید حیرت انگیز تو یہ بھی ہے کہ خود محرکین

بھی متعدد فورَم اور مواقع کی موجودگی کے باوجود اپنے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ سرگرمی نہیں دکھاتے۔

بہرحال، اس بل کے بیان اغراض ومقاصد میں پولیس کے پاس قذف کا مقدمہ درج کرانے میں مسائل اور پولیس کی سست روی کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا تھا کہ اس کا مقصد متاثرہ افرد کو عدالتوں تک بھی براہ راست رسائی فراہم کرنا ہے، تاہم افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ اہم نکتہ بل کے متن میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قذف کے جرم کے (نفاذ حد) آرڈیننس مجریہ 1979 کی دفعہ 8 کے مطابق قذف کا مقدمہ عدالت میں بطور استغاثہ ہی درج کرایا جاسکتا ہے۔ یہ جرم قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے اور پولیس خود سے مقدمہ درج نہیں کرسکتی۔

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلامی تصور کے مطابق قذف کی کارروائی کے لیے الگ عدالتی سماعت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر زنا کے مقدمے کی سماعت مکمل ہونے پر عدالت مطمئن ہے کہ زنا کا الزم جھوٹا اور الزام کے حق میں کافی ثبوت کے بغیر تھا، تو عدالت کو مزید سماعت اور متاثرہ فرد کو ذہنی تکلیف پہنچائے بغیر قذف کی حد جاری کر دینی چاہیے۔ جب ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بن امیہ نے آپؐ سے بیان کیا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک دوسرے شخص کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ وہ شریعت کے مطابق مطلوبہ شہادت پیش کریں یا قذف کی سزا کے لیے تیار ہو جائیں۔[31] آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ اگر ہلال شہادت لانے میں ناکام رہا تو پھر بیوی کو قذف کی کارروائی درج کرانے کا حق ہوگا۔[32]

مزید برآں موجودہ قانون میں قذف کی تعریف شکایت کنندہ سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ ثابت کرے کہ جس شخص پر زنا کا جو جھوٹا الزام لگایا گیا تھا اس کا مقصد اس کی شہرت کو نقصان پہنچانا اور اس کے جذبات کو مجروح کرنا تھا۔ جبکہ قرآن مجید کی متعلقہ آیت[33] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث سے ایسی کسی ضرورت کا اشارہ نہیں ملتا کہ اگر الزام لگانے والا جرم کو ثابت نہ کر سکے تو حد قذف کے لیے پہلے اُس کی نیت کا تعین کیا جائے گا۔ فقہ کے ممتاز فتاویٰ میں بھی حد قذف کے نفاذ کے لیے صرف تین

شرائط کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ہوش وحواس، بلوغت اور چار گواہوں کی عدم پیشی شامل ہیں۔[34] یہ اضافی شرط جو قذف آرڈیننس مجریہ 1979ء میں موجود ہے، ان وجوہ میں سے ایک ہے، جن کی بنا پر شکایت کنندگان ان لوگوں کو سزا نہیں دلا سکے جنہوں نے ان پر زنا کا الزام لگایا تھا۔

سفارشات

بل میں دی گئی تجویز اس لائق ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ اور بغیر کسی تاخیر کے غور کیا جائے کیونکہ اس سے شکایت کنندگان کو کچھ سہولت حاصل ہو جائے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت اپنی جگہ برقرار ہے کہ پورے قانون کو شریعت کے احکامات کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ زنا کا الزام لگانے کے حق میں شہادت کی پیشی میں ناکامی پر کسی الگ سماعت کے بغیر قذف کی کارروائی خود بخود ہو جائے۔

اس موضوع سے متعلق بالعموم پیش کی جانے والی نصوص میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ قذف کا ارتکاب صرف اس صورت میں ہوگا جب زنا کے الزام کا مقصد کسی شخص کی شہرت کو داغدار کرنا یا اس کے جذبات کو مجروح کرنا ہو۔ گویا ایسی کوئی شرط شریعت کے منافی محسوس ہوتی ہے نیز اس طرح متاثرہ فرد کے لیے انصاف کے حصول میں رکاوٹ بھی پیدا ہوتی ہے۔

خواتین دشمن کارروائیاں

آگے آنے والی بحث دو مسوداتِ قانون سے متعلق ہے جن کے ذریعہ تعزیراتی قوانین میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔ ان مسوداتِ قانون کا مقصد جہیز جیسی معاشرتی اور قبائلی برائیوں اور باہمی لڑائی جھگڑوں اور تنازعات کو طے کرنے کے لیے شادیوں میں عورتوں کو دینے جیسی رسوم کی روک تھام تھا جو عورتوں کی زندگیوں کو بُری طرح متاثر کر رہی ہیں۔

فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء

یہ بل خاندان سے متعلق مسودات قانون اور دیگر قوانین کے ساتھ (باب دوم میں) ذکر کیا گیا تھا

اور وہاں اس میں موجود اس تجویز پر بحث کی گئی تھی جس کا مقصد شادی کو خفیہ رکھنے کو ایک فوجداری جرم قرار دلوانا تھا۔ یہاں اس بل کی ایک اور شق پر بحث کی جارہی ہے جس میں ''مبنی بر جہیز قتل'' کے تصور کو متعارف کرایا جارہا ہے اور تجویز کیا گیا ہے کہ تعزیرات پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860 میں درج ذیل 360-الف کی دفعہ کو شامل کیا جائے۔

عنوان: فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء
پیش کار: ماروی میمن، پاکستان مسلم لیگ (ق)
بتاریخ: 14 اپریل 2009ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

''360-الف۔ مبنی بَر جہیز قتل:

۱۔ جب خلافِ معمول حالات میں کسی خاتون کی موت جلنے یا جسمانی زخم یا کسی دوسری وجہ سے واقع ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ موت سے فوراً پہلے اس کو اس کے شوہر یا شوہر کے کسی رشتہ دار نے جہیز کے مطالبہ کے سلسلے میں ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا تھا، تو ایسی موت کو مبنی بَر جہیز قتل قرار دیا جائے گا اور ایسے خاوند یا رشتہ دار کو موت کا باعث سمجھا جائے گا۔

۲۔ جو کوئی مبنی بر جہیز قتل کا ارتکاب کرے گا وہ قید کی سزا کا مستوجب ہوگا جو زیادہ سے زیادہ عمر قید اور کم از کم 7 سال ہوگی''۔

اغراض ومقاصد اور وجوہ کے بیان کے مطابق بل کا مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ ہے جن کو معاشرتی ناانصافیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس تجویز میں بل کی محرک کی جہیز سے متعلق تنازعات کے حوالے سے پریشانی ظاہر ہوتی ہے، جو بعض اوقات سنگین جرائم کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں اور ان کی روک تھام کے لیے خاص قانون سازی کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔

تبصرہ

برصغیر میں رائج رسم کے مطابق دلہن کو والدین اور رشتہ داروں کی طرف سے اس کی شادی کے موقع پر گھریلو اشیاء جائیداد اور تحائف دیے جاتے ہیں جو مجموعی طور پر جہیز کے نام سے مشہور ہیں۔ اس رسم کی جڑیں ہندو مذہب کی قدیم کتب میں ہیں اور یہ ہندوؤں کی شادی کی رسومات کا لازمی حصہ ہے۔[35] ایک

خیال یہ بھی ہے کہ یہ ایک طرح سے لڑکیوں کو خاندان کی جائیداد میں سے ان کا حصہ دینے کا طریقہ ہے۔ کیونکہ لڑکیاں اپنے والدین یا خاندان سے وراثت میں حق دار نہیں تصور کی جاتیں۔36

یہ سوچ اسلامی احکامات کے خلاف ہونے کے باوجود برصغیر کے مسلم معاشروں میں بھی رواج پا گئی ہے۔37 یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ اسلام میں شادی کے لیے تین چیزیں مطلوب ہیں: (۱) ایجاب و قبول، (۲) مہر کا تعین کرنا اور ادائیگی اور (۳) دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح کا انعقاد۔ چونکہ نکاح ناجائز تعلقات کی کی روک تھام کرتا اور زندگی میں پاکیزگی لاتا ہے اس لیے اسلام نے اس کو سادہ اور کم خرچ رکھا ہے۔ اگرچہ والدین پر یہ پابندی بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو تحائف نہیں دے سکتے، لیکن جہیز کے حوالہ سے نمائش اور اسراف سے بھرپور وہ رسمیں جو اس وقت رائج ہیں انہیں کسی طرح اسلامی مزاج اور روایات کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہیز اب والدین پر ناقابل برداشت بوجھ بن چکا ہے۔ بیشتر صورتوں میں اب جہیز کے ذیل میں ہر وہ چیز طلب کی جاتی ہے جو کسی نہ کسی طرح لڑکی کے والدین سے ہتھیائی جاسکتی ہو۔ بعض طبقات اور برادریوں میں تو عملاً سوئی اور کپڑوں سے لے کر گاڑی اور گھر تک ہر چیز اس میں شامل ہوتی ہے۔ اس روایت نے معاشرتی اور قانونی اعتبار سے متعدد قابل اعتراض رویوں کو جنم دیا ہے، جن میں بچی کی پیدائش کو ناپسند کرنا، ایسی دلہن کو نفرت سے دیکھنا اور اس کے نتیجے میں تشدد کا نشانہ بنانا جو دُلہا یا اس کے والدین کی خواہشات پر مبنی فہرست کی ہر چیز جہیز میں نہ لاسکی ہو، کم جہیز لانے پر طلاق دے دینا اور ایسے والدین کا اپنی لڑکیوں کی شادی کے لائق نہ پانا جو جہیز کی تیاری کے وسائل نہ رکھتے ہوں، شامل ہیں۔

قانوناً اس رسم کی قباحت کے پیشِ نظر پہلا اقدام 1967ء میں لیا گیا، جب جہیز کی نمائش پر پابندی کا قانون منظور کیا گیا۔ اس کو بعد میں 1976ء میں جہیز اور دلہن کے تحائف (پابندی) کے ایکٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس ایکٹ کے تحت قواعد بھی اسی سال بنا دیے گئے۔ ان کوششوں کا مقصد زیادہ تر نمائشی اقدامات کو محدود کرنا تھا۔ لیکن یہ کوششیں جہیز کی اشیاء کی مجموعی مالیت کے لیے کوئی حد نافذ نہ

کرسکیں۔اس کے برعکس اس رسم میں اضافہ ہی جاری رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ دلہن کے والدین سے توقعات کئی گنا بڑھ گئیں۔اس رسم کی جڑیں اب اس قدر گہری ہوچکی ہیں کہ اب معاشرے کا ایک بڑا طبقہ اسے محض والدین کی طرف سے اپنی بیٹی کو دیئے جانے والے تحائف کے طور پر نہیں بلکہ دلہا والوں کے حق کے طور پر جانتا، دیتا اور وصول کرتا ہے۔مزید برآں عورتوں کو اپنے ساتھ کافی جہیز نہ لانے پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس ''گناہ'' کے لیے بعض اوقات جینے کے حق سے انکار کردیا جاتا ہے۔

بل میں شامل تجویز کا مقصد مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں قتل کی ایک قسم کا اضافہ تھا، جو اس وقت اس فعل کو بالارادہ قتل (قتل عمد)، ایسا قتل جس میں نیت صرف شدید زخمی کرنے کی ہو (قتل شبہِ عمد)، اور غیر ارادی قتل (قتل خطا) میں تقسیم کرتا ہے۔گویا تعزیراتِ پاکستان میں قتل کو نیت کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے، سبب کے اعتبار سے نہیں۔اگر بل میں دی گئی تجویز پر عمل کیا جاتا ہے تو سبب کی بنا پر قتل کی اقسام کی طویل فہرست کو شامل کرنا ہوگا جیسے مثلاً جائیداد کی بنیاد پر قتل، دشمنی کی بنیاد پر قتل، حسد کی بنیاد پر قتل وغیرہ۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ جہیز سے متعلق قتل کے واقعات کو بالعموم قتل عمد ہی تصور کیا جاتا ہے اور عدالتیں موجودہ قانونی ڈھانچے کے مطابق مجرموں کو سزائیں سنا رہی ہیں۔

بہرحال بل میں دی گئی تجاویز ان معصوم اور بے گناہ نوجوان عورتوں کو درپیش مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کرانے کی ایک قابل تعریف کوشش تھی، جن کو بعض لوگوں اور خاندانوں کی ہوس یا اس وجہ سے کہ وہ شوہروں اور ان کے اہل خانہ کے غیر منصفانہ مطالبات کو پورا کرنے کے ذرائع نہیں رکھتی تھیں، مار پیٹ کر یا جلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

سفارشات

- بل میں موجود سفارش تعزیرات پاکستان کی مجموعی اسکیم سے مختلف اور ناقابل عمل بھی تھی تاہم جس مسئلہ کو اجاگر کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے۔اور اس کا تقاضا ہے کہ قانون ساز، انتظامیہ، سول سوسائٹی اور میڈیا ایسی کارروائیوں کی بیخ کنی کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں جو معاشرے کا طاعون بن رہی ہیں۔جہیز اور دلہن کے تحائف پر پابندی کا ایکٹ ایک فرسودہ قانون بن چکا ہے اور اس کو اب زیادہ

حقیقت پسندانہ اور عملی قانون سے بدل دینا چاہیے۔

● جہیز اور اس سے متعلق دوسری چیزیں ایک سماجی مسئلہ ہیں جس سے مناسب تعلیم اور بیداری کے ذریعہ نمٹا جاسکتا ہے۔ سماجی معاملات میں قانون سازی کے ذریعہ بہتری لانا اس وقت تک سعی لاحاصل ہے جب تک معاشرتی کوششوں کے ذریعہ قبولیت حاصل نہ کرلی جائے۔

فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء

عنوان: فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء
پیش کار: چوہدری پرویز الٰہی اور دیگر 7 ارکان قومی اسمبلی، پاکستان مسلم لیگ (ق)
تاریخ: 10 جون 2008ء
کیفیت: 26 دسمبر 2011 کو قانون بنا۔

تیرہویں قومی اسمبلی میں پاکستان مسلم لیگ کے پارلیمانی لیڈر پرویز الٰہی اور ان کی پارٹی کے دوسرے سات ارکان نے خواتین مخالف اقدامات کی روک تھام (فوجداری قانون ترمیمی) بل پیش کیا تھا جو بعد میں فوجداری قانون (تیسری ترمیم) کا ایکٹ 2011ء کے نام سے پاس ہوگیا۔ اس کا تعارف پہلے کرایا جاچکا ہے۔ اس ایکٹ میں متعدد سماجی اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے جو پاکستانی معاشرے میں خواتین کے مقام اور حقوق کو متاثر کررہے ہیں۔

اس ایکٹ میں دوسری چیزوں کے علاوہ تعزیرات پاکستان مجریہ 1860ء میں دفعہ 310-الف کو تبدیل کردیا گیا تاکہ ونی اور سوارا کے نام پر بدل صلح کے طور پر ایک تنازعہ یا قرضے کو چکانے یا کسی اور رسم یا کسی اور نام سے کسی اور اقدام کے بدلے میں شادی میں ایک عورت کو دینے کے جرم میں سزا کا تعین کیا جائے۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ سات سال اور کم از کم تین سال قید اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

اس بل نے ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء میں ایک نئی دفعہ '402-ڈ' شامل کرنے کی تجویز دی ہے جس کا مقصد صوبائی حکومتوں کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 376 کے تحت زنا کے جرم میں دی گئی سزا کو معطل کرنے یا کم کرنے سے صوبائی حکومتوں کو منع کرنا ہے۔

بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ بیان کرتے ہوئے محرکین نے کہا:

''ملک میں متعدد کام اور رسوم ایسی ہیں جو نہ صرف انسانی وقار کے خلاف ہیں بلکہ انسانی حقوق کے بھی منافی ہیں۔ اسی طرح یہ اسلامی تعلیمات کے بھی برعکس ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان غیر انسانی اقدامات اور رسومات کو فوری طور پر ختم کیا جائے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ سختی کے ساتھ نمٹا جائے اور سزا اور جرمانہ کیا جائے۔ موجودہ بل ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مشاہدہ

قبل ازیں تعزیراتِ پاکستان کے مجموعہ میں دفعہ 310- الف کا اضافہ فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2004ء (2005ء کے پہلے ایکٹ) کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ دفعہ کچھ یوں تھی:

''310- الف۔ کسی خاتون کو بدل صلح میں یا اس کے برعکس شادی میں دینے کے لیے سزا: جو کوئی کسی عورت کو بدلِ صلح کے لیے شادی میں یا اس کے برعکس دے اس کو زیادہ سے زیادہ 10 سال اور کم سے کم 3 سال کی قید سخت کی سزا دی جائے گی''۔

زیرِ نظر قانون نے اسے یوں تبدیل کر دیا ہے:

''**310- الف**۔ بدل صلح، ونی یا سوارا یا اس کے برعکس ایک خاتون کو شادی کے لیے دینے کی سزا: جو کوئی کسی خاتون کو بدلِ صلح، ونی یا سوارا یا کسی دوسری رسم یا کسی بھی نام کے تحت کسی فعل کے تنازعے کو طے کرنے کے بدلے میں یا مجرمانہ ذمہ داری کے عوض شادی میں یا اس کے برعکس دینے یا شادی پر مجبور کرے تو وہ کم از کم تین سال قید اور پانچ لاکھ روپے کی سزا کا مستوجب ہوگا''۔

اس طرح اس قانون نے سابقہ قانون میں تین بنیادی تبدیلیاں کیں:

(۱) خواتین کو بدلِ صلح میں دینے کے حوالے سے ونی اور سوارا کا ذکر واضح طور پر کر دیا گیا۔

(۲) ان صورتوں کا واضح کیا گیا جو ایک عورت کو بدل صلح میں دینے کا سبب بنتی ہیں مثلاً دیوانی تنازعہ یا مجرمانہ ذمہ داری؛ اور

(۳) سزا کی کم از کم حد کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی بالائی حد کو حذف کر دیا گیا اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کی رقم کا تعین کر دیا گیا۔

ضابطہ میں شامل کی گئی دفعہ 402-دکو ضابطہ فوجداری مجریہ 1898 کی دفعات 401، 402 اور 402-ب سے ملا کر پڑھنا ہوگا جن کے مطابق صوبائی حکومتیں بعض سزاؤں کو معطل، معاف، یا کم کر سکتی ہیں۔ ایکٹ نے صوبائی حکومتوں کی تعزیرات پاکستان کی دفعہ 376 کے تحت دی گئی زنا کی سزا کو معطل کرنے، معاف کرنے یا کم کرنے کا اختیار ختم کر دیا ہے۔

تبصرہ

اس ایکٹ کے ذریعہ متعدد مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے اور قانونی طور پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو نے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اور جنہوں نے متاثرہ عورتوں کی زندگی تلخ بنا دی ہے۔ بل میں ایسی اہم قانونی تجاویز اور ضروری شقوں کے باوجود اسے قانون کی طاقت حاصل کرنے میں تین سال کا عرصہ لگا۔ ملک کے قانون ساز ادارے میں دلچسپی کی یہ کمی اس مفروضے کی توثیق کرتی ہے کہ سیاسی مفادات اہم تر قانون سازی اور خواتین اور معاشرے کی حقیقی بہتری پر غالب آجاتے ہیں۔

ہم ذیل میں ایکٹ کی دونوں دفعات پر الگ الگ بحث کریں گے۔

310-الف: اگرچہ بدل صلح کے طور پر عورت کو شادی میں دینے کی ممانعت پہلے ہی قانون میں موجود ہے۔ نئے متن نے اس کو مزید متعین بنا دیا ہے اور اس میں تمام اقسام اور کارروائیوں کو شامل کر لیا ہے جو ایک عورت کو نکاح کرنے کے معاہدے میں شامل ہونے پر مجبور کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں خواہ وہ رسم کے نام پر ہوں، کسی تنازعہ کو طے کرنے یا کوئی ذمہ داری نبھانے کے لیے یا اس کے برعکس کسی بنیاد پر ہوں۔ اس نے اس طرح عورت کی عزت اور وقار کو اہمیت دیتے ہوئے ان صورتوں سے بچنے پر زور دیا ہے جن میں عورت کو اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے میں رائے دینے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے۔[38]

تاہم جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسی تمام صورتوں اور حالات پر پابندی لگائی جائے اور

انہیں روکا جائے جن میں کسی خاتون کو دو متحارب فریق اپنے تنازعات طے کرنے کے لیے جنس کے طور پر استعمال کریں، وہاں قانون کو مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر قانون اس پر غور نہیں کرتا کہ ایک دیوانی تنازعہ طے کرتے وقت یا ایک فوجداری ذمہ داری کا تصفیہ کرتے ہوئے عورت کو شادی کے لیے دینے میں صرف وہی شخص ذمہ دار نہیں ہے جو اس عورت کو دینے پر رضامند ہوا، بلکہ پوری پنچایت یا جرگہ جو بالعموم فیصلہ میں شریک ہوتا ہے اور جو جبری نکاح کا اعلان کرتا ہے اور ان سب سے بھی زیادہ وہ فرد یا افراد جو اس عورت کو زبردستی بیاہ کر لے جا رہے ہیں، وہ سب اس جرم میں ملوث اور لائقِ سزا ہونے چاہئیں۔

قانون کو بالجبر کیے گئے نکاح کے جواز کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ موجودہ صورت میں دلہن کے والد یا سرپرست کو تو، جو بعض اوقات مجبور بھی ہو سکتے ہیں، سزا ہو جائے گی لیکن لڑکی بدستور مصائب کا شکار رہے گی، اور اسے ممکنہ طور پر مسلسل انتقام کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا، تاکہ اس کے سسرال والے اس کے میکے والوں کے جرم یا خطا کا بدلہ اس سے لے سکیں۔ مزید برآں جو رقم جرمانے کے طور پر وصول ہوتی ہے وہ عورت کو ادا نہیں ہوگی۔ اس طرح موجودہ قانون مظلوم عورت کو کوئی سہولت فراہم نہیں کرتا۔

ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی تنازعہ یا ذمہ داری کے تصفیہ کے لیے ایک عورت کو شادی میں دینے پر پابندی کے عمل سے وہ تصفیے بھی متاثر ہوں گے جو دو خاندانوں کے درمیان امن قائم کرنے اور جذبہ خیر سگالی کے طور پر، جائز طور پر کیے گئے ہوں اور جو دو طرفہ رضامندی کی بنیاد پر طے پائے ہوں، تاکہ رشتہ داری کے بندھن کو مستحکم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندانوں کے درمیان دشمنی کو قرابت میں بدلنے کی یہ روایت بھی صدیوں سے جاری ہے۔ تاہم یہ بھی قرینِ عقل نہیں کہ ان روایات کو کسی روک ٹوک کے بغیر جاری رکھا جائے کیونکہ اس روایت پر عمل نے بڑی ظالمانہ شکل اختیار کر لی ہے، اور عورتوں کو خاندان کے مرد ارکان کی کھال بچانے کے لیے بدلے میں دیا جاتا ہے، جب کہ فریقِ مخالف انہیں باندیوں کی طرح وصول کر کے ان پر زندگی بھر ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھتا ہے۔ تاہم بعض صورتوں میں حالات اس کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔ چونکہ معاملے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ قانون میں ان کی امکانی صورتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ دفعہ 310- الف کے تحت جرم کو قابلِ مصالحت

قرار دیا جانا چاہیئے تا کہ اگر دلہن کو نئے گھر میں اچھی نیت کے ساتھ لے جایا گیا ہے اور وہ پر امن زندگی گزار رہی ہے تو اس کے باپ کو بھی جیل کی سزا نہیں بھگتنا چاہیے۔

402-د: ضابطہ فوجداری مجریہ 1898 میں نئی دفعہ 402-د کی شمولیت کا مقصد زنا کے مقدمات میں دفعہ 401 کے اطلاق کو روکنا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صوبائی حکومتوں کے پاس یہ اختیار باقی نہیں رہا کہ وہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 376 کے تحت عدالت کی طرف سے زنا کے الزام میں سزا کو معطل، معاف یا کم کر سکیں۔

دفعہ 402-د کو سمجھنے کے لیے دفعہ 376 کے ارتقاء کے مختلف مراحل کو دیکھنا ہو گا۔ آغاز میں تعزیراتِ پاکستان کے ضابطہ میں زنا بالجبر کی وہی تعریف اور سزا تھی جو تعزیرات ہند کے ضابطہ مجریہ 1860 میں برطانوی حکمرانوں نے تجویز کی تھی۔ دونوں متعلقہ دفعات 375 اور 376 زنا کے جرم (نفاذ حدود) آرڈی نینس مجریہ 1979 کے ذریعہ منسوخ کر دی گئی تھیں اور ایک شادی شدہ شخص کی دوسری عورت کے ساتھ رضامندی کے ساتھ بدکاری، دو غیر شادی شدہ مرد و عورت کی زنا کاری اور زنا بالجبر سے متعلق تفصیلی دفعات اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک ہی قانون سازی میں کر دی گئی تھیں۔ اس قانون میں طریق کار کی بعض خامیاں تھیں جن کی بنیاد پر معاشرے کے آزاد خیال طبقے نے بڑی زوردار مہم چلائی جس کے نتیجہ میں آرڈی نینس کی اس دفعہ سمیت حدود کے قانون کی متعدد شقوں کو حذف کرنا پڑا جس میں زنا بالجبر کی تعریف اور سزا کا تعین کیا گیا تھا اور ان شقوں کو بحال کر دیا گیا جو برطانوی قانون کی اسکیم یعنی دفعات 375 اور 376 کا حصہ تھیں۔ متعدد افراد کی رائے میں یہ پاکستان کے دستور کی دفعات 2-الف، 227 اور اسلام کے واضح احکامات کی خلاف ورزی تھی،[39] اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی ضرر رساں تھیں۔[40] یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ایک عورت کے وقار اور عصمت کو تار تار کرنے اور اس کی بقیہ پوری زندگی کو تکلیف میں ڈالنے والے سنگین جرم کے لیے سزا کافی نہیں ہے۔

فراہمیٔ انصاف کی بات کی جائے تو ایک بنیادی اصول کے طور پر حکومت کو عدلیہ کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ایک شخص کو عدالت کی طرف سے مجرم قرار دیا گیا ہو تو انتظامیہ کو یہ حتمی اختیار

نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سزا کو معطل، منسوخ یا کم کردے۔ اس تناظر میں یہ یاد دلانا بھی مناسب ہے کہ موت یا عمر قید کی سزا بھی تعزیرات پاکستان کے ضابطہ کی دفعات 54 اور 55 کے تحت تبدیل کی جاسکتی ہیں جب کہ صدرِ پاکستان کو دستور کے آرٹیکل 45 کے تحت کسی عدالت، ٹریبونل یا مجاز حاکم کی طرف سے دی گئی سزا کو معاف کرنے، موخر کرنے، سہولت فراہم کرنے، منسوخ کرنے، معطل کرنے یا کم کرنے کا اختیار ہے۔ قانون کی ان شقوں میں بھی ذکر کردہ بنیادی اصول کے مطابق اسی جذبے کے ساتھ ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔

سفارشات

- تعزیرات پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860 کی دفعہ 310-الف میں ترمیم بدلِ صلح میں ایک عورت کو دینے کے نہایت اہم پہلوؤں کو نظرانداز کرتی ہے، مثلاً یہی کہ اس قانون میں امکان موجود ہے کہ خاتون کے اس انسانیت سوز استعمال کے اصل ذمہ داران کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جاسکے۔ ضرورت ہے کہ اس نوعیت کی کمزوریوں کا ازالہ کیا جائے۔
- **دفعہ 402**-دصوبائی حکومتوں کو عدلیہ کے فرائض میں مداخلت سے روکتی ہے۔ انتظامیہ پر یہ پابندی حتمی اور مکمل ہونی چاہیے۔ قانون کی تمام دفعات پر جو انتظامیہ کو مقدمے میں حتمی فیصلہ کرنے کے قابل بناتی ہیں، نظرثانی ہونی چاہیے اور عدلیہ کی آزادی اور اس کی انتظامیہ سے علاحدگی تمام مقدمات میں یقینی بنایا جانا چاہیے۔

جنس اور سزائے موت

مجموعہ تعزیراتِ پاکستان (ترمیمی) بل 2012ء

اس بل میں تعزیرات پاکستان ضابطہ مجریہ 1860ء (1860ء کے پینتالیسویں ایکٹ) کی دفعہ 53 میں مندرجہ ذیل ذیلی دفعہ کو شامل کرنے کی تجویز کی گئی تھی:

''(2) ہر چند کہ ذیلی دفعہ (1) میں فراہم کی گئی موت کی سزا کسی بھی عمر کی خاتون، 15 سال تک کی

عمر کے بچے کو اس ضابطہ کے لیے کسی جرم میں دی گئی موت کی سزا نہیں ہوگی''۔

اس تجویز کے اغراض ومقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا:

''اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ صنفی امتیاز کے بغیر مساوی سلوک ہونا چاہیے تاہم دستورِ پاکستان کے آرٹیکل 25 کی شق دوم تجویز کرتی ہے کہ ریاست خواتین اور بچوں کے تحفظ کے لیے خصوصی قانون بنا سکتی ہے لیکن اس شق کو خواتین کے فائدے کے لیے، کم از کم تعزیراتِ پاکستان کے مجموعہ میں درج جرائم کی حد تک ان کے لیے سزاؤں میں کمی کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ حالانکہ قرآن مجید اور احادیث میں خصوصی ہدایات موجود ہیں کہ خواتین کے ساتھ نرم اور خصوصی سلوک کیا جائے۔ یہ بات کسی شک سے بالاتر ہے کہ جب بھی کسی عورت کو سزائے موت دی جاتی ہے، تو اس کے خاندان کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں؛ بالخصوص اگر اس کے چھوٹے بچے ہوں تو وہ بدنامی کا داغ لیے ہوئے بڑے ہوتے ہیں۔

عنوان: تعزیرات پاکستان ضابطۂ کار (ترمیمی) بل 2012ء
پیش کار: خرم جہانگیر وٹو، پاکستان پیپلز پارٹی
بتاریخ: 17 جنوری 2012ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

اسی طرح دورانِ تعلیم نوبالغ اور 15 سال تک کی کم عمر کے کم سِن بچوں کو گاہی فراہم کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان بچوں کا تو ذکر ہی بے سود ہے جو بغیر کسی قصور کے اسکول سے محروم رہے ہیں۔ اس طرح ایسے مجرموں اور بچوں کے ساتھ بھی خصوصی سلوک کی ضرورت ہے جو 15 سال سے کم عمر کے ہوں۔ اگر وہ تعزیرات پاکستان کے تحت سنگین جرائم میں ملوث ہوں تو کم از کم انہیں موت کی سزا نہیں دینی چاہیے''۔

مشاہدہ

موجودہ قانون مجرموں کے درمیان جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتا۔ اس میں استثنیٰ صرف نشہ آور اشیاء کو کنٹرول کرنے کے ایکٹ مجریہ 1997ء کو حاصل ہے۔ دفعہ 9(ج) کے مطابق اگر کوئی شخص ایک سو گرام سے زیادہ مقدار میں منشیات کو اپنے پاس رکھتا، برآمد کرتا، درآمد کرتا، اسمگلنگ کرتا یا اسمگلنگ میں

مالی تعاون کرتا ہو تو اس کو جنس کے امتیاز کے بغیر موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اگرچہ یہ قانون ابھی تک غیر تبدیل شدہ ہے تاہم لاہور ہائی کورٹ کے فل بینچ نے 2009ء میں منشیات کے مقدمات میں سزا دینے کے جو اصول وضع کیے ہیں، ان کے مطابق عورتوں کو جنس اور بچوں کو ان کی کم عمری کی بنیاد پر موت کی سزا نہیں دی جاتی۔ سماعت کرنے والی عدالتیں خصوصی وجوہ کی بنیاد پر اس اصول کو ترک کر سکتی ہیں۔ اس وقت سے عورتوں کی حد تک منشیات کے مقدمات میں موت کی سزا عملاً ختم ہو گئی ہے۔[41] جہاں تک بچوں کا تعلق ہے کم عمر بچوں کے انصاف کے نظام آرڈیننس مجریہ 2000ء (2000ء کے بائیسویں ایکٹ) کے تحت کسی ایسے شخص کو جو ارتکاب جرم کے وقت 18 سال سے کم عمر کا تھا، موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔

تبصرہ

جرم دوسروں کے حقوق کی خلاف ورزی پر مبنی فعل کا نام ہے اور جرم کی یہ تعریف مجرم کی صنف کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتی۔ تاہم خلاف ورزی کرنے والے کو دی جانے والی سزا جرم کرنے والے مختلف افراد کے لیے مختلف ہو سکتی ہے۔ چاہے بلا شک وشبہ یہ معلوم بھی ہو جائے کہ جرم کا ارتکاب ملزم ہی نے کیا ہے تو بھی اہم ترین عنصر جس کی بنیاد پر سزا میں اضافہ یا کمی کی جا سکتی ہے وہ جرم کا ارادہ (mens rea)[42] ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم دراصل اس جرم کے ارتکاب کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس لیے یہ تعین کیا جاتا ہے کہ کیا ارتکاب جرم کرنے والے کی یہ جرم کرنے کی نیت تھی یا وہ خود سے نیت کرنے کی صلاحیت کا حامل تھا۔ یہ وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے کم عمر، پاگل اور ان لوگوں کو جو مجبوری میں ارتکاب جرم کرتے ہیں، مجرمانہ ذمہ داری سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔

عورتوں کو موت کی سزا

دنیا بھر میں صنف نازک کے لیے چلائی جانے والی تحریکیں عورتوں کے لیے ہر لحاظ سے مساوات کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ یہ مہم اس قدر جارحانہ رہی ہے کہ جب ترقی یافتہ ممالک میں خواتین نے گھریلو معاملات سے ''آزادی'' حاصل کر لی اور زندگی کے ہر شعبہ میں شرکت شروع کر دی تو انہوں نے حقوق سے بڑھ کر مراعات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہاں سے جنسی امتیاز نے ایک نئی صورت اختیار کی

جس کی جھلک زیر بحث بل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

بل پیش کرنے والے صاحب نے اس کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں تسلیم کیا ہے کہ موت کی سزا سے عورتوں کو استثنیٰ دینے کی تجویز بلاشبہ بلالحاظِ جنس قانونی مساوات کے اصول کے منافی ہے لیکن یہ امتیاز تین بنیادوں پر ضروری خیال کیا گیا:

- پاکستان کا دستور عورتوں اور بچوں کے تحفظ کے لیے خصوصی قوانین بنانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس قانونی گنجائش سے، عورتوں کے لیے سزاؤں میں کمی کرنے کے لیے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔
- قرآن مجید اور احادیث میں عورتوں کے ساتھ خصوصی سلوک کرنے کی خصوصی ہدایات ہیں؛ اور
- عورتوں کو موت کی سزا دینے سے اس کا خاندان مسائل کا شکار ہوتا ہے۔

اس ضمن میں دستور کے متعلقہ آرٹیکل 25 کا متن یوں ہے:

''**شہریوں سے مساوات:** (1) تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں اور قانونی تحفظ کے مساوی طور پر حقدار ہیں۔

(2) محض جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

(3) اس آرٹیکل میں مذکور کوئی امر عورتوں اور بچوں کے تحفظ کے لیے مملکت کی طرف سے کوئی خاص اہتمام کرنے میں مانع نہ ہوگا۔''

اس آرٹیکل کی پہلی اور دوسری شق میں امتیاز کے خلاف عام اصول کا بیان ہے لیکن متعدد عدالتی فیصلوں[43] کے مطابق قوانین کے مساوی تحفظ کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شہری کے ساتھ یکساں انداز میں سلوک کیا جائے۔ قانون کے موضوعات کی ایک منصفانہ اور معقول درجہ بندی کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض اوقات پسندیدہ بھی ہے۔ مختلف طبقات مثلاً مرد و خواتین اور عمر کے مختلف حصوں میں موجود افراد کے لیے قوانین مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن کسی مخصوص قانون کے سلسلے میں کسی ایسی درجہ بندی کا جواز ہونا چاہیے۔ خاتون یا بچہ ہونا یقیناً ایسی کسی درجہ بندی کی ٹھوس بنیاد ہو سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مملکت کو عورتوں

اور بچوں کے تحفظ کے لیے خصوصی قوانین بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایسے متعدد قوانین تشکیل بھی دیئے گئے ہیں، جن میں عورتوں کے لیے مخصوص نشستیں، ضمانت میں رعایتیں اور مختلف مقدمات میں سزاؤں سے استثنیٰ جیسا کہ تعزیرات پاکستان کے ضابطہ 497 میں ہے،[44] زچگی کے دوران خصوصی سہولیات، ملازمت کے قوانین میں رعایت، کم عمر بچوں کے لیے انصاف کے نظام کے آرڈیننس سمیت کم عمر بچوں کے لیے خصوصی قوانین شامل ہیں۔

کم از کم تین سوالات ایسے ہیں جن پر ایسے معاملے میں غور کرنا ہوگا:

۱۔ آیا خصوصی سلوک کی حامل دفعہ اس حد تک مراعات کی حامل ہے کہ دستور میں مساوات کی ضمانت بے وقعت ٹھہرے۔

۲۔ عورتوں کے تحفظ کے لیے حفاظتی اقدامات اور مراعات کی حد کیا ہونی چاہیے اور کیا اس نوعیت کا کوئی اقدام خواتین کے مفاد میں ہے یا ان کے خلاف؛ اور

۳۔ اس امتیاز کا ایسے جرائم پر کیا اثر ہوتا ہے جن میں خواتین ملوث ہوں۔

اگر ہم اس نقطۂ نظر سے بل میں موجود اس تجویز پر غور کریں کہ عورت کو موت کی سزا نہیں دینی چاہیے تو پہلے سوال کا جواب ایک نظریاتی بحث کا تقاضہ کرتا ہے، لیکن شاید آرٹیکل 25 جو جنس کی بنیاد پر تفریق کی ممانعت کرتا ہے، سے کوئی انحراف اس سے بڑا نہیں ہوسکتا کہ اسے بنیاد بناتے ہوئے ایک ہی جرم کے ارتکاب میں مرد کو تو اس کی زندگی سے محروم کر دیا جائے جب کہ خاتون کی جان، محض خاتون ہونے کی وجہ سے بخش دی جائے۔ ایسا امتیاز صرف اس صورت میں منصفانہ ہوگا اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان خواتین نے ایسے جرائم کا ارتکاب، جن کی سزا موت ہے، اپنی آزاد مرضی سے نہیں کیا اور خواتین یا تو ارادہ رکھتی ہی نہیں ہیں یا ان کی ارادہ باندھنے کی صلاحیت مردوں کی نسبت کمزور تر ہے۔ ایسی تفریق اس وقت بھی مناسب ہوتی اگر خواتین کے معاملے میں جرم کے اسباب مردوں سے مختلف ہوتے، لیکن مطالعہ بتاتا ہے کہ عورتیں بنیادی طور پر ان ہی وجوہ کی بنیاد پر جرائم کرتی ہیں جو مقاصد زیادہ تر مردوں کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کم جرائم کرتی ہیں جس کے لیے علوم عمرانیات

کے ڈاکٹروں نے مختلف عوامل تلاش کرنے کی کوشش کی۔[45] ان عوامل میں مردوں اور عورتوں سے مختلف کردار کی توقعات، صنفی اختلاف، مختلف تمدنی رویئے، سماجی نگرانی، مخصوص جرائم کے ارتکاب کے مواقع میں متعین اختلافات، جرائم زدہ ذیلی صحبت (sub-cultures) تک رسائی میں اختلاف[46] اور جرائم کی نوعیت میں درکار جنسی اختلافات شامل ہیں۔[47] اگر قریب سے جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ خاندانی رشتوں سمیت یہ اور دوسرے عوامل عورتوں کے جرائم کے ارتکاب میں کچھ رکاوٹیں ضرور کھڑی کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی جرم کرنا ہو تو ایک عورت کو کسی مرد کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ رکاوٹوں کو عبور کرنا اور زیادہ نفسیاتی، جسمانی اور بیرونی عوامل کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تو محسوس ہوتا ہے کہ بعض جرائم مثلاً قتلِ عمد کی صورت میں عورت کا ارادہ مرد کے ارادے سے زیادہ قوی ہوتا ہوگا۔

بعض صورتوں میں محسوس ہوتا ہے کہ خواتین کو استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا لیکن ایسے حالات یقیناً ہوتے ہیں جہاں عورتوں کو مجبوراً ناجائز سرگرمیوں میں ملوث ہونا پڑتا ہے۔ ایسا ہی ایک معاملہ منشیات کی اسمگلنگ بھی ہے جس کی سزا قانون میں اب بھی موت ہے لیکن اس کو پنجاب میں ماتحت عدالتوں کے لیے لاہور ہائی کورٹ کی ہدایات اور رہنما اصولوں کی روشنی میں عورتوں اور بچوں کے لیے ختم کر دیا گیا ہے۔

بل میں دی گئی تجویز پر غور کرنے سے پہلے یہ جائزہ لینا نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوگا کہ منشیات کی غیر قانونی تجارت کے حوالے سے روا رکھی گئی تفریق کے نتائج اور اثرات کیا ہیں اور کیا اس نے خواتین کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان؟ اگرچہ اس موضوع پر کوئی تحقیق اب تک نہیں کی گئی لیکن اس فیصلے کے بعد منشیات کی اسمگلنگ میں خواتین کا اضافہ ہی دیکھا گیا ہے۔ وکلا اور قیدیوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے انسانی حقوق کے کارکنوں میں سے جتنے افراد سے اس سلسلے میں بات کی گئی ان کا مشترکہ تأثر یہی ہے کہ اس وقت جیل میں منشیات سے متعلق عورتوں کی تعداد دوسرے جرائم میں ملوث خواتین سے زیادہ ہے۔ یہی تأثر کسی حد تک قومی ذرائع ابلاغ سے بھی ملتا ہے۔ نومبر 2011ء کی ایک اخباری خبر[48] میں جو اسلام آباد کی ضلعی عدالتوں[49] کے ریکارڈ کی بنیاد پر تیار کی گئی، منشیات کا کاروبار کرنے والی عورتوں کی

تعداد میں تیز اضافہ ظاہر کیا گیا۔ اس تحقیق کے مطابق اس رپورٹ سے پہلے تین ماہ کے دوران وفاقی دارالحکومت میں منشیات کے کاروبار کے 135 مقدمات درج کیے گئے جبکہ 2010ء میں 369 مقدمات درج ہوئے۔ اسی نامہ نگار[50] کی اس سے متعلقہ ایک اور خبر میں اس امر کو اجاگر کیا گیا تھا کہ اگست سے نومبر 2011 تک 4 ماہ کے دوران اسلام آباد ضلعی عدالتوں نے منشیات کا کاروبار کرنے والی 102 عورتوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے، جو عدالت سے ضمانت حاصل کرنے کے بعد قانون کے مطابق کارروائی کے طریق کار سے بچنے کے لیے فرار ہوگئی تھیں۔ خبر میں بیان کیا گیا تھا کہ منشیات فروشوں کے وہ گروہ قوانین میں نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کی یہ عورتیں ارکان ہیں۔

ان خبروں میں پیغام بڑا واضح ہے کہ عورتوں کے بارے میں قوانین کو غیر ضروری طور پر نرم بنانا، جرائم پیشہ گروہوں کی طرف سے ان کے استعمال کیے جانے کے خطرے کو بڑھا دیتا ہے۔ قانون کا اس سے زیادہ منفی نتیجہ شاید ہی کوئی ہوسکتا ہے۔

اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں قرآن مجید اور احادیث میں خواتین کے بارے میں نرم اور خصوصی رویہ رکھنے کا ذکر بھی کیا گیا تھا تاکہ شریعت کی کسوٹی[51] پر اس تجویز کو درست ثابت کیا جاسکے۔ تاہم یہ مقصد عمومی طور پر قرآن و حدیث کا ذکر کر دینے سے حاصل نہیں ہوسکتا، اس مقصد کے لیے کوئی ایسا متعین حوالہ پیش کرنا ہوگا جس کی رُو سے تعزیری قوانین میں جنس کی بنیاد پر خطا کار کی تفریق کی گئی ہو۔ اسلامی شریعت مساوات کے اصولوں کو مکمل تسلیم کرتی اور اس کا اطلاق کرتی ہے۔ یہ اصول نہ صرف شریعت کی نص سے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان نصوص کی جانب سے اطلاق سے بھی نکلتا ہے۔ محرک کے موقف کے برعکس یہ دیکھا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام میں ایسی کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ بعض واقعات میں غیر مبہم طور پر مساوات پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ 5 کی آیت 38 چوری اور سورہ 24 کی آیت 2 میں شادی شدہ مرد کی اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کے ساتھ بدکاری کرنے کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے خاص طور پر قرار دیا گیا کہ مرد اور عورت دونوں کے لیے سزا ایک جیسی ہے۔ اول الذکر آیت میں سزا کی دو وجوہ بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ سزا اس جرم کے بدلے میں ہے جس کا ارتکاب

کیا گیا ہے۔ دوسری یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ سزا ہے، جس کا مقصد مزید جرائم کی روک تھام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا کا تعین جرم کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ ارتکاب جرم کرنے والے کی صنف پر، اور یہ کہ سزا ایک رکاوٹ ہے جو معاشرے کے مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہونی چاہیے۔ تاہم اگر جرم کرنے والے کی شخصیت میں کوئی عنصر ایسا ہے جو اس کے ارادے اور نیت کرنے کی صلاحیت کو مفلوج کرتا ہے تو ذمہ داری بھی اس پر نہیں ڈالی جانی چاہیے، ان عوامل میں پاگل پن، مدہوشی، جبر اور بچپن شامل ہیں۔ چونکہ ایک عورت ہونا ارادہ اور نیت کرنے کی صلاحیت کو مفلوج نہیں کرتا اس لیے اسلامی تعزیری قوانین میں عورتوں کے لیے کوئی مخصوص طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا۔

کسی عورت کو موت کی سزا کی صورت میں خاندان کے لیے بدنامی اور پیش آنے والی مشکلات کی ایک وجہ کا ذکر بھی عورتوں کے لیے موت کی سزا کے خاتمے کے لیے متعدد دیگر وجوہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یہاں اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ بدنامی کا داغ لگنے کی وجہ سزا نہیں بلکہ ایک جرم کا ارتکاب ہے۔ کسی کو مجرم قرار دیتے ہی اس کی شہرت کو بٹہ تو لگ چکا ہوتا ہے۔ سزا کا تو مقصد ہی جرم کے ارتکاب میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے اس لیے اس نوعیت کی بے توقیری اور معاشرے میں بدنامی کا خوف تو اس رکاوٹ کو مؤثر تر بناتا ہے۔

جہاں تک خاندان اور بچوں کو مشکلات کا تعلق ہے ان کو بھی سزا کی بجائے جرم کے نتائج کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اور مرد کے معاملے میں بھی ایسی مشکلات موجود ہوتی ہیں جو خاندان کا کمانے والا واحد ذریعہ ہو اور جسے موت کی سزا دے دی جائے یا عمر قید کی سزا دی جائے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ تمام سزاؤں کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ وہ سزا یافتہ کے خاندان کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہیں۔ مملکت اور معاشرے کو تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کسی بھی جرم میں سزا یافتہ افراد کے ضرورت مند اہل وعیال کی ضروریات کا خیال رکھیں۔

سفارشات

- عورتوں کے لیے سزائے موت کا خاتمہ قانون کی نظر میں نہ صرف مساوات کے اصول اور تمام

شہریوں کے لیے قانون کے یکساں تحفظ کو ختم کر دے گا بلکہ عورتوں کے جرائم پیشہ گروہوں کے ذریعہ استحصال میں اضافہ کرے گا۔

- موت کی سزا کے خاتمہ کا تصور اسلامی قانون میں اجنبی ہے اور اس لیے پاکستان میں نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔
- جب کبھی خواتین کے خلاف تفریق ان کے حقوق کے منافی ہو، اس کے خلاف مزاحمت ضروری ہے لیکن جس نوعیت کی تجویز اس بل میں دی گئی تھی، ان سے ایک اور طرح کا امتیاز پیدا ہوگا، جس کا نتیجہ معاشرے میں مزید انتشار اور تنازعات کی شکل میں نکلے گا۔

انسانوں کی ٹریفکنگ

خواتین کی ٹریفکنگ کے امتناع اور انسداد کا بل 2010ء

عنوان: خواتین کی اسمگلنگ کی روک تھام اور اس پر قابو پانے کا بل 2010ء
پیش کار: بشریٰ گوہر، جمیلہ گیلانی، خورشید بیگم، عوامی نیشنل پارٹی
تاریخ: 23 فروری 2010ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

اس بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ عورتوں کی ٹریفکنگ اور اس سے وابستہ افعال کو ایسے جرائم میں شامل کیا جائے گا جن کے لیے سخت ترین جسمانی اور مالیاتی سزائیں ہوں۔ عورتوں کی تجارت، اغوا، عورتوں کو جبراً دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش، دستاویزات کو تباہ کرنا اور عورتوں کی اجتماعی ٹریفکنگ کے لیے تعزیری اقدامات تجویز کیے گئے تھے۔ جرم کے بار بار کرنے پر سزاؤں میں اضافہ بھی تجویز کا حصہ تھا۔ مجوزہ قانون میں مقدمہ درج کرانے کے لیے تجویز کیا گیا تھا کہ کوئی بھی شخص یا سول سوسائٹی کی کوئی تنظیم اگر اس جرم کا ارتکاب ہونے پر یقین کرنے کی وجہ رکھتی ہو یا اسے ذرائع ابلاغ کی کسی خبر سے اطلاع ملی ہو تو وہ کسی سرکاری یا نجی ادارے کو مزید کارروائی کے لیے درخواست دے سکتا ہے۔ محرکین نے بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ میں خواتین اور بچوں کے حقوق کے تحفظ اور انسانی حقوق کے لیے دستوری ضمانتوں کے ساتھ، بچے کے حقوق پر کنونشن (CRC) اور

عورتوں کے خلاف تمام اقسام کی تفریق کے خاتمے کے کنونشن (CEDAW) کے لیے توثیق سمیت اقوام متحدہ کی تمام بین الاقوامی پابندیوں اور وعدوں کا ذکر کیا اور قومی پالیسیوں، قوانین اور منصوبوں کو ان کے مطابق ڈھالنے پر زور دیا گیا۔ بل پیش کرنے والی محترم اراکینِ اسمبلی کے مطابق درست اعداد وشمار کی عدم دستیابی کے باوجود پاکستان انسانوں کی ٹریفکنگ کے ذریعہ، گزرگاہ اور ٹھکانہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کو بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، برما، نیپال اور وسطی ایشیا سے تجارتی وجنسی استعمال اور مشقت کے لیے زبردستی یا دھوکہ سے منتقل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عورتوں اور لڑکیوں کو پاکستان سے مشرق وسطیٰ جبری مشقت اور گھریلو ملازمین کے طور پر منتقل کیا جاتا ہے۔ محرکین نے اندرونِ ملک اور براستہ پاکستان عورتوں اور بچوں کی ٹریفکنگ کا بھی ذکر کیا تھا۔ بل کا مقصد عورتوں اور لڑکیوں کی ٹریفکنگ کے بڑھتے ہوئے واقعات کی روک تھام، متاثرہ افراد کا تحفظ اور ان کی مدد کرنا تھا۔

مشاہدات اور موجودہ قانون

فی الوقت خواتین کی جبری تجارت کے معاملات کو انسانوں کی ٹریفکنگ کے انسداد اور روک تھام کے آرڈیننس مجریہ 2002ء کے تحت نمٹایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ قانون انسانی تجارت کی عمومی روک تھام سے متعلق ہے لیکن اس کی دفعہ 3 کی شق سوم بالخصوص خواتین اور بچوں کی ٹریفکنگ کا ذکر کرتی ہے۔ اس شق کی رُو سے ''جو کوئی جان بوجھ کر بچے یا عورت کو خریدتا، بیچتا، پناہ دیتا، نقل مکانی کرتا، فراہم کرتا، حراست میں رکھتا یا اسے حاصل کرتا ہے یا اس مرد یا عورت کی پاکستان کے اندر یا باہر جبری منتقلی، کوئی فائدہ دے کر یا لے کر یا استحصالی تفریحِ طبع کے مقصد اور نیت سے کرتا ہے اور اس کے عوض کچھ وصول کرتا یا وصول کرنے کی توقع رکھتا ہے تو ایسا شخص 10 سال تک قید اور جرمانے کی سزا کا مستوجب ہوگا''۔

انسانی اسمگلنگ کی روک تھام اور کنٹرول کے آرڈیننس مجریہ 2002ء اور زیرِ بحث بل کا تقابلی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ بل میں بالعموم اسی آرڈیننس کی ہی شقوں کو دوبارہ شامل کرلیا گیا ہے۔ تاہم آرڈیننس زیادہ جامع اور متاثرہ فرد کی جنس اور عمر کا لحاظ کیے بغیر انسانی ٹریفکنگ کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس بل صرف ان صورتوں سے متعلق تھا جب یہ جرم خواتین سے متعلق ہو۔

بل میں جو اہم بات آرڈیننس سے مختلف ہے اس کا تعلق ان معاملات سے ہے جہاں عورتوں کی اسمگلنگ نکاح کے پردے میں ہوتی ہے۔ سزا کی شق میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت یا لڑکی کی شادی اس کے ولی یا سرپرست نے دلہن کی قیمت کے بدلے میں کی اور اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ معاملہ طے کروانے والا فرد یا دلال عورتوں کی ٹریفکنگ میں ملوث ہے، تو یہ ایسا جرم ہوگا، جس کی زیادہ سے زیادہ سزا 14 سال قید اور کم از کم جرمانہ ایک لاکھ روپے ہوگا۔ بل میں یہ واضح نہیں تھا کہ آیا یہ سزا عورت کے سرپرست کو دی جائے گی یا دلال کو یا دونوں کو ملے گی۔

تبصرہ

انسانوں کی ٹریفکنگ غلامی کی ایسی شکل ہے جو اب تک موجود ہے۔ یہ جرم اس وقت زیادہ سنگین بن جاتا ہے جب متاثرہ فرد عورت ہو۔ انسانی تجارت یقیناً ایک پیچیدہ عمل ہے، جس کے دوران متاثرہ فرد کو کئی تکلیف دہ مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان مراحل کا آغاز مشکل گھریلو حالات سے فرار اختیار کرنے یا جلد کمائی کرنے کی غرض سے دوسری جگہ نقل مکانی یا دوسرے ملک چلے جانے کی خواہش سے ہوا ہو۔ اس خواہش کے بعد کا مرحلہ ٹریفکنگ کرنے والے سے واسطہ کی شکل میں سامنے آتا ہے جس میں جبر، دھوکے بازی اور بعد میں انتہائی نقصان دہ اور کام کرنے کے استحصالی طریقے شامل ہوسکتے ہیں۔ بعض دوسرے افراد کے لیے اس عمل کا نقطۂ آغاز یہ ہوسکتا ہے کہ خاندان کے لوگوں نے اسے اپنی دانست میں کسی جاننے والوں کے حوالے کر کے اس کے تحفظ اور دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی ہو لیکن نتیجتاً یہ شخص ٹریفکنگ کے دھندے کا شکار ہو جائے۔[52] ایک اور صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مرد، عورتیں اور بچے اغوا کیے جاتے ہیں یا چھپا لیے جاتے ہیں اور ملک کے اندر یا باہر دوسری جگہ منتقل کر دیے جاتے ہیں جہاں ان کو فروخت کیا یا خریدا جاتا ہے اور پھر انہیں جبری مشقت کے لیے رکھا جاتا، یا جنسی خواہشات کے لیے، یا مشکل اور انسانیت سوز کھیلوں کے لیے اور بعض صورتوں میں لے پالک کے طور پر اپنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تمام واقعات انسانیت کی توہین ہیں۔

یہ درست ہے کہ انسانی تجارت کا عصمت فروشی اور جبری مشقت کو برقرار رکھنے اور اس کے فروغ

میں بڑا کردار ہے اور تعزیری قوانین مردوں کی تجارت کو جبری مشقت اور خواتین کی تجارت کو عصمت فروشی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تعزیرات پاکستان کے ضابطہ کی متعدد دفعات، 359 سے 374 تک، جن کا تعلق اغوا، اغوا برائے تاوان، غلامی اور جبری محنت سے ہے، اسی سوچ کو ظاہر کرتی ہیں۔ تاہم یہ دفعات کافی ثابت نہ ہوسکیں اور ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسا قانون لایا جائے جس میں انسانی تجارت کے پیچیدہ معاملے اور ان سے وابستہ واقعات اور حالات جیسے تمام جرائم سے نمٹا جائے۔ اس کے نتیجے میں 2002ء میں انسانوں کی ٹریفکنگ کے امتناع و انسداد کا آرڈیننس نافذ کیا گیا جس میں انسانی تجارت کی تعریف میں کسی شخص کی واضح اور خاموش رضامندی کے باوجود اسے اِس طرح وصول کرنا، زیرِ حفاظت لینا، بیچنا، خریدنا، کام پر لگانا، محبوس کرنا اور پناہ دینا شامل ہے جس میں جبر، اغوا، یا اس کے لین دین میں حصہ وصول کیا جائے۔ جن مقاصد کے لیے کی گئی ایسی کوئی سرگرمی انسانوں کی ٹریفکنگ کہلائے گی ان کا ذکر اسی آرڈیننس کی دفعہ 3 میں کیا گیا ہے، ان میں کوئی فائدہ حاصل کرنے یا استحصالی تفریح کے لیے غلامی یا جبری مشقت کے لیے یا متبنیٰ (منہ بولی اولاد) بنانا شامل ہیں۔ افراد کی تجارت کا قلع قمع کرنے کے لیے 2005ء میں قومی منصوبۂ عمل متعارف کرایا گیا اور وفاقی تحقیقاتی ادارے (FIA) میں انسانوں کی جبری تجارت کے انسداد کا شعبہ قائم کیا گیا۔

انسانی تجارت کے امتناع و انسداد کے اس آرڈیننس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ جرم کو اس کی جامعیت کے ساتھ لیتا ہے اور متاثرہ فرد کی جنس اور عمر کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ جرائم اور منفی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے ایسی جامع سوچ ہی درکار ہے۔ یہ امکان کم ہی ہے کہ انسانوں کی جبری تجارت میں ملوث گروہ اپنی تمام سرگرمی کو محض جنس کی بنیاد پر ترتیب دیتے ہوں گے۔ چونکہ زیرِ نظر بل میں یہ تجویز تھی کہ اسے اس مضمون کے تمام قوانین پر فوقیت حاصل ہوگی اس لیے اگر اسے منظور کرلیا جاتا تو موجودہ قانون کا دائرہ کار مردوں کی اسمگلنگ تک محدود ہوکر رہ جاتا۔ اور ان قوانین پر عمل کرانے والی ایجنسی اور ایجنسیوں کو ایک ہی جرم کے لیے دو مختلف قوانین کے تحت کام کرنا ہوتا چاہے مجرم ایک ہی شخص یا گروہ عورتوں اور مردوں دونوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہوتا۔ صرف خواتین کی ٹریفکنگ کے لیے ایک الگ قانون اور اداراتی نظام پورے تصور کو ہی واپس نقطۂ آغاز پر لے جائے گا۔

ان بنیادی نقائص کے علاوہ بل میں متعدد دوسری خامیاں بھی تھیں۔ بل کی زبان بھی قانون سازی کے لیے مطلوب معیار پر پورا نہیں اترتی۔ مثال کے طور پر انسانوں کی ٹریفکنگ کے امتناع و انسداد کے آرڈیننس مجریہ 2002ء میں دستاویز (document) کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ''انسانوں کی ٹریفکنگ سے متعلق دستاویز (document) سے مراد پاسپورٹ، سفری دستاویزات اور کوئی بھی شناختی دستاویز جس کو قانون نافذ کرنے والے حکام استعمال کرتے ہیں''۔ واضح طور پر اس کا مطلب ہے کہ document ایسی چیز ہے جس کو قانون نافذ کرنے والے حکام اس دستاویز کے حامل شخص کی شناخت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بل نے document کی جو تعریف کی تھی اس کے ذیل میں پاسپورٹ، سفری تصدیق شدہ دستاویزات، شناختی کارڈ، سفری دستاویزات، نکاح نامہ اور ایسی شناختی دستاویزات شامل تھے' جو قانون نافذ کرنے والے حکام پریشان کرنے اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں'۔ گویا بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے ہر وقت پریشان کرنے اور ناجائز فائدے حاصل کرنے کے لیے تُلے رہتے ہیں۔ واضح غلطیوں اور بھول چوک کے علاوہ ایسے مخففات استعمال کیے گئے ہیں جن کی کوئی وضاحت بل میں کہیں موجود نہیں ہے۔

ایک اور فاش غلطی عورتوں کی ٹریفکنگ کے لیے شکایت درج کرانے کے مجوزہ طریق کار میں بھی موجود تھی۔ بل کی شق 8 کے مطابق کوئی بھی شخص یا سول سوسائٹی کی کوئی بھی تنظیم اگر یہ یقین کرنے کی وجہ رکھتی ہو یا اسے ذرائع ابلاغ کی خبر سے اطلاع ملی ہو تو وہ کسی سرکاری یا نجی ادارے کو مزید کارروائی کے لیے کسی خاص معلومات کے بغیر درخواست دے سکتا ہے۔ شکایت کا اندراج مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک یا زیادہ کی بنیاد پر کروائی جا سکتی تھی: یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہو کہ عورتوں کی ٹریفکنگ کا جرم سرزد ہو چکا ہے، جرم کے ارتکاب کی خبر ذرائع ابلاغ میں شائع ہو چکی ہو یا ایسے جرم کے ارتکاب کا خدشہ ہو۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شکایت مزید کارروائی کے لیے 'کسی' سرکاری یا نجی ادارے کے پاس دائر کی یا بھیجی جا سکتی ہے۔ فوجداری معاملات میں شکایت کے اندراج کا ایک معروف مطلب ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہاں 'آگے بھیجنے' (Forward) سے کیا مراد ہے۔ کیا اس قدر غیر واضح اور مبہم مسودے کو کسی بھی لحاظ سے قانون سازی کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے؟ یقیناً اگر عورتوں کی تجارت کا گھناؤنا جرم واقع ہو جائے یا

ہونے والا ہو تو اس کی اطلاع صرف اسی مخصوص ادارے یا ریاستی شعبہ کو دینی چاہیے جس کو ایسے جرم کی روک تھام کا اختیار ہو اور جس کے پاس اس سے نمٹنے کے لیے ڈھانچہ موجود ہو۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ نہ تو بل میں اور نہ اس کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کے بیان میں انسانی ٹریفکنگ کی روک تھام اور کنٹرول کے آرڈیننس مجریہ 2002ء کا ذکر کیا گیا ہے جس سے زیادہ تر دفعات پوری کی پوری یا معمولی ردوبدل کے ساتھ بل میں شامل کی گئی ہیں۔

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ بل میں جو واحد نئی تجویز شامل کی گئی ہے اس کا تعلق شادی کے پردے میں عورتوں کی تجارت سے ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ بعض اوقات عورتوں کو منتقل کرنے والوں کی قانونی طور پر بیویاں بنا کر لایا جاتا ہے اور یہ عورتیں پھر یا تو بیچ دی جاتی ہیں اور یا انہیں عصمت دری پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ پورا عمل بڑا پیچیدہ معاملہ ہے جس میں لڑکی یا اس کے والدین کو روشن مستقبل کے نام پر لالچ دیا جاتا ہے اور شادی کی تمام رسومات ادا کی جاتی ہیں یا شادی کے جعلی کاغذات عورت کے علم کے بغیر تیار کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسا شادی شدہ جوڑا قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں آ بھی جائے تو کم از کم ابتدائی مرحلہ میں یہ ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا یہ شادی اصل ہے یا محض ایک جرم؟

جبری شادیوں کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 310-الف کے ذریعے غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ تاہم خواتین کی ٹریفکنگ کے تناظر میں اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خواتین کے سرپرست انہیں کچھ رقم کے عوض یا زندگی میں بہتر امکانات کی توقع میں ان کی شادیاں کر دیتے ہوں۔

اگرچہ جبری شادیوں کے تناظر میں عورتوں کی تجارت کے حوالے سے اکثر بحث کی جاتی ہے لیکن والدین اور سرپرستوں کی طرف سے اس طرح کی شادیاں جو زندگی بھر کے مصائب اور استحصال کا سبب بنتی ہیں ان کا عام طور پر تعلق جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک بنگلہ دیش اور نیپال سے بتایا جاتا ہے۔[53] ایسی شادیوں کے پاکستان میں وقوع پذیر ہونے کے قابلِ ذکر ثبوت نہیں ہیں۔ عام طور پر پاکستان کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو جعلی شادیوں کی ایسی صورت کا سامنا اس وقت کرنا پڑتا ہے جب کسی عورت کو دوسرے ملک سے پاکستان میں لایا جاتا ہے یا جہاں پہلے سے اس ظلم کا شکار خاتون کو شادی کی آڑ میں کسی

نئے فرد کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا ہو۔ اس تناظر میں بل کی شق 3 کے بعد موجود شرطیہ جملہ جس میں عورت یا کمسن لڑکی کو قیمتاً بیاہنے کا ذکر ہے، حقائق کے منافی لگتا ہے۔ معاشرے میں ایسا تو ہوتا ہے کہ عورت کی شادی ایسے مرد کے ساتھ کر دی جائے جس کو عورت کا خاندان نہ جانتا ہو لیکن ایسی صورت میں بھی والدین اور سرپرست کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک باعزت گھریلو زندگی بسر کرے۔ اس صورت میں کسی آئندہ ترمیم کا متن زیادہ محتاط ہونا چاہیے، تاکہ اس میں وہ تمام حالات شامل ہوں جہاں شادی یا ہونے والی شادی کا نتیجہ ایک جرم کی صورت میں نکل سکتا ہو اور ان واقعات کو استثنیٰ بھی حاصل رہے جہاں والدین اور سرپرستوں نے عورت کی شادی نیک نیت کے ساتھ کی ہو۔ قانون میں اس نوعیت کا کوئی اضافہ مطلوب ہو تو اس کا بہتر ذریعہ موجودہ قانون میں ترمیم ہے، نہ کہ ایک مکمل نیا قانون۔

ان مردوں عورتوں اور بچوں کی حالت زار کو جو جبری مشقت، عصمت فروشی، استحصال کے الاؤ میں کسی بھی طرح داخل ہوئے ہوں صرف قانون سازی سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً ان لوگوں کے لیے سخت تعزیری اقدامات کی ضرورت ہے جو معصوم لوگوں کی زندگی کو جہنم بناتے ہیں لیکن دوسری کارروائیاں اور اقدامات بھی ہیں جو انسانی تجارت کی روک تھام کے لیے لازمی ہیں۔ ان میں پہلا اور نہایت ضروری ایک ایسے نظام کا قیام ہے جہاں لوگوں کے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کو یکساں مواقع اور سماجی تحفظ حاصل ہو اور احساس محرومی کم سے کم ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ نظرانداز کیے جانے کا احساس اور بہتر مواقع کی خواہش ہی کسی فرد کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا دیتی ہے، جو وعدوں اور دعووں کی صورت میں سبز باغ دکھاتے اور جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مضبوط خاندانی نظام، باہمی محبت اور احترام کے ذریعہ سماجی بندھن کو مضبوط بنانا بھی ضروری ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امن وامان کی صورت حال کو بہتر نگرانی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے چوکس رہنے سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ بالخصوص انسانی تجارت کے حوالے سے اغوا کے واقعات میں کمی لانا بڑی کامیابی ہوگی۔

ایک اور اہم عنصر جو انسانی ٹریفکنگ کو برقرار رکھتا اور اس میں اضافہ کرتا ہے، وہ عوام اور خاص طور پر ان جرائم کا شکار افراد میں نظامِ عدل اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر عدم اعتماد ہے۔ ان اداروں سے کسی مدد کی توقع نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود کو لاوارث اور بے نوا پاتے ہیں اور خود جرائم میں ملوث ہونے

پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑی قابل فہم بات ہے کہ جن لوگوں کو دھوکہ اور فریب کے ذریعہ استحصالی زندگیوں میں دھکیل دیا گیا ہو وہ موجودہ حالات سے باہر نکلنے کی شدید خواہش رکھتے ہوں گے۔ اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے سماجی تحفظ اور قانونی امداد کے نظام کے ساتھ اعتماد اور راست بازی کی شہرت رکھتے ہوں تو اس کا بڑا امکان ہے کہ انسانی تجارت کا شکار بہت سے افراد ان سے رابطہ کریں گے اور اپنے لیے نہ صرف امن اور احترام چاہیں گے بلکہ ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں بھی مدد کریں گے۔ بدقسمتی سے موجودہ حالات میں مظلوم اور بے سہارا لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ناجائز فائدے حاصل کرنے کا ایک دوسرا گروہ سمجھتے ہیں اور اپنی مشکلات کے ازالے کے لیے ان سے رابطہ نہیں کرتے۔ معاشرے میں کسی بھی مثبت تبدیلی کے لیے اس صورت حال کو بدلنا ہوگا۔

انسانی ٹریفکنگ کے امتناع وانسداد کے آرڈیننس کے حوالے سے ایک پہلو جس پر بار بار توجہ دلائی جاتی رہی ہے، یہ ہے کہ بعض معاملات میں یہ پہلے سے موجود قانون کے اوپر قانون سازی ہے۔ مثال کے طور پر اغوا، اغوا برائے تاوان، جبری مشقت، غیر قانونی حراست کی سزائیں تعزیرات پاکستان ضابطہ اور اس آرڈیننس میں بھی موجود ہیں لیکن یہ سزائیں دونوں قوانین میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ اسی طرح جبری مشقت، جبری مشقت کے نظام (تنسیخ) ایکٹ مجریہ 1992ء اور مذکورہ آرڈیننس، دونوں کا تعلق جبری مشقت کے جرم سے ہے اور دونوں اس جرم سے مختلف انداز سے نمٹتے ہیں۔ بعض اوقات یہ قانون دوسرے نافذ قوانین کے ساتھ تضاد بھی رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی تجارت کے آرڈیننس میں متاثرہ غیر ملکی فرد کو ملک میں طویل تر قیام کی اجازت دیتا محسوس ہوتا ہے جو غیر ملکیوں کے ایکٹ مجریہ 1946ء اور امیگریشن آرڈیننس مجریہ 1979ء کے برعکس ہے۔ وفاقی تحقیقاتی ادارہ جسے اس آرڈیننس کے تحت جرائم سے نمٹنے کا اختیار دیا گیا ہے وفاقی وزارت داخلہ کے ماتحت ہے جبکہ اس سے متعلقہ جرائم جو تعزیرات پاکستان ضابطہ یا دوسرے فی الوقت نافذ قوانین کے دائرہ میں آتے ہیں ان سے صوبائی پولیس کے محکمے نمٹتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ قانون اور اس کے نفاذ میں یہ اور دیگر دوسری خامیوں[54] کو نئی قانون سازی کی بجائے قانون کو مزید موثر بنا کر دور کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

موجودہ بحث کے حوالے سے اس امر کی یاددہانی بھی ہونی چاہیے کہ جہاں خواتین کے حقوق

ضروری اور اہم ہیں اور ان کا ترجیحی بنیادوں پر تحفظ ہونا چاہیے وہاں اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کے کچھ ایسے خاص حقوق ہونے چاہییں جن کے مرد بھی یکساں طور پر حق دار ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ عورتوں کے حقوق کی تحریک ایک ایسا رجحان ظاہر کر رہی ہے کہ جو ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کے مقصد کے لیے نقصان دہ ہے۔ مرد اور عورتیں اصل میں انسانیت کی ترقی میں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں اور ان کو مقابلے کے گروہوں میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔

سفارشات

- انسانی ٹریفکنگ کے امتناع و انسداد کا آرڈیننس مجریہ 2002ء اس بل کے مقابلے میں زیادہ جامع ہے۔ آرڈیننس انسانی اسمگلنگ کے فعل کی متعدد اقسام اور شکلوں کی واضح طور پر تعریف و تشریح کرتا اور سخت سزائیں تجویز کرتا ہے۔ عورتوں کی ٹریفکنگ کی روک تھام اور کنٹرول کے لیے نئی قانون سازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

- شادی کے بہانے عورتوں کی تجارت کے معاملات فوری مگر محتاط توجہ اور موجودہ قانون میں ترمیم کا تقاضہ کرتے ہیں۔

- انسانی تجارت کی روک تھام اور اس کے مجرموں کو قانون کے سامنے جواب دہ بنانے کے لیے متعدد قانونی، انتظامی اور سماجی اقدامات درکار ہیں۔ اس جرم کا قلع قمع کرنے کے لیے حقوق، یکساں مواقع، جامع قانون سازی، باہم پیوستہ معاشرہ، اور قابل بھروسہ نظام عدل کا ہونا لازمی ہے۔

- عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ لیکن ہر معاملے میں جنس کو فیصلہ کن عنصر نہ بنایا جائے۔ عورتوں کے لیے مخصوص قانون سازی اور اقدامات اسی وقت ضروری ہیں جہاں کوئی مسئلہ صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہو۔

.....

حواشی

1۔ ضابطہ فوجداری ترمیمی آرڈیننس 2006ء بعد ازاں کئی مرتبہ جاری ہوتا رہا ہے اور آخری مرتبہ 2010ء میں 2010 کے پانچویں آرڈیننس کے طور پر جاری کیا گیا۔ اس وجہ سے یہاں متعلقہ گفتگو میں اس کا حوالہ ''آرڈی ننس V آف 2010'' کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔

2۔ اس آرڈیننس کو 2006ء کے تیرھویں آرڈی ننس، 2007 کے چودھویں آرڈیننس اور بعد ازاں 2007 کے چھتیسویں آرڈیننس کے طور پر جاری کیا گیا۔ آخری مرتبہ جاری کیے جانے کے بعد اسے 18 نومبر 2007ء کو منسوخ ہو جانا تھا لیکن 3 نومبر کو ملک میں ہنگامی حالات کا نفاذ کر دیا گیا اور دستور کو معطل کر دیا گیا۔ عبوری آئینی حکم نمبر 1 مجریہ 2007ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ صدر یا گورنر کا جاری کردہ کوئی بھی آرڈیننس دستور میں مذکور میعاد کا پابند نہیں رہا۔ یہ اصول 3 نومبر 2007ء کو نافذ کی گئی ہنگامی حالت کے نفاذ کے وقت مؤثر قوانین پر بھی لاگو تھا۔

2007ء کا پہلا عبوری آئینی حکم 15 دسمبر 2007ء کو ہنگامی حالت کے نفاذ کے حکم کے آرڈیننس کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا اور دستور کو اس کی ترمیم شدہ شکل میں بحال کر دیا گیا۔ تاہم اس دوران جاری کردہ ہر آرڈیننس کو فراہم کردہ تحفظ اس وقت تک جاری رہا جب تک عدالت عظمیٰ نے 31 جولائی 2009 کے فیصلے میں یہ قرار نہیں دے دیا کہ صدر اور گورنر کے جاری کردہ قوانین کو پہلے عبوری آئینی حکم مجریہ 2007ء کے تحت دیا گیا تحفظ ناقابلِ اعتبار ہے۔ سپریم کورٹ نے یہ بھی حکم دیا کہ ایسے قوانین کو پارلیمان کے سامنے پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

اس طرح 2007ء کا چھتیسواں آرڈیننس، جو اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، اسے سپریم کورٹ کے احکامات کے مطابق 14 اکتوبر 2009ء کو قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس دوران تنسیخ سے بچانے کے لیے یہی آرڈی نینس 26 نومبر 2009 کو (بطور 2009 کا 32واں آرڈی نینس) اور 20 اپریل 2010ء کو (بطور 2010 کا 5واں آرڈیننس) جاری کیا گیا۔ تاہم آخری مرتبہ جاری کیے جانے کے بعد بھی اسے منظور یا منسوخ نہ کیا گیا اور نہ ہی ایک سو بیس دن کی آئینی مدت ختم ہو جانے کے بعد دوبارہ جاری کیا گیا۔ اس کے باوجود عدالتوں میں اس قانون پر عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس قانون کو مجموعہ ضابطۂ فوجداری کے ترمیمی آرڈی نینس مجریہ 2011ء کے ذریعے منسوخ کیا گیا۔

3۔ ''پاکستان پیپلز پارٹی نے آرڈیننس کو خواتین دشمن قرار دے دیا''۔ ڈان، 4 اگست 2006ء

4۔ ایضاً

5۔ ایچ آر سی پی، 2006ء میں انسانی حقوق کی صورتِ حال، انسانی حقوق کمیشن پاکستان لاہور، صفحہ 17۔

6۔ 27 خواتین کو اڈیالہ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ڈان، 12 جولائی 2006ء

7۔ ملکی یا بین الاقوامی قوانین میں دہشتگردی کی کوئی طے شدہ تعریف موجود نہیں ہے تاہم انسدادِ دہشتگردی قانون مجریہ 1997 کی دفعہ 6 میں 15 افعال کو دہشت گردی کے اقدامات قرار دیا گیا ہے جن میں قتل، شدید زخمی کرنا یا چوٹ پہنچانا، املاک کو شدید نقصان پہنچانا، اغوا برائے تاوان، عوام الناس کے لیے شدید خطرے کا باعث بننا، لوٹ کھسوٹ، حکومت یا عوام کو دھمکانا وغیرہ شامل ہیں، اگر ایسے کسی فعل کا مقصد عوام یا حکومت کو ڈرانا، دھمکانا، مصیبت کا شکار کرنا یا عوام یا عوام کے کے ایک طبقے میں خوف وہراس پیدا کرنا ہو۔

8۔ بدعنوانی کے حوالے سے پاکستان میں موجود کسی بھی قانون میں اس جرم کی تعریف موجود نہیں ہے لیکن ان افعال کی ایک فہرست مذکور ہے جن کا ارتکاب بدعنوانی تصور کیا جائے گا۔

9۔ ڈیلی ٹائمز کے مطابق انسدادِ منشیات فورس کے ایک اہلکار کا کہنا تھا کہ منشیات کی سمگلنگ کے لیے خواتین کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ دیکھیے فراز خان، ''غربت خواتین اور بچوں کو منشیات کے دھندے میں دھکیل رہی ہے''۔ ڈیلی ٹائمز، 22 نومبر 2008ء

10۔ خبروں کے مطابق خواتین کو مردوں کو اغواء کرنے سے قبل لبھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھیے اسد کھرل، ''رحیم یار خان: اغوا کی وارداتوں میں غیر معمولی اضافہ'' ایکسپریس ٹریبیون 2 جنوری 2011ء۔ علاوہ ازیں شیر خوار بچوں کے اغواء میں تقریباً ہمیشہ ہی خواتین ملوث ہوتی ہیں۔ دیکھیے: ''ہسپتالوں میں شیر خوار بچوں کی حفاظت''، ڈان، 7 جنوری 2008ء

11۔ انسانی حقوق کے ایشیائی کمیشن کے مطابق سال 2011 کے ابتدائی چار ماہ میں پانچ مردوں اور سات خواتین پر تیزاب سے حملہ کیا گیا۔ http://www.humanrights.asia/news/ahrc-news/AHRC-ART-031-2011

(آخری رسائی بتاریخ 30 جون 2011ء)

12۔ انسانی حقوق سے متعلق کیس نمبر P-12912، 2009ء

13۔ بعدازاں محترمہ ماروی میمن نے قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

14۔ ایسڈ سروائیورز فاؤنڈیشن، سالانہ رپورٹ جولائی 2009 تا جون 2010ء جو کہ http://acidsurviverspakistan.org/reports پر دستیاب ہے۔ (آخری رسائی 2 جولائی 2011ء)

15۔ انسانی حقوق سے متعلق کیس نمبر P-12912، 2009ء

16۔ اقوامِ متحدہ کا ہائی کمیشن برائے مہاجرین بنگلہ دیش، خواتین پر تشدد، بالخصوص گھریلو تشدد اور زیادتی کی شکار خواتین کے لیے دستیاب وسائل،

http://www.unhcr.org/refworld/country,,IRBC,,BGD,,403dd1e40,0.html
(آخری رسائی 30 جون 2011ء)

17۔ ''تیزاب، جرمِ تحریق کے انسداد کا بل جلد پیش کر دیا جائے گا۔'' ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان، 29 ستمبر 2010۔
http://app.com.pk/en-/index.php?option=com-content&task=view&id=117596
(آخری رسائی 30 جون 2011ء)

18۔ اسماغنی، ''حکومت تیزاب کے کنٹرول اور جلانے کے جرمِ کے انسداد کا بل 2010 متعارف کروائے گی''، دی نیشن، 11 ستمبر 2010ء

19۔ ولیری خان، ''تیزاب اور جلانے کے جرائم سے متعلق قانون کی موجودہ کیفیت''، ایسڈ سروائیورز فاؤنڈیشن، 11 اپریل 2011ء

20۔ ''تیزاب سے حملے: مردوں کے شکار ہونے کا امکان بھی یکساں ہے۔'' دی ایکسپریس ٹریبیون، 30 جون 2011ء

21۔ جوفِ بدن سے مراد جسم کا وہ حصہ ہے جس کے نیچے اہم اعضاء موجود ہوتے ہیں۔ پی ایل ڈی 1998ء لاہور 84۔

22۔ اَرش کی مقدار اور ادائیگی کا طریق کار تعزیراتِ پاکستان کی دفعات 337-Q سے 337-X تک میں درج ہیں۔

23۔ مرغینانی، ابوالحسن علی، الھدایۃ، جلد چہارم۔ مکتبہ رحیمیہ دیوبند 1378 ہجری، صفحہ 563۔

24۔ سعید کمال ذبیحفان، ''ایران، آنکھ کے بدلے آنکھ'' کا نفاذ کرتے ہوئے مجرم کو نابینا کرے گا، گارجین، 13 مئی 2011ء
http://www.guardian.co.uk/world/2011/may2011/may/13/iran-blind-criminal-acid
(آخری رسائی 29 جون 2011ء)

25۔ اس مقدمے میں بھی متاثرہ خاتون امینہ بہرامی نے حملہ آور کو یہ کہتے ہوئے معاف کر دیا تھا کہ ''میں سات سال سے قصاص کی طلب گار تھی اور یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ تیزاب سے حملے کی سزا بھی قصاص ہے لیکن آج میں نے مجرم کو معاف کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ میرا حق تھا لیکن ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی متاثرہ فرد ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کر لے۔''
http://www.guardian.co.uk/world/2011/jul/31/iran-acid-woman-paclos-attacker
(آخری رسائی 2 اگست 2011ء)

26۔ فیضان داؤد، تیزاب پھینکنے کے واقعات میں 2012ء کے دوران 89 فیصد اضافہ ہوا، دی ایکسپریس ٹریبیون، 24 جنوری 2013

27۔ دی ایکسپریس ٹریبیون، 24 جنوری 2013ء

28۔ 2004 YLR 25 99

29۔ سورۃ النساء، آیت 24

30۔ مہدی، روبیہ، ''اسلامائزیشن آف لاء اِن پاکستان''، سرے: نورڈ یک انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز، 1994، صفحہ 138۔

31۔ تیسیر الباری شرح صحیح بخاری، تاج کمپنی لمیٹڈ، جلد ششم، حدیث نمبر 271، صفحہ 256۔

32۔ اس خاص واقعہ میں حضرت ہلال رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی بیوی کے خلاف زنا کا الزام ثابت کرنے کے لیے کوئی گواہ موجود نہ تھا لیکن چونکہ میاں بیوی کا تعلق اس قدر مقدس اور نازک ہوتا ہے کہ ایک سلیم الفطرت فرد کسی ایسے کے ساتھ احترام کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتا جسے وہ کسی دوسرے کے ساتھ ملوث دیکھ چکا ہو۔ اسی بنیاد پر لعان کا طریق کار نازل فرمایا گیا (القرآن 24:6-9) اس طرح لعان کی کارروائی کے بعد حضرت ہلالؓ اپنی اہلیہ سے علیحدہ ہو گئے۔ حوالہ ایضاً

33۔ سورۃ النساء، آیت 24

34۔ ''حدود و تعزیرات''، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد، 1986، صفحہ 254۔

35۔ ڈھلوں، آرام پال، جہیز کی ہندو تہذیب کی بنیادیں
http://mohauidya.co/wp-content/uploads/2008/06/dhilon-arampal-dowry.pdf
(آخری رسائی 2 جولائی 2011ء)

36۔ ایضاً

37۔ کچھ لوگ اس کا جواز سنتِ رسولؐ سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی بیٹی سیدۃ فاطمہؓ کی حضرت علیؓ سے شادی کے وقت انہیں کچھ گھریلو اشیاء دی تھیں۔ تاہم یہ بات دلچسپ ہے کہ رسول اللہؐ کی دوسری بیٹیوں کی شادی کے موقع پر اس نوعیت کی کوئی حدیث دستیاب نہیں ہے جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے اولاد کے درمیان امتیاز برتنے سے واضح طور پر منع فرمایا ہے۔ اس لیے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ آپؐ نے خود اپنی بیٹیوں میں سے ایک کو جہیز دینے کے حوالے سے ممتاز جانا ہوگا۔

اہلِ علم کے نزدیک سیدہ فاطمہؓ کو سامانِ زیست دینے کی ایک تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے چچازاد تھے اور بچپن سے ان کی کفالت کی ذمہ داری آپؐ نے ہی اٹھا رکھی تھی۔ جب رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے نئے گھر کے لیے زندگی کی بنیادی ضروریات پر مشتمل کچھ سامان دیا تو آپؐ نے یہ سامان دراصل حضرت علیؓ کو بطور ان کے کفیل دیا ہوگا۔ تاہم اگر مذکورہ روایت کو بطور دلیل قبول بھی کیا جائے تو جہیز کا موجودہ رواج تو کسی طرح اسلام کے مزاج اور اس حدیث کی بنیاد پر سند نہیں پا سکتا۔

38۔ اس مرحلے پر زبردستی شادی کی ممانعت کے حوالے سے اوپر کی گئی بحث پیشِ نظر رہنی چاہیے۔

39۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے 22 دسمبر 2010ء کو سنائے گئے اپنے فیصلے میں تحفظِ خواتین (فوجداری قوانین ترمیمی) قانون مجریہ 2006ء کی بعض دفعات کو منسوخ قرار دیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ میں زیرِ التواء ہے۔

40۔ بطور مثال دیکھیے: محمد تقی عثمانی، حدود قوانین میں ترامیم: تحفظ حقوق خواتین بل-ایک جائزہ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد، 2006ء

41۔ PLD 2009 Lah 362

42۔ لفظی معنی ''قصوروار ذہن''

43۔ بطور مثال دیکھیے: PLD 1975 S.C. 506، PLD 1990 S.C. 899 اور بالخصوص 2009 MLD 71

44۔ ایک انتہائی متنازعہ قدم اٹھاتے ہوئے تحفظِ خواتین (فوجداری قوانین ترمیمی) قانون مجریہ 2006 کے ذریعے تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ 497 کو شامل کیا گیا جس کی رو سے ایک شادی شدہ عورت زنا بالرضا کی صورت میں کسی طرح بھی سزاوار نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔

45۔ بطور مثال دیکھیے:

Wilson, James Q. and Richard J. Herrnstein, "Crime and Human Nature: The Definitive Study of the Causes of Crime" New York: Simon and Schuster Inc. 1986 and Elliott, Doreen, "Gender, Delinquency and Society" England: Avebury, 1988

46۔ مطالعۂ جرائم (کرمنالوجی) کی ذیلی گروہوں کے حوالے سے ایک تھیوری کے مطابق محنت کش طبقات میں موجود بے اطمینانی چھوٹے گروہوں کو جنم دیتی ہے اور ایسے گروہ معاشرتی اقدار کو پامال کرنا پسند کرتے ہیں۔

47۔ بوستامانتے، ہوف مین، ''دی نیچر آف فی میل کریمینیلٹی''، مجلّہ ''ایشوز اِن کرمنالوجی'' جلد ششم شمارہ دوم- بحوالہ ڈورین ایلیٹ، ''جینڈر، ڈیلینکونسی اینڈ سوسائٹی'' ایوبری: انگلینڈ 1988 صفحہ 10۔

48۔ علی حسن، ''منشیات کی نقل و حمل میں خواتین کا کردار بڑھ گیا''، ڈیلی ٹائمز، 23 نومبر 2011۔

49۔ اگرچہ اسلام آباد ہائی کورٹ ایکٹ مجریہ 2010 کے ذریعے دارالحکومت اسلام آباد کے لیے ایک جداگانہ عدالتِ عالیہ کا قیام عمل میں آ چکا ہے لیکن اس کے دائرۂ عمل میں بھی مذکورہ عدالت کی طرف سے مختلف ہدایات نہ ہونے کی صورت میں منشیات سے متعلق مقدمات میں لاہور ہائی کورٹ کی ہدایات مؤثر ہیں۔

50۔ علی حسن، ''چار ماہ میں ضمانت پر رہا کی گئی 102 خواتین مفرور ہوئیں''، ڈیلی ٹائمز، 13 دسمبر 2011۔

51۔ دستورِ پاکستان دفعہ 227 کے مطابق ملک میں قرآن وسنت میں مذکور اسلامی تعلیمات سے متصادم کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔

52۔ جنوبی ایشیا میں ٹریفکنگ سے جنگ (انگریزی) ایشیائی ترقیاتی بینک 2003۔

53۔ ایضاً

54۔ صوفیہ اکرم، ''پاکستان میں انسانوں کی ٹریفکنگ-قوانین اور نقائص''
http://sophiaakram.wordpress.com (آخری رسائی 8 اگست 2012ء)

باب سوم

وراثت سے متعلق قوانین
اور مسوّداتِ قوانین

یہ باب ایسے پانچ مسودات کے تعارف اور جائزہ پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کا مقصد وراثت میں خواتین کے حصہ کی ادائیگی کو یقینی بنانا تھا۔ ان میں سے ایک بل قانون کی شکل اختیار کر کے نافذ العمل ہے جب کہ دیگر مسودات اگرچہ زائد المیعاد ہو کر غیر مؤثر ہو گئے تاہم ان میں بھی معاملہ کے اہم امور کو مختلف حوالوں سے موضوع بنایا گیا ہے۔ فرداً فرداً قانونی مسوّدے کے جائزے سے قبل وراثت کے موضوع پر ایک تعارفی تمہید اور آخر میں ایک مجموعی تبصرہ بھی اس باب کا حصہ ہے۔

وراثت: ایک اہم اسلامی اور قانونی حق

ہر مہذب معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی بھی فوت ہو جانے والے فرد کی ملکیتی جائیداد کی تقسیم کے لیے باقاعدہ نظام مرتب کرے تاکہ معاشرے کو انتشار سے بچایا جائے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام میں ورثاء کے حصص کی وضاحت کی گئی ہے اور ترکے کے حصص اور ان کی تقسیم کے اصولوں کو انسانوں کے قیاس اور فہم پر چھوڑنے کے بجائے خود قرآنِ مجید میں طے کیا گیا ہے۔ مسلم فقہا نے ان احکام کی بنیاد پر علمِ وراثت کو ایک مکمل شعبے کے طور پر مرتب کیا ہے اور نامور فقہاء نے ان تفصیلات کو منضبط کر دیا ہے۔ اَلارمک رمزے (Alarmic Rumsey) اسی وجہ سے کہتا ہے کہ ''محمدی قانون وراثت بلاشک و شبہ جائیداد کی تقسیم کے لیے مہذب دنیا کا سب سے واضح اور تفصیلی نظام ہے۔''[1]

اس موضوع پر واضح اور مستند کتب کی موجودگی میں وراثت کے قانون کو قانونی ضابطہ کی شکل دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ پاکستان میں مسلمانوں کے جانشینی اور وراثت کے معاملات مسلم پرسنل لا (شریعت) کے اطلاق کے ایکٹ مجریہ 1962ء کی دفعہ 2 کی رُو سے شریعت کی روشنی میں طے کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ کار خواتین سمیت تمام ورثاء کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور بیشتر خاندانوں میں قرآن میں بیان کردہ اصولوں کے مطابق وراثت کو منصفانہ طور پر تقسیم بھی کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ وراثت کی تقسیم مذہبی فریضہ ہے اس لیے وراثت کی تقسیم کے اکثر معاملات باہمی طور پر عدالت کی مداخلت کے بغیر طے پا جاتے ہیں تاہم جاگیردارانہ ذہنیت اور بعض ناخوشگوار خاندانی رسم و رواج کی وجہ سے پاکستان کے بعض علاقوں اور خاندانوں میں خواتین کو ان کے قانونی اور اسلامی حقِ وراثت سے محروم کرنے کے واقعات بھی منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ بعض علاقوں میں عورتوں کو خاندانی عزت کے نام پر ان کے حق وراثت سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام میں وراثت کی تقسیم کے بارے میں واضح ہدایات اور تفصیلی رہنما اصول موجود ہیں۔ شریعت اور قانون سے انحراف کے لیے عورتوں کو ان کی وراثت

کے حق سے محروم کرنے اور عدالتی اور انتظامی اداروں کو دھوکہ دینے کے لیے متعدد حیلے، بہانے اور مبنی بر فریب طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ان متعدد مسائل میں سے ایک ہے جن پر معاشرے اور بالخصوص قانون سازوں کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اسی احساس کے تحت زیرِ نظر عرصے میں پارلیمنٹ میں موجود مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اراکین نے وراثت میں خواتین کے حق کو یقینی بنانے کے لیے مختلف طریقے اور اقدامات تجویز کیے۔ وراثت کے موضوع پر تیرہویں قومی اسمبلی میں پانچ مسودات قانون پیش کیے گئے جن میں سے قانون سازی کے تمام مراحل سے گزر کر صرف ایک مسودہ، قانون کا درجہ حاصل کر سکا ہے۔ ان مسوداتِ قانون میں سے ہر ایک کو متعارف کرانے سے پہلے یہ امر مفید ہوگا کہ مرنے والے کی جائیداد کو تقسیم کرنے کے موجودہ قانونی طریقوں کا اختصار سے تعارف کرایا جائے۔

موجودہ قانونی طریقے

اگرچہ اسلامی قانونِ وراثت میں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد میں کوئی فرق نہیں ہے[2] تاہم ملک میں اس وقت تین مختلف قوانین کے مطابق وراثت سے متعلق معاملات طے پاتے ہیں۔ منقولہ جائیداد سے متعلق معاملات جانشینی کے ایکٹ مجریہ 1925ء کے تحت اور شہری جائیداد سے متعلق تنازعات دادرسائی خاص کے قانون مجریہ 1877ء کے مطابق نمٹائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں دیوانی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ زرعی جائیداد سے متعلق معاملات محصول اراضی کے قانون مجریہ 1967ء کے دائرے میں آتے ہیں اور ان کے فیصلے ریونیو عدالتیں کرتی ہیں۔

جہاں تک زرعی جائیداد کا تعلق ہے اراضی کے محصولات کا اندراج کرنے والا اہلکار، جو پٹواری کہلاتا ہے، اس امر کا پابند ہے کہ ورثاء کے نام ملکیت منتقل کرنے کا اہتمام کرے اور اپنے ریکارڈ میں، اپنے دائرہ اختیار کے علاقے کے کسی شخص کے انتقال کی اطلاع دیئے جانے پر اس کے قانونی ورثاء کے نام جائیداد کی منتقلی کا اندراج کرے، جس میں جائیداد کے حصص کی وضاحت موجود ہو اور ہر وارث کے حصے کا تعین ہو۔ تقسیم کے اس خودکار نظام کے اندر کچھ خامیاں بھی ہیں، لیکن بہرحال یہ طریقہ کار ایک

عرصے سے قائم ہے اور اب اس کی مزید بہتری کے لیے بھی کوشش کی جارہی ہے۔

منقولہ جائیداد کے لیے مرحوم کے موجود ورثاء کو دیوانی عدالت سے جانشینی کی تصدیق کروانا ہوتی ہے۔اس پر عدالت ضروری تصدیق کے بعد مطمئن ہونے پر جائز ورثاء کو جانشینی کا سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے۔ جب کہ شہری جائیداد کی تقسیم کے لیے دیوانی عدالت سے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں عدالت صرف ورثاء کا تعین کرتی ہے، یعنی عدالت کی طرف سے متعلقہ حصص کا تعین نہیں کیا جاتا اور نہ ہی عملاً جائیداد تقسیم کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مرحوم کے ورثاء کے درمیان جائیداد کی تقسیم سے متعلق پیدا ہونے والے کسی تنازعے کا فیصلہ دیوانی عدالتیں ہی کرتی ہیں۔

میراث کی تقسیم سے متعلق اگر کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو اس کے ازالے کا نظام بھی موجود ہے، مثلاً اگر کوئی فریق عدالت سے غلط بیانی کی بنیاد پر یا حقائق کو چھپا کر کوئی فیصلہ حاصل کر لے تو متاثرہ فریق مجموعہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ 12 کی ذیلی دفعہ 2 کے تحت اس کے خلاف کارروائی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ناجائز حصہ لینے کے لیے اگر کوئی قانونی میراث اور جانشینی کا سرٹیفکیٹ جعل سازی اور دھوکہ دہی کے ذریعہ حاصل کرے تو متاثرہ فریق اس کو منسوخ کرانے کے لیے دیوانی عدالتوں میں درخواست دائر کر سکتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ اس طرح فریب کیا جائے کہ اس کی جائیداد یا حصہ اس کے علم اور مرضی کے بغیر دھوکہ دہی کے ذریعہ منتقل کرا دیا گیا ہو تو مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعات 415، 416 اور 423 کے تحت ایف آئی آر درج کرا کے فوجداری کارروائی بھی شروع کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی جائیداد کو دھوکہ دہی سے چھپا لیا گیا ہو یا گم کر دیا گیا ہو تو مجموعہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 424 کے تحت قانون کی مدد لی جا سکتی ہے۔

وراثت سے متعلق قوانین میں ترامیم کے لیے مسودات

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان پانچ مسودات قانون کا جائزہ لینا مفید ہوگا جن کو وراثت میں خواتین کے حق کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے موجودہ قانون میں ترامیم کی خاطر پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ ان مسودات میں سے بعض کے محرکین نے وراثت میں حصہ لینے کے پیچیدہ قانونی طریقہ کو مسئلہ

کی بنیاد سمجھتے ہوئے طریقِ کار میں ترامیم تجویز کیں، جبکہ دوسروں نے وراثت سے محروم کرنے پر عائد ہونے والی سزاؤں کو ناکافی یا غیر جامع سمجھا۔ بعض دوسروں نے انصاف کی فراہمی کے عمومی طریقِ کار میں تبدیلیاں تجویز کیں۔ چونکہ ہر مسودے کے محرک نے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مختلف زاویے سے کوشش کی ہے اور متعدد انتظامی، تعزیراتی اور طریقہ کار کی تبدیلیاں تجویز کی ہیں، اس لیے ان پانچوں مسودات قانون میں سے ہر ایک کو ذیل میں متعارف اور زیرِ بحث لایا جا رہا ہے۔ چاروں بلز اور ایک ایکٹ پر الگ الگ، لیکن اختصار کے ساتھ، تبصرے کے بعد وراثت کے مسئلہ پر عمومی تبصرہ، اس کے قانونی طریقہ کار اور اس سے متعلقہ پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ مسئلہ کا تاریخی پس منظر اور اس کے قابلِ عمل حل تجویز کیے جا سکیں۔

۱۔ عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) بل 2009ء

عنوان: عائلی عدالتوں کا (ترمیمی) ایکٹ، 2009ء
پیش کار: طاہرہ اورنگزیب، نگہت پروین میر، بیگم نزہت صادق، پاکستان مسلم لیگ (ن)
بتاریخ: 30 جون 2009ء
موجودہ کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

اس بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ خاندان سے متعلق دوسرے معاملات اور تنازعات کے ساتھ ساتھ عائلی عدالتوں کے ایکٹ کے ضمیمے میں اس موضوع کو شامل کر کے وراثت میں عورتوں کے حصے سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی عائلی عدالتوں کو دے دیا جائے۔ اس بل کے محرکین نے اس کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

''اس بل میں تجویز کیا گیا ہے کہ وراثت میں خواتین کے حصے سے متعلق مقدمات کی جلد اور تیزی سے سماعت کو یقینی بنانے کے لیے عائلی عدالتوں کے ایکٹ مجریہ 1964ء کے جدول میں ان کو شامل کیا جائے جو عورتوں کے وراثت میں حصے کا مسئلہ عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں لے آئے گا۔''

مشاہدات

عائلی عدالتوں کے ایکٹ مجریہ 1964ء (1964ء کے پینتیسویں ایکٹ) کے ذریعے خاندان

کے ادارے سے تعلق رکھنے والے امور اور معاملات کو جلد طے کرنے کے لیے عائلی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔اس قانون کے ساتھ مہیا کردہ ضمیمہ میں عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں شامل دو طرح کے امور کا ذکر کیا گیا ہے۔جدول کے حصہ اول میں نو امور ہیں جو یہ ہیں:۱۔شادی کی تنسیخ ،۲۔مرحوم شوہر کی جائیداد میں حصہ،۳۔نان نفقہ،۴۔حقوقِ زوجیت کی بحالی، ۵۔بچوں کی سپردگی اور والدین کے حقوق ملاقات،۶۔سرپرستی ،۷۔شادی کا جھوٹا دعویٰ، ۸۔جہیز اور ۹۔بیوی کی ذاتی جائیداد اور مال۔زیرِ بحث بل نے تجویز کیا کہ ''وراثت میں عورتوں کے حصے'' کو بھی نمبر شمار ۹ کے طور پر شامل کر کے موجودہ ترتیب کو اس کے مطابق تبدیل کر دیا جائے۔ضمیمہ کے دوسرے حصے میں مجموعہ تعزیراتِ پاکستان مجریہ 1860ء کے تحت ان جرائم کی فہرست دی گئی ہے جن کے ارتکاب پر مقدمات کی سماعت مجسٹریٹ یا سیشن جج نہیں بلکہ عائلی عدالتیں کریں گی۔عورتوں کے وراثت کے مقدمات کو عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں لانے سے مجوزہ قانون کا مقصد خواتین کو دیوانی عدالتوں میں دعویٰ دائر کرنے کے لیے درکار بھاری فیسوں سے بچانا اور عائلی قوانین کے ایکٹ مجریہ 1964ء کی دفعہ 12۔الف کے مطابق ان مقدمات کا فیصلہ مقررہ چھ ماہ کے عرصے میں صادر کرنا تھا۔

تبصرہ

چونکہ عام عدالتی طریقِ کار کے مطابق کسی مقدمہ کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا ایک طویل، مہنگا اور پریشان کن عمل ہوتا ہے، اس لیے مسلم عائلی قوانین آرڈی نینس مجریہ 1961ء اور مغربی پاکستان عائلی عدالتوں کا ایکٹ مجریہ 1964ء نے خواتین کو عام عدالتی طریقہ کار سے ہٹ کر خاندانی تنازعات و معاملات حل کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔عائلی عدالتوں کا ایکٹ مجریہ 1964ء ایک ایسا عدالتی راستہ مہیا کرتا ہے جو خاندان سے متعلق امور اور دعووں کو کم خرچ اور کم وقت میں نمٹاتا ہے۔بالعموم وراثت سے متعلق مقدمات بڑے تکلیف دہ، طویل اور مہنگے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ عام دیوانی عدالتوں کا ماحول بھی اس حد تک ناخوشگوار ہوتا ہے کہ بعض اوقات خواتین اس سے بچنے کے لیے وراثت میں اپنے قیمتی اور یقینی حق تک کو قربان کر دیتی ہیں۔

عائلی عدالتوں کی ایک اور خاص بات عدالتی فیصلے سے قبل مصالحت کے لیے لازمی کوشش بھی ہے، جس کا مقصد تنازعہ کو متبادل طریق کار سے اس طرح طے کرنا ہے کہ فریقین کے درمیان خاندانی تعلقات بھی قائم رہیں اور عدالت کے زیرِ اثر باہم تنازعات حل بھی ہو جائیں۔[3] ایسی مصالحاتی کوششیں دیوانی یا ریونیو عدالتوں کے طریقہ کار کا حصہ نہیں ہیں۔

اس سیاق وسباق میں اس بل کی تجویز بظاہر ان تمام لوگوں کے لیے متاثر کن ہے جو عورتوں کی فلاح وبہبود کی فکر کرتے ہیں، تاہم اس تجویز کے کچھ پہلو اسے کم پرکشش بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر تجویز کردہ صورت میں عائلی عدالتیں صرف وراثت کے ان مقدمات کا فیصلہ کریں گی جن کا تعلق عورتوں کے حصے سے ہوگا، جبکہ دیگر صورتوں میں وراثت، موجودہ طرزِ عمل کے مطابق، دیوانی اور ریونیو عدالتوں ہی کا موضوع رہے گا۔ ہوتا تو یوں ہے کہ وراثت کے زیادہ تر مقدمات کے فریقین میں وارث مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس تجویز کے مطابق قانون سازی کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ہی مقدمہ بیک وقت دو مختلف عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں آئے گا۔ اگر صرف عورتوں کی وراثت سے متعلق امور کو عائلی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں دے دیا جائے تو عمومی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مختلف عدالتوں سے متضاد فیصلے صادر ہوں اور دیگر ابہام بھی پیدا ہوں۔

سفارشات

- وراثت کا مسئلہ جنس کی بنیاد پر مختلف فورمز پر حل نہیں کیا جا سکتا، اسے ایک ہی فورم پر حل ہونا ہے۔ عورتوں کے حقِ وراثت کی یقینی فراہمی کے لیے سماجی، انتظامی اور قانونی اقدامات (جن پر بعد میں بحث ہوگی) کو بروئے کار لایا جانا چاہیے۔

۲۔ ضابطہ دیوانی (ترمیمی) بل 2010ء

اس بل نے مجموعہ ضابطہ دیوانی مجریہ 1908ء (1908ء کا پانچواں ایکٹ) کی تعریفات کی حامل دفعہ 2 میں ذیلی دفعہ (1) کے بعد مندرجہ ذیل ذیلی دفعہ شامل کرنے کی تجویز پیش کی تھی:

''وراثت کی عدالت کا مطلب وراثت کی عدالت ہے۔ اور وراثت سے متعلقہ دیوانی معاملات،

خواہ ان کا تعلق عورتوں سے ہو یا دوسرے قانونی ورثا سے، دیوانی عدالت کے سامنے لایا جائے گا جس کو وراثت کی عدالت کہا جائے گا۔ جب بھی دیوانی معاملے سے تعلق رکھنے والا کوئی دیوانی تنازعہ وراثت کے امور کی عدالت کے طور پر کام کرنے والی دیوانی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو یہ پہلے قانونی ورثاء کے درمیان مصالحت کی کوشش کرے گی۔ مصالحتی عدالت فریقین کو حکم دے گی کہ وہ ثالث کا کردار ادا کرنے کے لیے دو بزرگوں کو پیش کریں جو ورثاء کے درمیان تنازعہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ان میں مصالحت ہوجاتی ہے تو وراثت کے امور کی عدالت تنازعہ کے دعویٰ کا فیصلہ قانونی ورثاء کے درمیان طے شدہ سمجھوتے کی شرائط کے مطابق کرے گی۔ مصالحت میں ناکامی کی صورت میں عدالت اس ناکامی کے چھ ماہ کے اندر دعویٰ کا فیصلہ کرے گی۔''

عنوان: ضابطہ دیوانی کا (ترمیمی) بل 2010ء
پیش کار: جسٹس (ر) فخر النساء کھوکھر، پاکستان پیپلز پارٹی
بتاریخ: 23 فروری 2010ء
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

بل کے اغراض و مقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا:

''عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ تمام حقیقی ورثاء، خصوصاً خواتین، یتیم، بیوائیں، ضعیف العمر اور ناتواں افراد طویل مقدمہ بازی کی ذہنی کرب اور اذیت سے گزرتے ہیں، جو انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔ دوسری جانب دیوانی عدالتیں دیوانی مقدمات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں اس لیے وہ مقدمات کا جلد فیصلہ نہیں کرسکتیں۔ اس بل کی منظوری کے بعد جب یہ مقدمات ایک مقررہ مدت کے اندر فیصلہ کے لیے پیش کیے جائیں گے تو عدالت وراثت کے معاملے کا فیصلہ وقت پر کرنے کی پابند ہوگی۔ یہ بات مقدمہ بازوں کے لیے سکھ کے سانس کا باعث بنے گی''۔

مشاہدات

یہاں یہ یاد دلانا مفید ہوگا کہ وراثت سے متعلق امور جائیداد کی نوعیت کے لحاظ سے دیوانی اور ریونیو کی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ اور یہ بات درست ہے کہ پیچیدہ قانونی طریقوں اور دیگر اسباب کی وجہ سے جہاں سول عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ہے، جائیداد اور وراثت سے متعلق

مقدمات برسوں بلکہ بعض اوقات نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔اس کا مجموعی اثر زیرالتوء مقدمات کی مزید بھرمار کی شکل میں خاص طور پر دیوانی عدالتوں اور مقدمہ بازوں کی مشکلات کی صورت میں نکلتا ہے۔یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اس صورت حال سے خواتین، بچے اور معاشرے کے دوسرے کمزور لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

تبصرہ

یہ بل تاخیر سے فیصلوں کی اس اذیت کے خلاف تشویش کا ایک اظہار تھا جس سے وراثت کے جائز حقدار کو اپنا حق حاصل کرنے کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔محرکین کی اس سوچ کے قابلِ تعریف ہونے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ عملاً یہ بل وراثت سے متعلق امور کے فیصلوں کے لیے کسی نئی عدالت کے قیام کی تجویز نہیں دیتا۔ مجوزہ ذیلی دفعہ کے مطابق وراثت سے متعلق دعویٰ ان ہی دیوانی عدالتوں میں دائر کیا جائے گا، جہاں اس وقت رائج طریقے کے مطابق دائر کیا جاتا ہے۔اسی عدالت کو مذکورہ مقدمات کے لیے وراثت کی عدالت قرار دے لیا جائے گا۔اگر عملاً کوئی فرق تجویز کیا گیا تھا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ دیوانی عدالتوں میں عائلی عدالتوں کی دو خصوصیات کو اپنا لیا جائے ،یعنی اولاً عدالت فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کرے گی اور ثانیاً فیصلہ کا اعلان مصالحت میں ناکامی کے چھ ماہ کے اندر کر دیا جائے گا۔

جہاں تک مصالحتی کوششوں کا تعلق ہے،اس نوعیت کی تجویز کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔کسی بھی تنازعہ کا بہترین فیصلہ وہی ہوتا ہے جو فریقین کے درمیان کسی مقدمہ بازی اور جھگڑے کے بغیر طے ہوجائے۔تاہم ایسے میں یہ خیال بھی رہنا چاہیے کہ ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں ہے جہاں ایک فریق ایسے مواقع کو فیصلے میں مزید تاخیر کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔اسی وجہ سے عائلی عدالتوں کے ایکٹ میں مصالحت کرنے کے لیے پندرہ دن کا وقت مقرر ہے۔اسی طرح عائلی عدالتوں کو شادی کی تنسیخ ، مرحوم شوہر کی جائیداد سے بیوہ کو ملنے والی جائیداد کا حصہ، نان نفقہ اور سرپرستی جیسے مقدمات کا فیصلہ چھ ماہ کے اندر کرنا ہوتا ہے۔لیکن جائیداد کی تقسیم جیسے پیچیدہ سوالات والے مقدمات کے منصفانہ فیصلے کے لیے زیادہ وقت درکار ہوسکتا ہے۔مشہور محاورہ ''انصاف میں تاخیر انصاف کا انکار ہے''

جس کا حوالہ اغراض ومقاصد اور وجوہ میں دیا گیا ہے، سے متعلقہ ایک اور محاورہ یہ بھی ہے کہ ''انصاف میں جلد بازی انصاف کی تدفین ہے''۔ جلدی میں کیے گئے فیصلوں کے نتیجے میں ان امور کے خلاف اپیل دائر کر دی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں ان مقدمات کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقی تشویش کے باوجود بل عملی طور پر کوئی قابل غور چیز پیش نہیں کر سکا۔ اغراض ومقاصد اور وجوہ کے بیان میں ظاہر کی گئی نیت بھی بل کے متن میں پیش کی گئی تجویز سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ موجودہ دیوانی عدالتوں کو وراثت کی عدالتوں کے طور پر کام کرنا ہوگا، اس لیے عدالتوں کے زیادہ مقدمات کے بوجھ تلے ہونے کی تشویش کا مسئلہ مجوزہ صورت میں حل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے برعکس مقدمے کو چھ ماہ میں مکمل کرنے کا اضافی تقاضا عدالتوں پر مزید بوجھ کا باعث ہوگا۔

بل میں خواتین کا خاص ذکر محرک کی نظر میں ان کے حقوق کے حوالے سے فکرمندی کی حامل ہے لیکن زیادہ بہتر صورت یہ ہوگی کہ کسی اضافی اقدام کا فیصلہ تمام افراد اور بالخصوص تمام کمزور طبقات کو ضرور پہنچے۔

سفارشات

- دیوانی عدالتوں کو وراثت کی عدالتوں کا نام دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ضرورت ہے کہ قانون ساز اس صورت حال کو پہلے اچھی طرح سمجھیں، جس کو وہ بدلنا چاہتے ہیں اور پھر حل نکالنے کے لیے گہرا غور وفکر کریں۔ مقدمات کی طوالت اور پیچیدگی کی وجوہات عدالتوں پر کام کا بوجھ ہے تو اس کی اصلاح کے لیے ایک جامع اور مربوط پروگرام بنانا ہوگا۔
- ثالثی کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کو تمام دیوانی معاملات میں اختیار کرنا چاہیے لیکن ضروری احتیاط کے ساتھ۔
- اراضی کے پیچیدہ ریکارڈ کو آسان بنایا جائے جس کے لیے ایک مکمل اسکیم درکار ہوگی۔ الگ تھلگ کوششوں یا پیوندکاری سے صورت حال میں کسی بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بعد کے حصے میں بعض تجاویز دی گئی ہیں۔

۳۔ فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009ء

اس بل نے فوجداری قانونی ضوابط تعزیرات پاکستان مجریہ 1860ء اور ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی متعدد دفعات میں ترامیم تجویز کی تھیں۔ بل کی دوسری دفعات (جن کا تعلق جہیز کی بنیاد پر قتل اور خفیہ شادی سے تھا) پہلے ہی زیر بحث آ چکی ہیں۔ بل کی وراثت سے متعلق شق نے تعزیرات پاکستان کے ضابطہ مجریہ 1860ء میں مندرجہ ذیل دفعہ شامل کرنے کی تجویز دی تھی۔

424-ا: قانونی وارث کو دھوکہ دینا: جو کوئی فریب کاری کے ذریعہ خاتون قانونی وارث کو کسی صاحبِ جائیداد کی وراثت میں اس کے جائز حصے سے محروم کرنے کی نیت سے چھپاتا، اصل قانونی وارث کے بجائے دھوکہ سے خود کو قانونی وارث ظاہر کرتا، یا کسی خاتون صاحبِ جائیداد یا وارث کو رجسٹرڈ دستاویز، انتقال یا کسی دوسری سہولت یا عدالتی فیصلے کے ذریعہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ جائز وارث یا مالک کی طرف سے نہیں، محروم کرتا ہے، اسے 10 سال تک کی قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی سزاوار ہوگا، جو پانچ لاکھ روپے تک ہوسکتا ہے۔

عنوان: فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2009
پیش کار: ماروی میمن، پاکستان مسلم لیگ ق
تاریخ: 14 اپریل 2009
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

بل کی محرکہ نے اس تجویز کے حق میں اغراض و مقاصد اور وجوہ کو ان الفاظ میں بیان کیا:

''بعض لوگ کسی حقیقی وارث خاتون کو محروم کرنے کے لیے دوسری خواتین کو قانونی وارث کے طور پر پیش کر کے اصل وارث عورت کی جائیداد کو ہتھیا کر اپنے نام منتقل کرا لیتے ہیں اور حقیقی وارث عورت ہمیشہ کے لیے اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔''

مشاہدات

بل کی محرکہ نے 22 جون 2011ء کو قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا، اور اس بات کا امکان ہے کہ بل پیش کرنے والی رکن کی غیر موجودگی میں دیگر اراکین نے اس کی منظوری میں دلچسپی نہ لی ہو۔

تبصرہ

کسی مرحوم شخص کی جائیداد کی تقسیم محکمہ مال کے افسران کی سرگرم مداخلت (زرعی جائیداد کی صورت میں) اور (منقولہ اور شہری جائیداد کی صورت میں) دیوانی عدالتوں کے تعاون سے عمل میں آتی ہے۔ وہ لوگ جو دوسروں کی جائیداد کو غصب کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اس جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے متعدد ترکیبیں اور حربے اختیار کرتے ہیں اور اس طرح وہ قانونی ورثاء کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ اکثر اوقات ایک شخص جب عدالت سے وراثت (منقولہ جائیداد کے لیے) اور جانشینی کا سرٹیفکیٹ (شہری جائیداد کے لیے) حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے تو وہ ایک یا ایک سے زیادہ قانونی ورثا سے یہ بات چھپا لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے تمام واقعات میں عدالتیں یہ حکم دیتی ہیں کہ دعویٰ اور دعویداروں کو اخبارات کے ذریعہ مشتہر کیا جائے تا کہ کوئی ایسا شخص جس کو اعتراض ہو یا دعویٰ میں دلچسپی رکھتا ہو عدالت کے سامنے پیش ہو، اور اس طرح فیصلہ حقائق کی بنیاد پر کیا جائے۔ یہ طریق کار بھی بعض اوقات اس لیے ناکام ہو جاتا ہے کہ اخبار میں ایک چھوٹا سا اشتہار اس شخص کی توجہ حاصل نہیں کر سکتا جس سے یہ بات چھپائی گئی ہو۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ عدالت سے رجوع کرنے والے افراد عدالتی عملے کی ملی بھگت سے اشتہار محدود اشاعت والے غیر معروف اخبارات میں شائع کرا دیتے ہیں۔ اگر محروم رکھا جانے والا فرد دوسرے شہر یا ملک میں مقیم ہو تو اس بات کا امکان مزید بڑھ جاتا ہے کہ اسے اس تمام کارروائی کا علم ہی نہ ہو پائے۔

اسی طرح اگر دعویٰ میں اصلی ورثا کے نام درج ہوں تو بھی مدعی سرٹیفکیٹ کے اجراء کے وقت کسی جعلی فرد کو بطور وارث پیش کر سکتا ہے۔ پھر ایسا جعلی فرد عموماً عدالت ہی میں بیان دے کر مدعی کے حق میں دستبردار ہو کر اپنی اجرت کا تو حق ادا کر دیتا ہے لیکن اس مکروہ عمل میں ایک حق دار اپنے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسی دستبرداری وقوع پذیر نہ بھی ہو تو جائیداد کا اصل قبضہ درخواست گزار کے پاس ہی رہتا ہے۔

زیرِ بحث بل کا مقصد اصل میں ایسی بدعنوانیوں کی روک تھام اور ایسے تمام حالات کا مداوا تھا جہاں کوئی شخص قانون کی عمل داری کو فریب اور غلط بیانی کے ذریعہ دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ ایسی غیر قانونی اور

غیر اسلامی حرکتوں کا شکار کوئی بھی شخص ہوسکتا ہے لیکن واضح طور پر بچے، خواتین، ضعیف اور غریب افراد تو آسان شکار ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بل صرف جنس کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا اور اس کا مقصد صرف حقوقِ نسواں کا تحفظ تھا۔ یہ شاید اس لیے قابلِ فہم بھی ہے کہ خواتین کے حقوق سے متعلق تو اکثر آواز اٹھائی جاتی ہے لیکن معاشرے کے دوسرے کمزور طبقات کی مشکلات اور مسائل کی تفہیم اور تشہیر کم ہوتی ہے۔ ان کے معاملے کو سماجی سطح پر میڈیا میں اس جوش و جذبے کے ساتھ نہیں اٹھایا جاتا جس طرح عورتوں کے لیے آواز بلند کی جاتی ہے۔ کسی کاوش کو ایسے مسائل کے لیے جنس کے ساتھ مخصوص کرنا جو نوعیت کے لحاظ سے عام ہیں، نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ امتیازی بھی ہے۔

یہ درست ہے کہ تمام حالات میں جہاں کسی جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ ہوتا ہے، عدالتیں ان حیلوں اور حربوں سے واقف ہوتی ہیں جو دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کے لیے کچھ بدنیّت افراد اختیار کرتے ہیں اور اس لیے ایسے فیصلوں میں مناسب احتیاط بھی کرتی ہیں لیکن زیرِ التوا مقدمات کی بھرمار اور دوسرے اداروں اور محکموں کی طرف سے مؤثر حمایت کی عدم موجودگی کی وجہ سے عدالت میں تمام مقدمات میں ہر پہلو سے شفاف کارروائی مشکل ہوجاتی ہے۔ متاثرین کے لیے یقیناً قانونی ازالے دستیاب ہیں جو دیوانی دعووں کی شکل میں ہیں، تاہم وہ نہ صرف طویل مدت بلکہ مالی اخراجات کے علاوہ صبر بھی چاہتے ہیں۔ اسی طرح اس حوالے سے موجود سزائیں، جیسا کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان مجریہ 1860ء کے باب سترہ میں مذکور ہیں، عام نوعیت کی ہیں۔ یہ سزائیں کم بھی ہیں اور خاص ایسے حالات سے متعلق بھی نہیں۔ اس لیے اس تجویز پر غور کیا جانا چاہیے کہ کیا عدالتوں کو ایسے محدود تعزیری اختیارات دیئے جاسکتے ہیں، جن سے وہ ان لوگوں سے سختی کے ساتھ نمٹ سکیں جو نہ صرف کسی دوسرے فرد کو اس کے جائز حق سے محروم کرتے ہیں بلکہ عدالت کو بھی جعل سازی اور حقائق کو چھپا کر دھوکہ دیتے ہیں۔ تجویز کردہ سزا یعنی قید (محض یا سخت) جو 10 سال تک اور جرمانہ جو پانچ لاکھ روپے تک ہوسکتا ہے، مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مسودہ قانون میں ایک خامی یہ نظر آتی تھی کہ اس میں سزا صرف اس شخص کے لیے تجویز کی گئی تھی جو خود کو جعلسازی سے اصل قانونی وارث کے بجائے قانونی وارث قرار دیتا ہے، اس شخص کا ذکر ہی نہیں تھا جس کی طرف سے وہ یہ کام کرتا ہے۔ قانون کو یقینی طور پر ایسے مرد یا عورت کو سزا دینی چاہیے جو ایک غیر قانونی کام کے لیے اپنی

خدمات پیش کرتا ہے، مگر اس شخص کے لیے سخت تر سزا تجویز کرنی چاہیے جو اصل میں یہ قبیح حرکت کرا رہا ہے۔

حالیہ برسوں میں جائیداد کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور آئندہ مزید بڑھتی رہیں گی۔ اس صورت میں اگر ملزم کو بل میں تجویز کردہ زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ روپے جرمانہ کی سزا دی بھی جائے تو یہ غصب کردہ زمین کا ایک بہت ہی کم حصہ کے مساوی ہوگا، اس طرح یہ جرمانہ غاصب کو جرم سے روکنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے بجائے جائیداد کے ایک تناسب کے مطابق رقم کو جرمانے کے طور پر متعین کرنا مؤثر رکاوٹ ثابت ہوسکتی ہے۔

سفارشات

- لوگوں کے حقوق کی پاسداری کے لیے جو تحفظات فراہم یا تجویز کیے جائیں، ان کا فائدہ معاشرے کی کسی خاص جنس یا طبقے تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ فائدہ ان تمام افراد کے لیے دستیاب ہونا چاہیے جو لاقانونیت کا نشانہ بنیں اور جنہیں ان کے جائز حق سے محروم کیا گیا ہو یا اس کا امکان ہو۔
- زیرِغور بل معاشرے میں عملی صورت حال کی قابل تعریف سمجھ بوجھ اور قابلِ قدر تجویز کا حامل تھا۔ جو تشویش اس بل کی بنیاد بنی ہے، اس کو فوجداری قانون (تیسری ترمیم) کے ایکٹ مجریہ 2011ء کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس پر ذیل میں بحث کی جائے گی۔

۴۔ فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء

عنوان: فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء
پیش کار: چوہدری پرویز الٰہی اور دیگر، پاکستان مسلم لیگ ق
تاریخ: 10 جون 2008ء
کیفیت: 26 دسمبر 2011ء سے قانون بن گیا۔

فوجداری قانون (تیسرے ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء میں خواتین سے متعلق امور پر مشتمل ہے اور اس میں شامل عورتوں کو بدلِ صلح کے طور پر بیاہنے، جبری شادی، قرآن کے ساتھ شادی پر پابندی جیسے معاملات پر پہلے ہی اس مطالعہ میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس قانون کے ذریعے مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں نئی داخل کردہ دفعہ 498-الف جس کا تعلق وراثت سے ہے، درج

ذیل ہے:

498-الف: عورت کو جائیداد کی وراثت سے روکنے کا امتناع

''جو کوئی وصیت کھولے جانے کے وقت دھوکہ یا غیر قانونی طریقے سے کسی عورت کو کسی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کا وارث بننے سے روکے، تو اسے زیادہ سے زیادہ دس سال تک اور کم از کم پانچ سال قید (محض یا سخت) یا دس لاکھ روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی''۔

محرکین نے اغراض و مقاصد اور وجوہ میں اس ضرورت کا اظہار کیا ہے کہ معاشرے میں ان تمام غلط اور بے جا افعال و رسومات کی روک تھام کی جائے جو اسلامی احکامات کے خلاف اور انسانی حقوق کے منافی ہیں۔

مشاہدات

فوجداری قانون (تیسرے ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2011ء نے پاکستان کے تعزیری قانون میں ان غلط کاموں سے نمٹنے کے لیے متعدد قانونی دفعات کا اضافہ کیا ہے، جو ذاتی اور محدود مفادات کے لیے معاشرے کی اسلامی روح کو نقصان پہنچا کر خاندان کے ادارے اور معاشرتی بندھنوں کو کمزور کر رہے ہیں۔ اس قانون کے تحت عورتوں کے خلاف ظالمانہ سرگرمیوں میں ملوث افراد کے لیے سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ انہی سرگرمیوں میں خواتین کو وراثت سے محروم کرنا بھی شامل ہے۔

ابتداء جب یہ بل 10 جون 2008 کو قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا، تو اس میں خواتین کو منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی وراثت سے غیر قانونی طور پر یا دھوکہ دے کر محروم کرنے والے کے لیے کم از کم سات سال قید اور دس لاکھ روپے جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی تھی۔ قانون سازی کے مختلف مرحلوں سے گزرنے اور مجلس قائمہ اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں مشاورت کے بعد قید (محض یا سخت) کی زیادہ سے زیادہ حد دس سال اور کم از کم حد پانچ سال یا دس لاکھ روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں تجویز کی گئیں۔ اصل بل میں تجویز کردہ سزا قید محض کی تھی و راس کی کوئی بالائی حد بھی مقرر نہیں تھی۔ نیز یہ کہ ہر صورت میں جرمانہ سزا کے ساتھ لازم تھا۔ قانون بن جانے کے بعد قید کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم حد مقرر کرنے کے علاوہ

عدالت کو یہ صوابدید دی گئی ہے کہ وہ حقائق کی روشنی میں قیدِ محض یا قیدِ سخت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ اسی طرح عدالت قانون شکن کو جرمانہ کی سزا دینے یا نہ دینے کا بھی صوابدیدی اختیار رکھتی ہے۔

مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1998ء کے ضمیمہ دوم میں ایک اندراج کے ذریعہ اس دفعہ کے تحت جرم کو ناقابلِ ضمانت اور ناقابلِ مصالحت بنادیا گیا ہے۔ تاہم ملزم کو ایف آئی آر کی اندراج پر گرفتار نہیں کیا جائے گا، گرفتاری سیشن عدالت کے وارنٹ گرفتاری کے اجراء کے بعد ہی عمل میں آئے گی۔

تبصرہ

اس ایکٹ میں عورتوں کو فریب کاری کے ذریعہ ان کے حق وراثت سے محروم کرنے پر سزا تجویز کی گئی ہے۔ عام طور پر کسی جائز وارث کو وراثت سے محروم کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں: دیوانی یا فوجداری۔ مثال کے طور پر دیوانی نوعیت میں یہ ممکن ہے کہ جانشینی کے اعلان یا وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے دعویٰ میں ایک یا دو قانونی ورثا کے ناموں کا ذکر نہ کیا جائے یا جان بوجھ کر چھپا لیا جائے۔ فوجداری نوعیت کے امور میں اس امر کا امکان ہے کہ کوئی شخص دھوکہ سے یا جعلسازی کا ارتکاب کر کے اصل مالک کی جائیداد کو کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کر دے یا فروخت کر دے۔ یہ ذکر گزر چکا ہے کہ دیوانی اور فوجداری ، دونوں صورتوں میں ایسے واقعات سے نمٹنے کے لیے قانونی طریقے پہلے بھی موجود ہیں، مگر وہ نوعیت کے لحاظ سے عمومی ہیں اور لوگوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کے جرم کے مقابلے میں نرم معلوم ہوتے ہیں۔

اس ترمیم کی منظوری کے نتیجے میں یہ حوصلہ افزا بات ہے کہ اب ملک میں ایک خاص قانون موجود ہے جس کا اطلاق ان تمام حالات پر ہوتا ہے جن میں ایک عورت کو اس کے قریبی رشتہ داروں کی طرف سے جائیداد میں اس کے حق سے محروم کیا جاتا ہے۔ تاہم عملی صورتِ حال کی تبدیلی میں بڑا وقت لگے گا، اور خدشہ ہے کہ اس بل کی منظوری کے بعد بھی خواتین کو قانونی و عدالتی جنگ کی تکلیف کو سہنا پڑے گی۔ کسی عورت کو جائیداد میں حصہ دار بننے سے محروم کرنے کا جرم قابلِ دست اندازی پولیس نہیں ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے دعویٰ دائر کرنے اور مقدمہ لڑنے کے علاوہ محروم عورت کو سیشن عدالت میں فوجداری مقدمہ درج کرا کے ملزم کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری کروانا ہوں گے۔ اگرچہ یہ بات معقول معلوم ہوتی

ہے کہ ایک شخص کو آزادی سے صرف اسی وقت محروم کیا جائے کہ جب اس کے ایک جرم میں ملوث ہونے کا واضح امکان ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور بالخصوص پولیس مظلوم کو ضروری تحفظ فراہم نہیں کرتی اور وہ بہتر سماجی اور معاشی مقام کے حامل ظالم کی طرف سے انتقامی کارروائی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اگرچہ یہ ایکٹ عورتوں کے حقوق کو حاصل کرنے کی جانب ایک مثبت قدم ہے، جیسا کہ اسلام اور قومی قانون نے ان حقوق کی ضمانت دی ہے، تاہم معاشرے اور سرکاری اداروں کی ذہنیت کو بدلنے کے لیے بھی اقدامات عمل میں لانا ہوں گے۔

یہاں بھی یہ ذکر مناسب ہوگا کہ وراثت کے معاملے میں استحصال اور ظلم کا شکار صرف عورتیں ہی نہیں ہیں۔4 ہر کمزور اور ناتواں شخص کے حقوق طاقت ور کے ہاتھوں خطرے میں ہیں اور ریاست شاذ و نادر ہی معاشرے کے پسماندہ طبقات کے حقوق کو محفوظ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس لیے اس قانون کا دائرۂ اطلاق بڑھا کر نوعیت میں عام بنا دیا جانا چاہیے۔ معاشرے اور خاص طور پر سرکاری اداروں کو چاہیے کہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں حساسیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر تمام کمزور طبقات پر توجہ دیں، تاکہ سب ہی کے حقوق کا احترام اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی جا سکے۔

سفارشات

- چونکہ زیرِ بحث مسئلہ صرف عورتوں تک محدود نہیں ہے اس لیے ایکٹ کو نوعیت میں عام بنایا جائے۔
- اس پر نظر رکھی جائے کہ یہ ایکٹ بھی محض ایک اور قانون کا اضافہ ثابت نہ ہو جو پہلے سے موجود کئی قوانین کی طرح عوام کے حالات میں کوئی حقیقی تبدیلی نہیں لا سکے۔ ضروری ہے کہ حکومت اس کے نفاذ کے لیے قابل عمل اور سازگار ماحول پیدا کرے۔

۵۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی (ترمیمی) بل 2008ء

اس بل نے مجموعہ ضابطہ دیوانی مجریہ 1908ء کی دفعہ 9 میں دو ذیلی دفعات شامل کرنے کی تجویز دی تھی، جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

''(2)اس کے باوجود کہ جو کچھ ضابطہ میں یا اس وقت نافذ العمل کسی دوسرے قانون میں موجود ہے، عدالتیں ایسے دعووں میں، جہاں جانشینی، وراثت یا دونوں کا تعلق ہو، تمام حصہ داروں خصوصاً عورتوں کے حصوں کا، کسی بھی جائیداد میں حصے سے دستبرداری یا رضامندی پر مشتمل کسی بیان یا ایسی دستاویز کو جس میں ایسا بیان یا رضامندی موجود ہو، قبول کیے بغیر تعین کریں گی اور ہر ایک وارث یا حصہ دار کو ایسا حصہ جیسا بھی معاملہ ہو، منتقل کرنے کا حکم دیں گی۔

عنوان: ضابطہ دیوانی (ترمیمی) بل 2008
پیش کار: مسز بیگم حسنین، پاکستان پیپلز پارٹی
بتاریخ: 12 اگست 2008
کیفیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

''(3)اس کے باوجود کہ جو کچھ ضابطہ میں یا اس وقت نافذ العمل کسی دوسرے قانون میں موجود ہے مرد ورثاء کے نام ایسی تمام ادائیگیاں اور منتقلیاں، جن کا تعلق جائیداد سے ہو، جو اس نے اپنی زندگی میں ممکنہ خواتین ورثاء کو محروم کرتے ہوئے صرف ممکنہ مرد ورثاء کے نام کی گئی ہوں، اس کی وفات کے بعد مؤثر نہیں رہیں گی اور ذیلی دفعہ (2) کا اطلاق ہوگا''۔

محرک نے بل کے اغراض ومقاصد اور وجوہ بیان کرتے ہوئے ان رویوں اور رسوم پر اظہار افسوس کیا تھا جن کو اختیار کر کے بچیوں اور عورتوں کو مختلف حوالوں سے ان کے وراثت کے قانونی اور اسلامی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے بل نے وراثت میں عورتوں کے اسلامی اور قانونی حقوق کی فراہمی یقینی بنانے کا تقاضا کیا تا کہ انہیں سماجی زندگی میں ایسی تکلیف دہ مشکلات سے محفوظ کیا جائے۔

مشاہدات

مجموعہ ضابطہ دیوانی مجریہ 1908ء کی دفعہ 9 کسی معاملے کی سماعت، فیصلہ کرنے یا اس سے متعلق اختیار استعمال کرنے کے حوالے سے عدالت کے اختیار کا تعین کرتی ہے۔ اس دفعہ کے تحت ملک کی دیوانی عدالتیں دیوانی نوعیت کے تمام دعووں کی سماعت کے اختیارات رکھتی ہیں، سوائے ان کے جن کا نوٹس لینے سے ان عدالتوں کو واضح یا ضمنی طور پر منع کر دیا گیا ہے۔ دیوانی دعویٰ ایسے دعویٰ کو کہا جاتا ہے جس میں جائیداد یا حیثیت کے حق کا تنازعہ ہو۔

مجوزہ ذیلی دفعہ (2) نے تجویز کیا تھا کہ جب بھی جانشینی یا وراثت یا دونوں کا کوئی معاملہ دیوانی عدالت کے سامنے لایا جائے، تو عدالت صرف وراثت یا جانشینی کا سرٹیفکیٹ ہی جاری یا دعویٰ میں اٹھائے گئے مسئلہ کا فیصلہ ہی نہیں کرے گی، بلکہ مرحوم کی چھوڑی ہوئی پوری جائیداد کا جائزہ لے گی، ہر وارث کے حصے کا تعین کرے گی، جائیداد کی منتقلی کو یقینی بھی بنائے گی اور اس سلسلے میں متعلقہ مجاز حاکم، فرد یا ادارے کو حکم جاری کرے گی کہ وہ متعین کردہ حصے کو جائز وارث کو منتقل کرے۔ ایسے حصص کا تعین کرتے ہوئے عدالت ایسے کسی عمل کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھے گی جس کی رُو سے کسی حصہ دار کا حصہ دوسرے حصہ دار کے حق میں چھوڑ دیا گیا ہو یا ہبہ کر دیا گیا ہو۔ عدالت مرحوم کے ورثا کے متعلقہ حصوں کا تعین کرتے وقت اس امر کو خاص طور پر یقینی بنائے گی کہ خواتین ورثا کے حقوق کا تعین کسی امتیاز کے بغیر کیا گیا ہو۔

مجوزہ ذیلی دفعہ (3) کے تحت کسی شخص نے اپنی جائیداد یا اس میں اس کچھ حصہ اپنے ممکنہ ورثا کو اس طرح منتقل کیا کہ اس کا فائدہ صرف خاندان کے مردوں کو پہنچا اور خواتین محروم رہیں تو اس کی زندگی میں کیا گیا یہ فیصلہ اس کی موت کے وقت کالعدم تصور کیا جائے گا، اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی۔ عدالت ایسے شخص کی موت کے وقت اس کے ورثا کے حصص کا تعین اور تقسیم ایسے ہی کرے گی گویا کہ جائیداد کا کوئی حصہ کسی کے نام منتقل ہی نہیں کیا گیا تھا۔

تبصرہ

چونکہ ملک میں رائج معاشرتی دستور اور سماجی اقدار میں مردوں سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کی ضروریات اور خواہشات پوری کریں اس لیے عام طور پر خاندان کے مرد فراخ دلی سے ان پر خرچ کرتے ہیں۔ خاص طور پر شادی کے موقع پر لڑکی کا والد یا بھائی اپنی استطاعت سے بڑھ کر جہیز دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ بیشتر گھرانوں میں یہی رویہ وراثت کی تقسیم کے موقع پر دیکھا جاسکتا ہے اور وراثت کی تقسیم کو ایک مقدس مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا جاتا ہے۔

محبت کے اس طرح کے اظہار اور باہمی الفت کے اظہار کے طور پر بعض خاندانوں میں عورتیں وراثت میں اپنے حق سے خاندان کے ایک یا زیادہ مرد ارکان کے حق میں دستبردار ہونے کو باعثِ فخر سمجھتی

ہیں۔بعض عورتیں وراثت میں اپنے حصے کو اپنے اُن خونی رشتہ داروں کو تحفہ میں دینا پسند کرتی ہیں جو مالی مشکلات کا شکار ہوں۔رشتہ داروں کے درمیان اس طرح کی حصہ داری خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے مستحسن صورت خیال کی جاتی ہے۔تاہم محبت، ایثار وقربانی کے ایسے واقعات کے ساتھ ساتھ معاشرے میں منفی سرگرمیاں بھی جاری ہیں، جہاں عورتوں کو پھسلا کر یا جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعہ انہیں ان کے حقوق سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور انہیں احساس دلایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے وراثت میں اپنے حق کو برقرار رکھا تو وہ خاندانی رواج کو توڑنے کی مجرم ہوں گی۔اگر کوئی عورت دباؤ کے سامنے جھک جاتی ہے تو اس کے پاس اپنے حق کو دوبارہ حاصل کرنے کا راستہ بمشکل ہی مل پاتا ہے۔

ایسے حالات کے پیش نظر یہ تجویز بڑی عمدہ معلوم ہوتی ہے کہ عورت کو اس کے حصہ کی جائیداد کا باقاعدہ مالک بنا کر جائیداد اس کے زیرِ قبضہ دی جائے اور اگر وہ اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا حصہ واقعتاً تحفہ میں دینا چاہتی ہو تو وہ کسی دباؤ یا پابندی کے بغیر اپنی آزاد مرضی سے فیصلہ کرلے۔بل میں ایسی کوئی تجویز نہیں تھی جس کے تحت عورت کے اس اختیار پر کوئی قدغن ہوتی۔اس صورت میں عورت کو اپنی جائیداد کو کسی بھی طرح منتقل کرنے، اس سے دستبردار ہونے، ہبہ کرنے، فروخت کرنے کا اختیار باقی رہتا لیکن اس سے قبل اسے اپنے قانونی اور اسلامی حق کے مطابق جائیداد کی ملکیت بھی قبضہ بھی مل چکا ہوتا۔

اس تجویز کا ایک اور پہلو جو ذیلی دفعہ (2) میں دیا گیا ہے دیوانی عدالتوں کا اضافی کردار ہے۔یہ بھی ایک قابلِ عمل اور قابلِ قدر تجویز تھی۔عدالتیں پہلے ہی مرنے والے کے جانشینوں اور ورثا میں ان کے حصوں کا تعین کرتی ہیں اور تقسیم کی جانے والی جائیداد کی تفصیل بھی عدالت کے علم میں لائی جاتی ہے۔ایسے میں عدالت کے فرائض میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر ہر وارث یا جانشین کے حصوں کا بھی تعین کردے۔چونکہ وراثت کے حصص کا تعین پہلے سے قرآن میں موجود ہے اور ان احکامات کی روشنی میں اثاثوں کی تقسیم معاشرے میں پہلے ہی جاری ہے اس لیے عدالتوں کے لیے یہ عمل کوئی زیادہ پیچیدہ بھی نہیں ہوگا۔اس لیے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ اس تجویز پر عمل کر کے جائیداد سے متعلق ناانصافی کے واقعات میں تیزی سے کمی واقع ہوگی۔

زرعی جائیداد کی صورت میں پہلے ہی ایک علاحدہ اور تفصیلی نظام موجود ہے جس کے تحت محکمہ مال کے حکام کسی مرنے والے کے جائز وارثوں کے متعلقہ حصوں کو رجسٹر کرنے کے پابند ہیں۔ تاہم اگر یہی عمل عدالت کے ذریعہ طے پائے تو امکان ہے کہ عدالتی کارروائی شروع ہوتے ہی متعدد دعوے سامنے آجائیں اور جائیداد کا ہر انتقال ایک نئے مقدمے کی شکل اختیار کرلے گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی موجودہ نظام کو اچھا خاصہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عدالتیں منقولہ اور شہری جائیداد کے حصص کا تعین اور تقسیم کریں، جب کہ محکمہ مال کو موجودہ نظام کے مطابق ہی کام جاری رکھنا چاہیے۔ اگرچہ محکمہ اور بالخصوص پٹواری اور تحصیلدار کی کارکردگی میں انتظامی بہتری کے لیے اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

بل میں موجود دوسری تجویز اسی نوعیت کے ایک دوسرے عمل پر مبنی ہے جس کے ذریعے بعض لوگ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کو اپنے مرد رشتہ داروں کو تحفہ دے کر نہ صرف خاندان کی عورتوں کو محروم کر دیتے ہیں بلکہ اپنی وفات کے بعد جائیداد کی تقسیم کا راستہ بھی حتمی طور پر بند کر دیتے ہیں۔[5]

یہ درست ہے کہ اگر بل میں دی گئی تجویز کو منظور کر لیا جاتا تو یہ اس ہدایت کو قانونی طور پر لازمی قرار دیتی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت بشیرؓ کو دی تھی۔ جب آپؐ کے یہ ساتھی اپنے بیٹے نعمان کے ساتھ آپؐ کے پاس آئے اور آنحضورؐ سے گزارش کی کہ وہ اس بات پر گواہ رہیں کہ انہوں نے اپنے مال ومتاع میں سے کچھ حصہ اپنے بیٹے نعمان کو تحفہ میں دے دیا ہے۔ تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اتنا ہی مال ومتاع سب بچوں کو تحفہ میں دیا ہے؟ جب حضرت بشیرؓ نے نفی میں جواب دیا، تو آپؐ نے انہیں نعمان کو بھی تحفہ میں وہ مال دینے سے منع کر دیا اور ان سے فرمایا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ تمام بچے یکساں طور پر ان کی عزت واحترام کریں تو انہیں اپنے اثاثے ان کے درمیان تقسیم کرنے میں کوئی تفریق نہیں کرنی چاہیے۔[6] لیکن اس ہدایت کو قانونی شکل دینے کے بارے میں یہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا ہر بچہ خوش حال اور پرامن زندگی بسر کرے۔ والدین کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس بچے کو دوسروں کے مقابلہ میں مالی حالت، خاندان کے حجم، بیماری یا معذوری وغیرہ کی وجہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسے میں اس بات کا امکان ہے کہ

والدین مالی حوالے سے کمزور اولاد کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ اس سلسلے میں بل میں دی گئی تجویز علمی اور عوامی سطح پر زیادہ گہرے غور وفکر کا تقاضہ کرتی ہے۔

ذیلی دفعہ (3) میں بھی یہ کمی تھی کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ عمومی نہیں تھی۔ اس کا متن اس مفروضے پر تیار کیا گیا تھا کہ ایسی تمام منتقلیوں کے پیچھے مقصد یہ یقینی بنانا ہوتا ہے کہ جائیداد خاندان کی عورتوں میں تقسیم نہ ہو۔ مفروضہ بعض حالتوں میں درست ہوسکتا ہے لیکن بہت سے حالات میں مرد ورثا بھی مظلوم ہو سکتے ہیں۔

اس طرح کی کسی صورت میں جب جائیداد چند افراد کو دی گئی ہو جب کہ ممکنہ ورثا ہی میں سے کچھ کو اس سے محروم رکھا جائے، اصل چیز جس کا تعین کیا جانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کیا ایسی کوئی منتقلی یا ہبہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ یعنی کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ اصل صاحبِ جائیداد کے انتقال کے بعد وراثت میں ملنے والی جائیداد سے بعض ورثا کو محروم کر دیا جائے۔ بصورتِ دیگر تو خاندان کے اندر متعدد چیزیں لی اور دی جاتی ہیں جو کسی کو ملتی ہیں اور کسی کو نہیں۔ اس لیے ایسی ہر صورت میں جائیداد تحفہ کرنے والے کا ارادہ معلوم کرنا اہم ہے ورنہ اس کی طرف سے کسی بچے کو کئی سال پہلے دیا گیا کوئی تحفہ اس شخص کی موت کے بعد کسی مقدمے کی بنیاد بن سکتا ہے اور ہر موت کے بعد دیوانی مقدمات کا سلسلہ شروع ہوجائے گا اور ہر خاندان تنازعات کا شکار ہوجائے گا۔

سفارشات

- چونکہ تعزیری قانون میں فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء کے ذریعہ ان لوگوں کو سزا دینے کے لیے ترمیم پہلے ہی ہوچکی ہے جو عورتوں کو ان کے حق وراثت سے محروم کرتے ہیں، اس لیے اصل ضرورت یہ ہے کہ ایسے جرم کے امکان کو کم سے کم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ اس حوالے سے اس بل میں دو اہم تجاویز تھیں، جن پر قانون سازوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
- دیوانی عدالتوں کے حصص کے تعین اور تقسیم کے مجوزہ اختیار کو شہری اور منقولہ جائیداد تک محدود رہنا چاہیے۔ زرعی جائیداد کی منتقلی کا نظام موجودہ ماڈل کے مطابق جاری رہنا چاہیے۔

- مجوزہ ذیلی دفعہ (3) میں ایک شخص کی زندگی میں جائیداد کی منتقلی سے متعلق بل کی تجویز پر اس حوالہ سے معاشرے میں عام معمول اور مذہبی حکم کے مطابق گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔اس پر مختلف فورمز میں خاص طور پر اسلامی نظریاتی کونسل میں غور ہونا چاہیے۔

وراثت کے مسئلہ پر عمومی تبصرہ

وراثت کے بارے میں اوپر موجود بحث اور قانون سازوں، ذرائع ابلاغ اور بعض غیر سرکاری تنظیموں کی عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اس موضوع میں دلچسپی کو دیکھ کر غالب تأثر یہ بنتا ہے کہ عورتوں کو وراثت میں ان کے حقوق سے محروم کرنے کا عمل اس قدر پھیل گیا ہے کہ کوئی پاکستانی عورت اپنا حق حاصل ہی نہیں کر پاتی۔ یہ صورتِ حال اس اہمیت کے باوجود ہے جو اسلام ہر جائز وارث مرد وخاتون کو اس کا حصہ دینے پر دیتا ہے۔اس لیے اس امر پر بحث کرنا اہم ہے کہ آیا اس مسئلہ کا دائرہ اور اس کا حجم اس وقت اتنا ہی ہے جتنا اصل میں موجود ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، اور یہ کہ مسلم اکثریتی معاشرے میں عورتوں کو وراثت کے حق سے محروم کرنے کا عمل کہاں سے شروع ہوا۔

اگرچہ عددی اعتبار سے حتمی مواد دستیاب نہیں ہے لیکن پاکستانی معاشرے کو قریب سے دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ ملک میں جاری معاشرتی اور مذہبی اقدار کے تحت زیادہ تر خاندان وراثت کی تقسیم باہمی احترام اور قربانی کی فضا میں عمدہ طریقے سے کر لیتے ہیں۔نہ صرف عورتیں بلکہ خاندان کے مرد بھی بعض اوقات اپنے رشتہ داروں کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں جو مالی مدد کے مستحق ہوتے ہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

خاندان کا یہ مضبوط بندھن پاکستانی معاشرے کا امتیاز ہے۔عورتوں کو وراثت کے حصے سے محروم کرنے کی کارروائیاں اور رسم ورواج بعض مخصوص علاقوں اور طبقات تک محدود ہیں۔ان جگہوں پر عموماً مالی طور پر مستحکم افراد کمزور اور نادار رشتہ داروں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔ایسے واقعات میں متاثرہ فرد لازماً عورت ہی نہیں ہوتی۔بعض صورتوں میں تو سماجی اور مالی طور پر طاقتور خاتون اپنے کمزور مرد رشتہ دار کے خلاف ظلم کر رہی ہوتی ہے۔ایسے حالات میں اگر خاندان کے افراد اور رشتہ دار مضبوط رشتوں کا پاس

رکھتے ہوں تو خاندان ایک ادارے کے طور پر ایسی غیر منصفانہ اور غیر اسلامی کارروائیوں کے خلاف بہترین رکاوٹ بن سکتا ہے۔

بعض علاقوں اور خاندانوں میں عورتوں کے وراثت میں حصہ کو غلط طور پر عورتوں کو ان کی شادی کے موقع پر جہیز دینے کی رسم سے منسلک کرتے ہیں۔ شادی کے وقت اور اس کے بعد والدین اور ان کے بھائی اپنی بیٹیوں یا بہنوں کا جہیز یا تحائف کی صورت میں خیال رکھتے ہیں۔ روایتی طور پر عورتوں سے جواباً کچھ طلب نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر پاکستانی خاندانوں میں بیٹی یا بہن سے تحفے وصول کرنے کو نازیبا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں احسان شناسی کے طور پر وراثت کی تقسیم کے موقع پر اپنے ان بھائیوں اور رشتہ داروں کے حق میں اپنے وراثتی حق سے دستبردار ہو جاتی ہیں جو زندگی بھر ان کی مدد کرتے رہے ہوں۔ اظہارِ محبت و تشکر کا یہ طریقہ پاکستانی معاشرے کا قابل تعریف دستور ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ پھر بھی یہ لازماً سمجھنا چاہیے کہ جہیز کو کسی شخص کے وراثت میں حصے کے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ جہاں غیر قانونی ہے وہیں اسلامی احکامات اور اسلام کی روح کے بھی منافی ہے۔

بعض صورتوں میں جہاں جہیز کو وراثت کے حصے کے متبادل کے طور پر تصور کیا جاتا ہے خاندان کے مرد ارکان عورتوں کو ترغیب بلکہ بعض اوقات سماجی دباؤ کے ذریعہ مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ اس برائی کے خاتمے کے لیے بعض اقدامات کیے جائیں جیسا کہ ضابطہ فوجداری (ترمیمی) بل 2008ء میں تجویز کیا گیا تھا اور جس پر اوپر بحث کی گئی ہے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ عورتیں وراثت میں اپنا حق حاصل کر سکیں۔ اگر وہ اپنی آزاد رضامندی سے کوئی تحفہ دیتی ہیں تو وہ جائیداد کی ملکیت اور قبضہ لینے کے بعد ایسا کریں۔ اس کے ساتھ ہی جہیز کی رسم کی موجودہ شکل کو بتدریج غیر قانونی قرار دینے کی غرض سے حوصلہ شکنی کے اقدامات بھی کرنے چاہییں جیسا کہ پہلے تجویز کیا گیا ہے۔

عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے بعض پریشان کن غیر اسلامی اور غیر مہذب رواج، جن میں قرآن کے ساتھ شادی، کاروکاری[7] وغیرہ جیسی رسومات شامل ہیں، دراصل جاگیرداری اور جاگیردارانہ ذہنیت کی واضح علامت اور اظہار ہیں۔ یہ ذہنیت طاقت، جائیداد اور مقام و مرتبے کی ہوس کی حامل ہوتی ہے اور جائیداد سمیت کسی چیز میں شراکت قبول نہیں کرتی۔ بالخصوص خواتین کو حصہ دار بنانا نہ

صرف انہیں اپنی ہتک محسوس ہوتا ہے بلکہ ان کے خیال میں اس سے ان کی جائیداد دوسرے خاندان میں چلے جانے کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ وراثت کا حق اور اس سے تعلق رکھنے والے قوانین نہ صرف جاگیرداری کے ہاتھوں بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ عوام کی عام حالت کو بلند کرنے اور انہیں طاقتور بنانے کے لیے ہر کوشش کو بھی ناکام بنا دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جاگیردارانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے اقدامات کیے جائیں تاکہ معاشرے کے کمزور اور ناتواں لوگوں کے وراثت کے حق سمیت تمام حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

صورت حال کا یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کو، جن میں ان کے وراثتی حقوق بھی شامل ہیں، مسلسل کوششوں اور جامع سوچ کے ذریعہ محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مذہبی رہنماؤں سمیت سماجی کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کے افراد کے اندر رویوں میں تبدیلی کے لیے جدوجہد کریں اور معاشرے میں یہ احساس پیدا کریں کہ کسی شخص کو اس کے جائز حق سے کسی بھی بہانے یا طریقے سے محروم کرنے کی کوئی کوشش اس دنیا میں معاشرے کی بنیادوں کو تباہ و برباد کرنے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے قہر کو دعوت دینے کا سبب بنے گی۔ ایک ذمہ دار معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک دیرپا اور مسلسل مہم کی ضرورت ہے جس میں تعلیم، بیداری اور انفرادی مثالوں سے مدد لی گئی ہو۔ ایک مسلم معاشرے میں یہ مشکل کام نہیں ہونا چاہیے جہاں یہ عقیدہ بنیادی بات ہے کہ ہر شخص اپنے خالق کی براہِ راست نگرانی میں ہے اور ایک دن اسے اپنے اعمال کی جواب دہی اُس خدا کے سامنے کرنی ہوگی۔ اس عقیدے کو مضبوط کیا جانا چاہیے۔ اس سے جرائم اور ملک میں قانون کی خلاف ورزیوں میں کمی ہوگی۔

مزید برآں عورتوں سمیت کمزور طبقہ کے حق وراثت سے انکار کی ذمہ داری پیچیدہ قانونی نظام، قانون نافذ کرنے والوں کے طرزِ عمل، عدالتوں اور متعلقہ دفاتر کے اندرونی ماحول پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس لیے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ معاشرے میں عورتوں کے احترام کا ماحول اور کلچر پیدا کرنے اور انصاف کی کسی تاخیر اور اخراجات کے بغیر فراہمی کے لیے انتظامیہ کو بہتر بنائے اور قانونی اقدامات پر مشتمل مہم چلائی جائے۔

انتظامی اقدامات میں زرعی اراضی اور شہری جائیداد کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ رکھنا ایک ضروری قدم ہے۔ اس ریکارڈ تک عوام کی رسائی ہونی چاہیے نیز خاندان کے ہر فرد کے اندراج کو خاندانی شجرہ کی طرح

مکمل کر کے یقینی بنایا جائے۔ اس کے لیے جدید سافٹ ویئر کی تیاری اور ایک ایسے نظام کی طرف بتدریج منتقلی ضروری ہے جہاں شہری یا زرعی اراضی قانونی ورثا میں اس جائیداد کے مالک کی وفات پر خودکار نظام کے ذریعہ تقسیم ہو جائے اور منقولہ جائیداد کی تقسیم کے لیے قانونی ورثا کی پہلے سے سرکاری فہرست تیار ہو۔ یہ مرحلہ پیدائش اور اموات کی رجسٹریشن کے ایک نظام کو تیار اور برقرار رکھنے کے طریقِ کار کے لیے مسلسل کوشش کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔ اس کا تعلق تعلیم کی سطح اور سماجی بیداری کے ساتھ بھی جڑا تھا لیکن اس نظام کا آغاز کسی تاخیر کے بغیر کم از کم ملک کے مقابلتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور منظّم شہروں سے شروع کیا جانا چاہیے۔[8]

اسی طرح عدالتوں پر مقدمات کا بھاری بوجھ اور انصاف کے حصول میں تاخیر خاص طور پر دیوانی مقدمات کے فیصلوں میں دیر ہوتے چلے جانا پاکستان میں ہمیشہ تشویش اور فکر کی بنیاد رہی ہے۔ وراثت سے تعلق رکھنے والے مقدمات کے فیصلوں میں تاخیر اور مقدمہ کرنے والوں کی مشکلات اس مسئلہ کا ایک نتیجہ ہے۔ دیوانی عدالتوں سے ان مقدمات کی عائلی عدالتوں میں منتقلی سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوگا۔ کیونکہ آخرالذکر عدالتیں بھی مقدمات کی کثرت سے بھری پڑی ہیں۔ بیشتر صورتوں میں ایک ہی عدالتی افسر کو دیوانی جج کے ساتھ عائلی جج کے طور پر بھی کام کرنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ دونوں طرح کے مقدمات کا بوجھ برداشت کرتا ہے۔ ان مسائل کو کم کرنے کے لے مختلف اوقات میں مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف تجاویز پیش کی گئیں جن میں عدالتوں کی تعداد میں اضافہ، دیوانی عدالتوں سے الگ عائلی عدالتوں کا قیام اور فوری سماعت کی کارروائی کے ساتھ مسائل حل کرنے کے لیے دوسرے طریقوں کو اختیا کرنا بھی شامل ہے۔

حواشی

1. Rumsey, Alarmic, Mohammadan Law of Inheritance, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1983,p.2

2. PLD 2002 S.C. 741

3۔ فیملی کورٹس ایکٹ کے تحت بنائے گئے طریق کار کے مطابق، عدالت مسئلہ کو متعین کرنے سے پہلے فریقین کو ترغیب دے گی کہ وہ باہمی طور پر صلح صفائی سے معاملات طے کرلیں (بمطابق دفعہ 10) اور شواہد کے اندراج کے بعد دوبارہ یہی کوشش کی جائے گی (بمطابق دفعہ 12) اور اس مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ چودہ دن تک مقدمہ کی سماعت ملتوی کر کے خاندان اور برادری کے بزرگوں کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ مسئلہ کو باہمی بات چیت اور مشاورت سے حل کروانے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرسکیں۔ عدالت اپنا فیصلہ صرف اسی صورت میں سنائے گی جب کہ تنازع کو باہمی رضامندی سے حل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوجائیں۔

4۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات بہن اپنی دوسری بہن یا بھائی کو اس کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور بعض صورتوں میں بہنوئی اپنی بیوی کے بھائیوں کا حق غصب کرلیتا ہے۔ اس نوعیت کی دیگر مثالیں بھی دیکھی گئی ہیں۔ زیادتی کے واقعات کی نوعیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔

5۔ مثال کے طور پر، ایک بزرگ جاگیردار (مرد یا عورت) جو عمر کے آخری حصے میں خود دوسروں کے رحم و کرم پر ہو، بعض عزیزوں کی جانب سے دباؤ پر اپنی جائیداد کسی ایک فرد کو بطور تحفہ دینے کی دستاویز پر دستخط کر دیتا ہے، جس سے دیگر رشتہ دار محروم رہ جاتے ہیں۔

6۔ صحیح مسلم، دار احیاء الکتب العربیہ، قاہرہ 1347 ہجری، ص 1623۔

7۔ صوبہ سندھ کے بعض حصوں میں اس پر عمل ہوتا ہے۔ جس کے مطابق زنا کے جرم کا مرتکب سمجھے جانے والے فرد کو برادری کے بڑوں پر مشتمل اجلاس مجرم قرار دے کر سزا کا حق دار قرار دے دیتی ہے۔ یہ سزا موت بھی ہوسکتی ہے۔

8۔ حالیہ برسوں میں نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) نے سلیقہ سے درست رجسٹریشن کرنے اور ریکارڈ کو بہترین طور پر منظم کرنے کے حوالے سے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ امید ہے کہ مجوزہ نظام کے لیے نادرا کا یہ نظام پختہ بنیاد فراہم کرے گا۔

باب چہارم

دیگر موضوعات سے متعلق قوانین

اور مسوّداتِ قوانین

اس باب میں قانونی ترامیم کی ان تجاویز پر بحث کی گئی ہے جو اوپر کے ابواب میں شامل موضوعات کے علاوہ ہیں۔ ان میں خواتین کی ملازمت کے اوقاتِ کار اور شہریت کے قوانین شامل ہیں۔ ان دونوں عنوانات کے تحت پیش کردہ چار مسوّداتِ قانون کو بحث کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

فیکٹریز ایکٹ میں تجویز کردہ ترامیم

جن دو مسوّداتِ قانون کی تفصیل ذیل میں بیان کی جارہی ہے ان کا مقصد فیکٹریز ایکٹ 1934ء میں ترامیم تھا۔ چونکہ دونوں بلز کے عنوانات بھی ایک جیسے ہیں اور ان کے ذریعے قانون کی ایک ہی شق میں ترمیم مقصود ہے اس لیے اگرچہ دونوں قوانین کا تعارف الگ الگ کروایا گیا ہے لیکن ان پر بحث مشترکہ کی گئی ہے۔

فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009ء

اس بل کے ذریعے فیکٹریز ایکٹ 1934ء کے سیکشن 36 میں ترمیم کے ذریعے مندرجہ ذیل جملۂ شرطیہ کا اضافہ تجویز کیا گیا:

''بشرطیکہ کسی فیکٹری میں کام کرنے والی بالغ خواتین کارکنان کو کام کے دنوں میں کام کے آغاز اور اختتام کے وقت ایک ایک گھنٹے کی چھوٹ دی جائے گی''۔

عنوان: فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009

پیش کار: مسز یاسمین رحمٰن، ڈاکٹر عذرا فضل پیچوہو، پاکستان پیپلز پارٹی

تاریخ: 21 اپریل 2009

موجودہ حیثیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

بل پیش کرنے کی وجوہات اور اس کے مقاصد کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا تھا:

''خواتین کارکنوں کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنے بچوں کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ گھریلو معاملات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے اس بل کا مقصد خواتین کارکنوں کے اوقاتِ کار میں نرمی لاکر ان کے مسائل کو کم کرنا ہے تاکہ وہ تسلی بخش انداز میں اپنے ذریعہ معاش کے معاملات نبھانے کے قابل ہوسکیں''۔

فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009ء

اس موضوع پر دوسرے بل کا مقصد بھی فیکٹریز ایکٹ 1934 کے سیکشن 36 میں ترمیم لانا تھا۔ اس بل میں خواتین کارکنوں کے اوقاتِ کار میں نرمی لانے سے متعلق تجویز کو درج ذیل الفاظ میں پیش کیا گیا:

''مزید شرط یہ ہے کہ خاتون کارکن کے اوقاتِ کار میں لچک ہونی چاہیے۔ اسے اس بات کی اجازت دی جانی چاہیے کہ وہ چاہے تو ایک دن میں آٹھ گھنٹے یا حسبِ قانون اس سے کم یا زیادہ کام کر کے ہفتے میں اڑتالیس گھنٹے مکمل کر سکے۔ تاہم وہ اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق جس طرح مناسب سمجھے ان اڑتالیس گھنٹوں کو مکمل کر سکے گی۔ اسے طے شدہ اوقاتِ کار میں کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے اجازت ہوگی کہ وہ اپنی ڈیوٹی ایک لچکدار نظام الاوقات میں جب اور جیسے چاہے ادا کرے''۔

عنوان: فیکٹریز (ترمیمی) بل 2009
پیش کار: مسز خالدہ منصور، پاکستان مسلم لیگ (ن)
تاریخ: 21 اپریل 2009
موجودہ حیثیت: زائد المیعاد/غیر مؤثر

اس بل میں قانون کی دفعہ 41 میں بھی ترمیم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ بالغ کارکنوں کے رجسٹر میں ہر کارکن کی صنف کا ریکارڈ بھی دیگر تمام تفصیلات کے ساتھ رکھا جانا چاہیے اور یہ رجسٹر فیکٹری منیجر کے پاس موجود ہونا چاہیے۔

اس بل کو پیش کرنے والوں نے اس کی وجوہات اور مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کیا:

''ملازمت پیشہ خواتین کو ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے گھریلو معاملات اور خاندان کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی ہے۔ یہ صورت حال انہیں اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ دونوں ذمہ داریوں کو ایک ساتھ احسن طریقے سے ادا کر سکیں۔ اس کے نتیجے میں وہ شدید دباؤ کا شکار ہو جاتی ہیں جو نہ صرف ان کی صحت کے لیے تباہ کن ہوتا ہے بلکہ ان کی ذہنی کیفیت کو بھی بری طرح متاثر کرتا ہے۔ انہیں ایک ایسا مناسب ماحول فراہم کرنے کے لیے جس میں وہ مختلف اداروں میں اپنے فرائض مناسب طریقے سے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر اور خاندان کی مناسب دیکھ بھال بھی کر سکیں، ضروری ہے کہ متعلقہ قانون میں ترمیم کرنے کے لیے مناسب قدم اٹھایا جائے۔ یہ بل اس مقصد کو حاصل کرنے کی ایک کاوش ہے''۔

مشاہدات

فیکٹریز ایکٹ 1934ء ملک میں موجود پیداواری یونٹوں میں کارکنوں کی صحت اور حفاظت، اوقاتِ کار، چھٹیوں وغیرہ کو قانون کے تابع بناتا ہے۔ اس قانون کی دفعہ 36 کا عنوان ہے ''بالغوں کے اوقاتِ کار پر پابندیاں''۔ روزانہ کے اوقاتِ کار کے حوالے سے اس دفعہ کے مطابق کسی بالغ کارکن کو کسی کارخانے میں ایک دن کے دوران 9 گھنٹے سے زائد کام کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس سے زائد وقت کام کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ تاہم موسمی کارخانوں میں کام کرنے والے بالغ مرد کارکنوں کو ضرورت پڑنے پر ایک دن میں دس گھنٹے کام کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔

دفعہ 43 اور 44 میں بیان کیا گیا ہے کہ بعض ناگزیر حالات اور کارخانوں میں چیزیں بنانے کے عمل کے دوران صوبائی حکومت کسی کارخانے کو اس بات کی اجازت دے سکتی ہے کہ وہ دفعہ 36 یا قانون کی دیگر متعلقہ دفعات سے چھوٹ حاصل کرکے اپنے بالغ مرد کارکنوں کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے اجازت دے دے یا ان کی خدمات حاصل کرے۔ اس قانون کی دفعہ 45 یہ کہتی ہے کہ دفعہ 36 کے تحت دی گئی چھوٹ کسی بھی طرح کارخانے میں کام کرنے والی خواتین کارکنوں پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی بھی صورت میں کارخانے میں کام کرنے والی خواتین کارکنوں کے اوقاتِ کار ایک دن میں 9 گھنٹے سے زیادہ نہیں بڑھائے جاسکتے۔

تبصرہ

معاشرے میں خواتین کا کردار کثیر جہتی ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اگلی نسل کی پیدائش اور اس کی تعمیر کے ساتھ معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں بلکہ خاندان کی مالی معاونت میں بھی ان کا حصہ ہوتا ہے۔ روایتی طور پر خواتین اپنے گھر کے مردوں کے شانہ بشانہ زراعت، مویشیوں کی دیکھ بھال اور چھوٹے موٹے کاروبار چلانے میں مدد کرتی رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خاندان کے لیے اخراجات اور بچت کا نظام وضع کرنا انہی کا دائرہ اختیار رہا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ روایتی طور خواتین کی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں کا بنیادی میدان ان کا گھر اور خاندان ہی رہا ہے، جب کہ

گھر کے مرد خود اپنی اور گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کماتے ہیں۔ حالیہ عرصے میں تعلیم کے پھیلاؤ اور صنعت وحرفت کی ترقی کے باعث خواتین کا کردار تبدیل ہو رہا ہے۔ آج کی عورت کے پاس خاندانی امور چلانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے بہت سے نئے شعبوں میں فعال کارکردگی دکھانے کے مواقع پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔

دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ جدید طرزِ زندگی کے باعث خاندان پر پڑنے والے مالیاتی دباؤ سے نمٹنے کے لیے بہت سی خواتین نے اضافی طور پر یہ ذمہ داری بھی اٹھالی ہے کہ وہ ذرائع آمدنی بڑھانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ چنانچہ خواتین تیزی سے رسمی اور غیر رسمی شعبوں میں افرادی قوت کا ایک معقول حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ اس طرح ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور حالات کے دباؤ کے باعث یا کسی دیگر سبب کے تحت، نہ صرف خواتین کے بوجھ میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ بھی بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ ان بدلتے ہوئے معاشی حالات میں ریاست کوئی ایسی پالیسی مرتب کرنے میں ناکام رہی ہے جو خاندان میں خواتین کے اہم کردار کو نقصان پہنچائے بغیر ایسے معاشی مواقع بھی پیدا کرے جس سے وہ مفید تر کردار ادا کر سکے۔ چنانچہ وقت کی یہ ضرورت ہے کہ ایسے تخلیقی نظریات کو سامنے لایا جائے جن کی مدد سے ایک جانب خاندان کے ادارے کو تحفظ دیا جا سکے تو دوسری طرف خواتین کی قابلیت اور صلاحیتوں کو معاشرے اور قوم کے بہترین مفاد میں استعمال کیا جا سکے۔

زیرِ مطالعہ دونوں مسودات ایک جیسے مقاصد کے حامل تھے اور دونوں ہی میں خاندان کے ادارے سے وابستگی اور اس کے استحکام کی فکر نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالیہ سماجی و اقتصادی تبدیلیاں اور ان سے متعلقہ خواتین کے مسائل دونوں بلز کی بنیاد بنے ہیں، تاہم بل پیش کرنے والے اراکینِ اسمبلی نے جس قدر سادہ حل تجویز کیا، دراصل معاملہ اس قدر سیدھا نہیں ہے۔

یاد رہے کہ اگرچہ خواتین کارخانوں میں بھی کام کرتی ہیں لیکن ان کی بہت بڑی تعداد صحت اور تعلیم کے شعبوں سے بھی وابستہ ہے۔ اسی طرح دفتری و انتظامی امور اور پیشہ ورانہ شعبوں میں خواتین کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے اور یہ تمام شعبے فیکٹری ایکٹ کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ جو خواتین فیکٹریوں میں کام کر رہی ہیں وہ بھی عمومی طور پر گارمنٹس، فوڈ پروسیسنگ، پیکنگ اور صنعتوں میں انتظامی کاموں سے

متعلق شعبوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جن صنعتوں یا صنعتی شعبوں میں بھاری بھر کم مشینری، بہت زیادہ درجہ حرارت اور بھاری سامان کی نقل وحمل سے متعلق کام ہو، وہاں خواتین کی موجودگی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ نیز یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ فیکٹریز ایکٹ 1934ء کا اطلاق فیکٹری کے صرف ان کارکنوں پر ہوتا ہے جو پیداواری عمل سے وابستہ ہیں؛ اسی کارخانے میں کام کرنے والے دفتری عملے پر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا۔[1] خواتین کی ایک بڑی تعداد معیشت کے غیر رسمی شعبے سے بھی وابستہ ہے اور گھر پر رہ کر یا روزانہ اُجرت کی بنیاد پر چھوٹے موٹے کام کرتی ہیں۔

اہم تر بات یہ ہے کہ کیا یہ تجاویز واقعی قابلِ عمل بھی ہیں۔ جب کسی کارخانے کے پیداواری شعبے میں کام ہو رہا ہوتا ہے تو انتہائی اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تیاری کے ہر مرحلے پر متعلقہ فرد اپنے مقام پر موجود ہو۔ اگر کسی خاص موقع پر کارکنان میں سے کچھ افراد موجود نہ ہوں تو فیکٹری کی پیداواری صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ اسی معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر فیکٹری مالکان کو قانوناً پابند کر دیا گیا کہ وہ خواتین کارکنوں کو صبح کام کے آغاز کے وقت اور شام کو اختتام کے وقت کام سے چھوٹ دیں یا انہیں یہ آزادی دی جائے کہ وہ اپنی آسانی کے اوقات کار متعین کریں تو اس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں خواتین کو ملازمت دینے سے ہی کترانے لگیں گے، کیونکہ مرد و خواتین ملازمین کی تنخواہ سمیت ان پر دیگر اخراجات و مراعات تو یکساں ہوں گے لیکن خواتین کارکنان یا تو کم کام کر رہی ہوں گی یا ان کے لچکدار نظام الاوقات کی وجہ سے کسی پیداوار کو بروقت تیار کروانے میں بھی دشواری کا سامنا کرنا ہوگا۔

ایسے میں جب کہ زچگی کی چھٹی اور خاندان کی مشغولیت کے باعث اتفاقیہ چھٹی وغیرہ کے پیشِ نظر آجر پہلے ہی خواتین کو ملازم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں، اِن مسوّداتِ قانون میں پیش کی گئی تجاویز کو اختیار کر لینے کا مطلب فیکٹریوں میں خواتین کارکنوں کے لیے ملازمت کے حصول کو مشکل تر بنا دے گا، بالخصوص ان کے لیے کارخانوں کے پیداواری شعبوں میں نوکری حاصل کرنے کے مواقع کافی کم ہو جائیں گے۔

ایسی کسی تجویز پر عمل کرنے کا ایک اثر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کارخانے کے ملازمین کے درمیان

ناموافقت کی فضا پیدا ہوجائے اور خواتین کارکنوں کے لیے ان کے مرد رفقاء کار میں بے چینی جنم لینے لگے۔ عام طور پر ایک درجے کے کارکنان میں کام کا بوجھ تقریباً یکساں تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن خواتین کارکنان کے لیے اس اضافی سہولت کے بعد چند افراد ہی ہوں گے جو خواتین کو فراہم کردہ خصوصی رعایتوں کو تحسین کی نظر سے دیکھیں گے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے ان دونوں مسوّدات میں پیش کردہ حل قابلِ عمل اور موزوں نہیں تھا اور خواتین کارکنوں سے متعلق جو تشویش ان کی بنیاد بنی تھی اسے دور کرنے کے لیے تجویز کردہ لائحۂ عمل غیر مناسب تھا۔ درحقیقت ان دونوں مسودات میں کارفرما سوچ ایک جامع پالیسی اور مربوط کارروائی کا تقاضہ کرتی ہے، جو مقامی ثقافت اور اقدار کی بنیاد پر وضع کردہ ہوں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں معاشی ضروریات کا حل اس طرح نکالا گیا ہے کہ افرادی قوت اور ان میں سے ہر ایک پر کام کے بوجھ میں اضافہ کردیا جائے اور مالی ترقی اور خود انحصاری کو اتنی بنیادی اہمیت دے دی جائے کہ خاندان اور اُس کی قدر و قیمت نہ صرف ثانوی حیثیت اختیار کر جائے بلکہ کمانے والا اسے ایک بوجھ سمجھنے لگے۔ اگر مسائل کا حل اسی نقطۂ نظر کے ساتھ تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی تو پیش کردہ کوئی بھی منصوبہ معاشرتی تباہی کا نسخہ قرار پائے گا۔ پاکستان میں رائے ساز اور قانون ساز افراد اور اداروں کو مقامی ثقافت اور سماجی روایات کے مطابق خود سے کوئی راستہ سوچنا ہوگا۔

اس طرح کی پالیسی میں یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اگر خواتین کی ضرورت یا خواہش ہو تو معاشی سرگرمی میں شرکت ان کا حق ہے لیکن پالیسی میں یہ صراحت بھی ہونی چاہیے کہ خاندان میں خواتین کے بنیادی اور بہت اہم کردار کے پیشِ نظر گھر میں ان کی موجودگی کا کوئی متبادل نہیں۔ خاندان کے ذریعے عورت معاشرے کو ترقی دینے، اسے تحفظ فراہم کرنے اور مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کررہی ہے اسے ایک قومی خدمت کے طور پر پذیرائی دی جانی چاہیے اور اسے دنیا کی نگاہوں میں بلند کیا جانا چاہیے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ عورت کا مرتبہ خود اس کی اپنی نگاہوں میں بلند کیا جائے۔ خواتین کی بڑی تعداد اب بھی اپنے گھر کو بھرپور وقت دے کر قومی خدمت کا یہ فریضہ سرانجام دے رہی ہے، اور ایسی کسی بھی خاتون کی حیثیت، نہ صرف خانگی حوالے سے بلکہ مالی لحاظ سے بھی، کسی طرح اس خاتون سے کم نہیں ہے جو خود

روزگار سے وابستہ ہے۔اگر گھریلو خاتون کی گھریلو ذمہ داریوں کو بھی مالی لحاظ سے جانچا جائے اور جس ایثار اور سمجھداری سے وہ گھریلو اخراجات میں سے خاندان کے مستقبل کی بہتری کے لیے پس انداز کرتی ہے، ان سب کا جائزہ لیا جائے تو معاشرے کا یہ 'غیر فعّال' کہلانے والا حصہ دیگر تمام طبقات پر سبقت لے جائے گا۔اگر پالیسی میں اس کردار کو تسلیم کیا جائے تو مجموعی طور پر خواتین میں فخر کا احساس پیدا ہوگا اور معاشرے میں ان کے کردار کی اہمیت نمایاں ہو کر سامنے آئے گی۔

ایسی خواتین جو اپنی ضرورت یا کسی بھی وجہ سے کام کرنا چاہتی ہیں، کے حوالے سے ایک دانش مندانہ نقطہ نظر یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے شعبوں کی نشاندہی کی جائے جن میں خواتین اپنی خدمات مردوں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر پیش کرسکتی ہوں۔اگر ایسا کر دیا جائے تو اگرچہ خواتین دیگر شعبوں کا انتخاب بھی کر سکیں گی لیکن اِن شعبوں کے مطابق انہیں بالخصوص تعلیم اور تربیت بھی دی جاسکے گی اور جب وہ ملازمت کرنا چاہیں تو ان شعبوں میں انہیں ترجیحاً شامل کر کے ان کی صلاحیتوں اور وقت کے بہتر استعمال کو یقینی بنایا جاسکے گا۔اس سے حکومت اور آجر کے لیے یہ آسانی پیدا ہوجائے گی کہ وہ خواتین کو ان کی ضرورت اور حالات کے مطابق آسانیاں فراہم کرسکیں گے۔مثال کے طور پر اگر کسی گارمنٹس یا کھانے پینے کی اشیاء بنانے والی فیکٹری میں کارکنوں کی معقول تعداد یا تمام تر تعداد خواتین پر مشتمل ہو تو آجر کے لیے یہ آسان ہوجائے گا کہ وہ خواتین کی گھر میں ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیکٹری کے اوقات کار اور کام کی دیگر شرائط کا تعین کر سکے۔

سفارشات

- زیرِ نظر دونوں بل معاشرے اور بالخصوص ملازمت پیشہ خواتین کو درپیش مسائل کا قابلِ عمل حل پیش کرنے سے قاصر رہے۔
- خواتین کے لیے معاشی کردار کے حوالے سے ایک جامع قومی پالیسی کی ضرورت ہے جس کی تعبیر ہماری اپنی سماجی اقدار کے مطابق ہو اور جو مقامی ثقافت اور ملک کے اقتصادی حالات کے مطابق وضع کردہ ہو۔

- اسلام اور دستورِ پاکستان میں مذکور حکمتِ عملی کے اصولوں کے مطابق ایسی کسی بھی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں خاندان کے ادارے کی مضبوطی اور افراد کی فلاح و بہبود شامل ہو۔
- قومی پالیسی میں عورتوں کی گھریلو خدمات کو ایک قومی خدمت کے طور پر تسلیم کیا جائے اور انہیں معاشرے کا غیر پیداواری اور غیر فعال حصہ گردانے کی سوچ کی نفی کی جائے۔
- ان ملازمتوں اور پیشوں کی نشاندہی کی جائے، جن میں خواتین اپنی خدمات بہتر طریقے سے فراہم کرسکتی ہیں۔ جو خواتین اپنی خواہش یا خاندان کی ضرورت کی وجہ سے ان ملازمتوں یا پیشوں میں جانا چاہتی ہوں ان کی حوصلہ افزئی کرنے کے لیے خصوصی انتظام اور اقدامات اٹھائے جانے چاہییں۔

پاکستانی خاتون سے شادی کرنے والے غیر ملکی کی شہریت

پاکستان کی شہریت سے متعلقہ امور شہریت ایکٹ مجریہ 1951ء (1951 کا دوسرا ایکٹ) کے تحت طے کیے جاتے ہیں، جو شہریت کے حصول، اسے کھو دینے، دستبرداری اور محروم کر دیے جانے جیسے معاملات طے کرنے کے لیے مکمل رہنمائی کا حامل قانون ہے۔

شہریت ایکٹ 1951ء کی دفعہ 10 مرد پاکستانی شہری کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنی غیر ملکی بیوی کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کے حصول اور طے کردہ طریق کار کے مطابق ملک سے وفاداری کا حلف نامہ داخل کرانے کے بعد اس کے لیے شہریت حاصل کرسکتا ہے۔ تاہم قانون کسی پاکستانی خاتون شہری کے غیر ملکی شوہر کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔ اس موضوع پر قومی اسمبلی میں دو بل پیش کیے گئے تھے۔ ان بلوں کا تعارف اور ان پر تبصرہ بیک وقت پیش کیا جارہا ہے۔

پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2008ء

پاکستانی شہریت کے (ترمیمی) بل 2008ء میں یہ تجویز کیا گیا کہ شہریت ایکٹ میں مندرجہ ذیل

نئی دفعہ 10۔الف شامل کی جائے:

''**10۔الف:** شادی شدہ مرد۔وہ مرد جس نے کسی پاکستانی شہریت کی حامل خاتون سے شادی کی ہو اس بات کا اہل ہوگا کہ وہ اس ایکٹ کی دفعہ 10 میں خواتین کے لیے بیان کردہ تمام شقوں کو پورا کرنے کے بعد پاکستانی شہریت کے لیے رجسٹریشن کی درخواست دے سکتا ہے۔''

عنوان: پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2008
پیش کردہ: بیگم شہناز شیخ اور 6 دیگر خواتین ارکان قومی اسمبلی، پاکستان مسلم لیگ ق
تاریخ: 10 جون 2008
موجودہ حیثیت: زائدالمیعاد/غیر مؤثر

اس بل کو پیش کرنے کی وجوہات اور مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ایسے میں جب کہ پاکستانی مرد سے شادی کرنے والی غیر ملکی خاتون طے کردہ طریقِ کار کو اپنا کر پاکستان کی شہریت حاصل کر سکتی ہے، قانون میں ایسی ترمیم کی ضرورت ہے جو پاکستانی خاتون سے شادی کرنے والے مرد کو بھی یہی سہولت فراہم کرے اور وہ بھی لوازم پورے کرنے کے بعد پاکستان کی شہریت کے لیے درخواست دے سکے۔

پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2010ء

اسی موضوع پر پیش کیے گئے اس دوسرے بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ شہریت ایکٹ 1951ء کی دفعہ 10 میں جہاں جہاں لفظ ''خاتون'' یا اس کی جمع 'خواتین' موجود ہے اسے حسبِ موقع لفظ 'فرد' اور 'افراد' سے بدل دیا جائے تاکہ اس کے نتیجے میں قانون کی یہ شق کسی مخصوص صنف سے متعلق نہ رہے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا حق اور اس کے حصول کے لیے شرائط وطریقِ کار ہر ایک کے لیے یکساں ہو جائے۔

عنوان: پاکستانی شہریت کا (ترمیمی) بل 2010
پیش کردہ: مس بشریٰ گوہر، اے این پی
تاریخ: 17 فروری 2010
موجودہ حیثیت: زائدالمیعاد/غیر مؤثر

بل کو پیش کرنے کی وجوہات اور مقاصد کو اس طرح بیان کیا گیا تھا:

''پاکستان کے شہریت ایکٹ مجریہ 1951ء کی دفعہ 10 امتیازی ہے اور آئین کے آرٹیکل 5 سے

متصادم ہے جو سب کے لیے حقوق کی برابری کو یقینی بناتی ہے۔ یہ پاکستان کے بین الاقوامی عہد و پیماں سے روگردانی بھی ہے۔

مزید یہ کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے آئین کے آرٹیکل 203-D کی دفعہ 3۔الف کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے شہریت ایکٹ 1951ء کی اس امتیازی دفعہ کا ازخود نوٹس لیا تھا جو شادی شدہ پاکستانی عورت کے اس حق سے انکار کرتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے غیر ملکی خاوند کے لیے پاکستانی شہریت کا حصول چاہتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ایک شادی شدہ پاکستانی مرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی غیر ملکی بیوی کے لیے پاکستانی شہریت حاصل کر سکے، اور اس فیصلے میں صدرِ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس قانون کی دفعہ 10(2) اور دیگر شقوں میں ترمیم کے لیے مناسب اقدام کریں۔''

مشاہدات اور تبصرہ

پاکستان کے شہریت ایکٹ کی دفعہ 10 عرصہ دراز سے زیرِ بحث رہی ہے اور اسے ایک امتیازی قانون اور آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 25 سے متصادم قرار دیا جاتا رہا ہے جس میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ''تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ قانون انہیں برابر کا تحفظ فراہم کرے''۔ اور یہ کہ ''جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا''۔ تاہم یکے بعد دیگرے آنے والی تمام حکومتوں نے سلامتی سے متعلق خدشات کا حوالہ دے کر قانون کی اس شق میں ترمیم کی مخالفت کی ہے۔

فیڈرل شریعت کورٹ نے 2006ء میں اس معاملے پر چھپنے والی ایک خبر پر ازخود نوٹس لیا تھا[2] تاکہ یہ جانچا جا سکے کہ آیا پاکستانی شہریت ایکٹ کی دفعہ 10 امتیازی تو نہیں ہے اور کیا یہ قرآن و سنت میں بیان کردہ اسلام کے احکامات سے انحراف اور جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اصولوں کے منافی تو نہیں۔ عدالتی نوٹس پر وزارتِ داخلہ نے جو جواب جمع کرایا وہ وزارتِ قانون، انصاف اور انسانی حقوق اور صوبائی حکومتوں سے باضابطہ طور پر توثیق شدہ تھا۔ اس جواب میں پاکستانی مرد کو غیر ملکی بیوی کے لیے پاکستانی شہریت حاصل کرنے کے حق کو بنیاد بنا کر کسی غیر ملکی مرد کو، جس نے کسی پاکستانی خاتون سے شادی کر رکھی ہو، ایسا ہی حق دینے میں واضح ہچکچاہٹ موجود ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ملکی سلامتی سے متعلق

امور تھے اور ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اس طرح کا قدم پاکستان میں بہت بڑی تعداد میں رہنے والے غیر ملکی تارکین وطن کو قانونی راستہ فراہم کر دے گا۔ اس جواب میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ ایکٹ کی شق 10 امتیازی ہے لیکن اسے اسی صورت میں برقرار رکھنے پر اصرار کیا گیا اور کہا گیا کہ ''معاملے کے مضمرات اور ریاستی پالیسی کو مدّنظر رکھتے ہوئے وزارت نے ملک کے بہترین مفاد میں واضح طور پر صنفی مساوات کی مخالفت کی ہے''۔[3] جواب میں یہ موقف بھی اپنایا گیا کہ ''پاکستانی شہریت ایکٹ 1951ء کی دفعہ 10 قرآن کی کسی آیت اور سنت کے منافی نہیں ہے''۔[4]

مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح تحقیق اور اس سے متعلق آراء سننے کے بعد عدالت نے شہریت ایکٹ کی دفعہ (2)10 کو امتیازی قرار دیا اور اسے آئین پاکستان کے آرٹیکل 2۔الف اور 252 کی خلاف ورزی، پاکستان کے بین الاقوامی عہد و پیماں سے روگردانی پر مبنی اور سب سے اہم یہ کہ قرآن وسنت کے منافی قرار دیا۔ عدالت نے صدرِ پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ چھ ماہ کے اندر شہریت ایکٹ 1951ء کی شق (2)10 اور دیگر شقوں میں ترمیم کے لیے مناسب قدم اٹھائیں تاکہ پاکستانی خاتون کے غیر ملکی خاوند کو پاکستانی شہریت فراہم کرنے کے لیے مناسب طریقہ کار فراہم کیا جاسکے۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں وزارتِ داخلہ کی طرف سے جمع کروائے گئے بیان کو تفصیلاً شامل کیا اور اس قانون کے حوالے سے مقتدر حلقوں کی رائے اور اندازِ فکر کو جاننے کے لیے اس کو خاص طور پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ خدشات اب بھی قائم ہیں اور عدالت کے فیصلے کے نتیجے میں ابھی تک کوئی قانون سازی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس فیصلے کے خلاف اپیل سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بینچ میں زیرِ التوا ہے۔

خواتین کو مطلوبہ حق نہ دینے کی وضاحت میں جو وجوہات حکومتی جواب میں بتائی گئی تھیں ان میں قومی سلامتی سے متعلق خدشات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ''سماجی یا اقتصادی اثرات کے علاوہ اس شہریت کی فراہمی کو اس طرح بھی استعمال کیا جاسکتا ہے کہ کوئی باہر کا ملک اپنے ایجنٹوں کو پاکستان میں لا بٹھائے''۔ کیونکہ ''کوئی غیر ملکی خاوند پاکستانی خاتون سے شادی کرنے اور شہریت حاصل کر لینے کے بعد اس بات میں آزاد ہوگا کہ وہ اس خاتون کو طلاق دے دے اور پاکستان میں آزادانہ گھومتا پھرے''۔ تاہم

عدالت نے ان خدشات کو رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''شہریت دینا کسی بھی ملک میں حکومت کے صوابدیدی اختیارات میں شامل ہوتا ہے جس سے ملکی سلامتی یا عوامی مفادات کی وجوہات کے باعث انکار بھی کیا جاسکتا ہے''۔

یہ درست ہے کہ اس خاص مسئلے سے متاثرہ خواتین کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن بہرحال اس عدم مساوات نے کچھ افراد کے لیے مسائل بھی کھڑے کیے ہیں۔ آج کے مخصوص تناظر میں اس بات کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ ذرائع ابلاغ کی رپورٹس، اداریوں اور پروپیگنڈہ کالموں کے ذریعے اس قانون کو اسی طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے پاکستان میں تمام یا بیشتر قوانین صنف کے امتیاز پر مبنی ہیں۔

عدالت میں جمع کروایا گیا حکومتِ پاکستان کا بیان بھی اہمیت کا متقاضی ہے اور یہ خدشہ بے جا نہیں ہے کہ غیر ملکی مرد طلاق دینے کے بعد ملک کے لیے سلامتی کے مسائل پیدا کرسکتا ہے۔ تاہم، پاکستانی خاتون کے غیر ملکی خاوند کی شہریت کے حق کو قانون کے ذریعے مشروط کیا جاسکتا ہے تاکہ اس میں موجود خطرات سے بچا جاسکے۔ اس قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے بھارت نے یہ تدبیر اختیار کی ہے کہ کوئی فرد (مرد یا خاتون) جس نے بھارت کے کسی شہری سے شادی کی ہو اس وقت شہریت کے لیے درخواست دے سکتا ہے جب وہ بھارت میں اس سے قبل 5 سال معمول کی رہائش اختیار کر چکا ہو۔[5] اسی طرح یہ شرط بھی قانوناً عائد کی جاسکتی ہے کہ علیحدگی کی صورت میں غیر ملکی مرد یا خاتون کی شہریت برقرار رکھنے یا منسوخ کرنے کا فیصلہ ازسرِ نو جائزہ لینے کے بعد کیا جائے گا۔

حاصلِ کلام

اس تبصرے کا اختتام اب تک کی ترتیب کے مطابق دوٹوک الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے بعد اس قانون میں ترمیم کے حوالے سے سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اگر حکومت عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے یا اسے مطمئن کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو اسے غیر معینہ مدت کے لیے التوا میں رکھنا دانش مندی نہیں ہے۔ عدالتی فیصلہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتی دلائل عدالت کو اس بات پر قائل نہیں کر سکے کہ پاکستانی عورت کے غیر ملکی شوہر کو

شہریت دینے میں واقعتاً سیکیورٹی خدشات موجود ہیں۔ ایسے میں جب عدالت یہ وضاحت بھی کر چکی ہے کہ متعلقہ سرکاری حکام اور ادارے جو شہریت کی درخواست پر فیصلہ کرتے ہیں ہر ایسی درخواست کو رد کر سکتے ہیں جو مشکوک ہو، قانون میں ترمیم کے لیے کسی پیش رفت کا نہ ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔

.....

حواشی

1. Section 2(h) of the Factories Act, 1934 (Act XXV of 1937)

2. Suo Moto No. 1/K of 2006, htt://federalshariatcout.gov.pk/leading%20Judgements/ Suo%20Moto%20 No.1-K%20of %202006.pdf (accessed January 6, 2012).

3۔ ایضاً، پیرا نمبر4

4۔ ایضاً، پیرا نمبر10

5. Section 5 of the Citizenship Act, 1955 (Act No. 57 of 1955)of India; available at http://www.indiankanoon.org/doc/305990/ (last accessed on January 7, 2012)

.....

باب پنجم

قومی اسمبلی کی عمومی کارکردگی پر ایک نظر

(2008 تا 2013ء)

خواتین اور خاندان کے مسائل سے متعلق اس مطالعہ کی بنیاد 13 ویں قومی اسمبلی میں زیرِ بحث آنے والے مسوداتِ قانون پر رکھی گئی ہے۔ اس حوالہ سے قانون سازی کی مختلف تجاویز پر فرداً فرداً بحث گزشتہ ابواب میں ہو چکی ہے۔ اس باب میں مجموعی معلومات اور اعداد و شمار کی روشنی میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں اور اراکینِ پارلیمان نے عورت اور خاندان سے متعلق موضوعات پر قانون سازی میں کس قدر دلچسپی لی ہے۔ ابتدا میں قانون سازی کی ضرورت و اہمیت، قانون سازی کے طریقِ کار کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

کسی بھی معاشرے میں قانون نہ صرف اس کے اخلاق اور عادات کے معیارات کا اظہار بلکہ ان کے نفاذ کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ قانون ہی معاشرے کو وجود میں لاتا ہے، اسے برقرار رکھتا ہے اور اس کو نشوونما دے کر اسے ایک تہذیب کی شکل دیتا ہے۔ قانون نہ صرف ایک مجاز ہیئتِ حاکمہ کی پشت پناہی کے ساتھ عام طرزِ عمل کو نظم وضبط کا پابند کرتا اور حقوق وفرائض کا تعین کرتا ہے، بلکہ جرائم کی وضاحت کے ساتھ ساتھ سزاؤں اور ان کے نفاذ کے لیے انتظامی ڈھانچہ بھی تشکیل دیتا ہے۔

تاہم اپنے مقاصد کے حصول میں کوئی قانون خود کفیل نہیں ہوسکتا۔ اِسے اپنے مقاصد کو حقیقت کا روپ دینے اور اپنی غرض وغایت کے حصول کے لیے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک کامیاب قانونی نظام کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس کے مخاطبین اسے قبول کریں، اس کا احترام کریں اور اس کی حمایت کریں۔ معاشرتی نظم قائم کرنے کے لیے قانون کو جو قوت درکار ہے، اسے فراہم کرنے میں عدلیہ، انتظامیہ اور ریاست کے دیگر ستونوں کا کردار انتہائی اہم ہے لیکن یہ سب ادارے بھی اسی صورت میں اپنے اہداف حاصل کرسکتے ہیں جب معاشرہ فی الواقع قانون کی ضرورت اور افادیت پر قائل ہو۔ جب تک کوئی قانون معاشرے کی سماجی ساخت، اعتقادات اور اجتماعی مقاصد سے ہم آہنگ نہ ہو، اس وقت تک اسے عام لوگوں میں قبولیت اور اطاعت حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہی وجہ ہے کہ قانون سازوں کے لیے مقامی ماحول اور اقدار سے اچھی طرح آگاہ ہونا ازحد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملک کو مشترکہ قومی مقاصد کی جانب لے جانے کے لیے ضروری بصیرت کے بھی حامل ہوں۔ اسی بنیاد پر کسی جمہوری ملک میں قانون بنانے والے کسی بھی ادارے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ قانون سازی اور پالیسی بنانے میں قوم کے مشترکہ ضمیر کی عکاسی کرے گا۔ نیز قانون بنانے والے اداروں میں ہونے والی گفتگو اور مباحث سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کو درپیش چیلنجز کے حوالے سے اہلِ اقتدار کی عمومی سوچ اور ردِّعمل کیا ہے۔ گویا مقننہ کی کارروائی کا جائزہ لینے سے قومی امور کے حوالے سے قانون ساز افراد کے فہم، تشویش اور بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی حوالہ سے خاندان اور بالخصوص معاشرے میں عورتوں کے حقوق اور مقام ومرتبہ کے بارے میں ہونے والی قانون سازی کسی سماج کی بنیادی اقدار اور سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔

اس پس منظر میں گزشتہ ابواب مین قانون سازی پر مبنی ترامیم کا فرداً فرداً جائزہ لیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم دیگر ضروری معلومات اور اعداد وشمار کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ارکانِ پارلیمان اور پارلیمان میں موجود سیاسی جماعتوں کا خواتین اور خاندانی امور سے متعلق قانون سازی کے بارے میں رویہ کیا رہا ہے۔

قانون سازی کے بارے میں اعداد وشمار

تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خواتین سے متعلق مسودات قانون نے زیرِ نظر عرصہ کے دوران پارلیمنٹ میں نمایاں توجہ حاصل کی۔ اس دوران قومی اسمبلی میں مجموعی طور پر 276 مسوداتِ قانون پیش کیے گئے، جن میں سے 185 نجی ارکان[1] نے اور 91 حکومت نے پیش کیے۔ ان 276 میں سے خواتین اور خاندان سے متعلق مسوداتِ قانون کی تعداد 42 تھی،[2] جن میں سے 7 نے قانون کی شکل اختیار کی۔ جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے مقابلے میں نجی ارکان، خاندان اور عورتوں سے متعلق مسائل کے بارے میں زیادہ فکرمند اور سرگرم تھے۔ نجی ارکان کے پیش کردہ 185 میں سے 35 مسودات کا تعلق عورتوں اور خاندان سے متعلق مسائل سے تھا جب کہ حکومت کی طرف سے پیش کردہ 91 مسودات میں سے 7 کا تعلق اس موضوع سے تھا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے پارلیمنٹ کی خواتین اراکین زیادہ سرگرم رہی ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون (ڈاکٹر فہمیدہ مرزا) اسمبلی کی سپیکر تھیں جنہوں نے 76 خواتین اراکین قومی اسمبلی اور 17 اراکینِ سینٹ پر مشتمل ایک ویمن پالیمنٹری کاکس کے قیام میں بھی فعّال کردار ادا کیا۔[3] شاید یہی وجہ ہے کہ عورتوں سے متعلق پیش کیے گئے مسوّداتِ قانون میں خواتین اراکینِ پارلیمان کا حصہ بہت زیادہ یعنی 82 فیصد تک رہا ہے (یعنی 35 میں سے 29 بلز)۔ یہ غیر معمولی تناسب ایک لحاظ سے تو بالکل قدرتی ہے اور اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ قانون ساز اداروں میں خواتین کی زیادہ نمائندگی خواتین کے مسائل کے حوالے سے زیادہ حساسیت اور ان کے حل کے لیے زیادہ کوشش کی ضامن ہوگی۔ تاہم اس سے خواتین کے مسائل کے حوالے سے مرد اراکینِ پارلیمنٹ کی عدم دلچسپی بھی

عیاں ہے۔ اس بنیاد پر اگر یہ فرض کرنا درست ہو کہ معاشرہ اعلیٰ ترین سطح پر بھی ایک ایسی تقسیم کا شکار ہے جس میں مسائل کو جنس کی بنیاد پر دیکھا اور سوچا جا رہا ہے تو یقیناً یہ ایک خطرناک علامت ہے۔

تیرہویں قومی اسمبلی (2008-2013) میں سیاسی جماعتوں کی عددی نمائندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں۔ 324 کے ایوان میں پاکستان پیپلز پارٹی 127 ارکان کے ساتھ سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اور وفاق میں مخلوط حکومتوں کی سربراہی کر رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کے ارکان نے نجی حیثیت میں خواتین اور خاندان سے متعلق جو مسوداتِ قانون پیش کیے، ان کی تعداد 14 ہے۔ پاکستان مسلم لیگ (نواز) قومی اسمبلی میں 92 ارکان کے ساتھ دوسری بڑی اور حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی جماعت تھی تاہم ایوان میں یہ اختلاف مجوزہ قانون سازی کی شکل میں کم ہی سامنے آیا اور اس جماعت سے تعلق رکھنے والے اراکینِ اسمبلی نے خواتین سے متعلق صرف 4 بلز متعارف کرائے۔ پاکستان مسلم لیگ، جو عام طور پر مسلم لیگ (ق) کے نام سے جانی جاتی ہے اور 2002 سے 2007ء کے دوران برسرِ اقتدار رہ چکی تھی، تیرہویں اسمبلی میں اس کے اراکین کی تعداد 50 تھی، جنہوں نے خواتین اور خاندان سے متعلق 14 بلز پیش کیے۔ عوامی نیشنل پارٹی کے 13 اراکینِ اسمبلی نے 2 اور متحدہ قومی موومنٹ کے 25 اراکین نے زیرِ مطالعہ موضوع کے حوالے سے صرف ایک بل پیش کیا۔ قومی اسمبلی میں موجود دیگر چھ سیاسی جماعتوں 4 اور آزاد ارکان نے اس سلسلے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ذاتی حیثیت میں محترمہ یاسمین رحمٰن، محترمہ دونیہ عزیز، محترمہ جسٹس (ریٹائرڈ) فخر النساء کھوکھر اور محترمہ ماروی میمن (جو جون 2011ء میں مستعفی ہو گئیں) زیادہ سرگرم رہیں۔

اگر سالانہ کارکردگی کے حوالے سے نجی بلز کا گراف بنایا جائے تو معلوم ہوگا کہ 35 مسودات میں سے 27 پہلے دو پارلیمانی برسوں میں (2008-09ء اور 2009-10ء میں) پیش کیے گئے۔ تیسرے پارلیمانی سال کے دوران صرف ایک بل پیش کیا گیا۔ چوتھے سال میں نسبتاً زیادہ کام ہوا اور 5 بلز متعارف ہوئے جبکہ پانچویں اور آخری پارلیمانی سال کے دوران 2 نجی بلز پیش کیے گئے۔

نجی مسودات قانون کی طرح سرکاری بلوں کا زیادہ ارتکاز بھی پہلے دو برسوں کے دوران رہا۔ تین

بل پہلے پارلیمانی سال، دو دوسرے سال اور ایک چوتھے پارلیمانی سال کے دوران پیش کیا گیا جبکہ تیسرے اور پانچویں سال میں کوئی بل پیش نہیں کیا گیا۔

قومی اسمبلی (2008-13) میں قانون سازی

1۔ قومی اسمبلی میں پیش کردہ بلز: مجموعی جائزہ

بلوں کی نوعیت	سرکاری بل	نجی بل	کل تعداد
خواتین اور خاندان سے متعلق بل	7	35	42
دیگر بل	84	150	234
کل تعداد	91	185	276

2۔ خواتین اور خاندان کے بارے میں قانون سازی: سال بہ سال جائزہ

پارلیمانی سال (مارچ تا فروری)	سرکاری بل	نجی بل	خواتین اور خاندان کے بارے میں منظور شدہ قوانین	کل منظور شدہ قوانین بشمول خواتین و خاندان
2008-09	3	10	0	4
2009-10	2	17	2	9
2010-11	0	1	0	22
2011-12	1	5	5	30
2012-13	1	2	0	16
کل تعداد	7	35	7*	81

* تین بل یعنی عائلی عدالتیں (ترمیمی) بل، جس میں بچوں کے نفقہ کی ادائیگی کے لیے عبوری حکم جاری کرنے کی تجویز تھی؛ سرپرستوں اور زیر کفالت کا (ترمیمی) بل، جو کم سن بچوں کی ان کی ماں کو لازمی حوالگی سے متعلق تھا اور گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) کا بل قومی اسمبلی نے منظور کیے تھے اور سینیٹ سے ترامیم کے بعد انہیں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں منظور کیا جانا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

3۔ خواتین اور خاندان کے بارے میں پیش کردہ نجی بلز (بلحاظ سیاسی پارٹی)

سیاسی پارٹی	سیاسی قوت (تعداد ارکان قومی اسمبلی)	خواتین اور خاندان سے متعلق پیش کردہ بل (تعداد)
پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین	127	14
پاکستان مسلم لیگ (ن)	92	4
پاکستان مسلم لیگ (ق)	50	14
متحدہ قومی موومنٹ	25	1
عوامی نیشنل پارٹی	13	2
دیگر	34	-
کل تعداد	342	35

اس طرح مجموعی طور پر زیرِ مطالعہ مدت کے دوران پارلیمنٹ نے 91 قوانین منظور کیے جن میں سے 7 کا تعلق خواتین اور خاندان سے تھا۔ ان سات قوانین میں سے 4 سرکاری اور 3 نجی بلز کے طور پر پیش کیے گئے تھے۔

قانون سازی میں اراکینِ پارلیمنٹ کی عمومی دلچسپی

پارلیمنٹ کے ارکان کی خواتین اور خاندان سے متعلق قانون سازی میں دلچسپی کا اندازہ مسوداتِ قانون کی پیشی اور ان کی منظوری سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بل کو قانون کی شکل اختیار کرنے کے لیے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان کی تفصیل پیش لفظ میں بطور حاشیہ موجود ہے۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس پورے عمل کا انحصار مکمل طور پر ارکانِ پارلیمان اور بالخصوص حکومت کی مجوزہ قانون میں دلچسپی پر ہوتا ہے۔ جب کوئی بل پارلیمان کے کسی ایوان میں پیش ہوتا ہے تو اس کو متعلقہ موضوع پر اسی ایوان کے ارکان پر مشتمل مجلسِ قائمہ (Standing Committee) کے جائزہ کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جبکہ بل کا محرک (Mover) بھی کمیٹی کا حصہ بن جاتا ہے۔ کمیٹی میں کارروائی کی رفتار کا انحصار کمیٹی کے ارکان کے سامنے موجود ایجنڈے میں ان کی دلچسپی پر ہوتا ہے۔ بعدازاں جب کمیٹی اپنی سفارشات کے ساتھ یہ مسودہ

ایوان میں پیش کرتی ہے، اس وقت بھی اس کی جلد منظوری، تاخیر یا عدم منظوری کا انحصار اراکینِ پالیمنٹ کی قانون سازی کے مجموعی عمل اور اس خاص قانون کے اہداف و مقاصد سے وابستگی پر ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ میں موجود اس دلچسپی کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ 2008 سے 2013ء کے دوران منظور کیے گئے قوانین میں سے یوں تو 7 قوانین خواتین اور خاندان سے متعلق تھے لیکن 3 مزید مسودات قانون ایسے بھی تھے جن کو قومی اسمبلی نے منظور کرلیا تھا اور سینیٹ کی جانب سے ان مسودات میں کی گئی ترامیم کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں پیش ہونا تھا۔ مگر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاسوں میں یا تو انہیں زیرِ غور ہی نہ لایا جاسکا اور اگر انہیں ایجنڈے کا حصہ بنایا بھی گیا تو ان پر بحث کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکی۔ اس طرح یہ تینوں مسوداتِ قانون اسمبلی کی میعاد ختم ہوجانے کی وجہ سے غیر مؤثر ہوگئے۔

ایک اور پیمانہ جس سے ارکان پارلیمنٹ کی دلچسپی اور فکرمندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وہ ان مسودات کی تیاری میں کی گئی محنت ہے جنہیں ملک کے اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے میں پیش کیا جانا تھا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض صورتوں میں نجی بل مناسب تحقیق اور توجہ کے بغیر پیش کر دیے گئے؛ مثلاً بعض مسودات میں قانونی نظام اور رائج الوقت قوانین سے بے خبری کی عکاسی ہوتی ہے جبکہ بعض عام زندگی کے حقائق کی تفہیم میں ناکام نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان کی دیگر غلطیاں جن کو تھوڑی سی توجہ سے دور کیا جاسکتا تھا، مطلوبہ توجہ اور پیشہ ورانہ ذمہ داری کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں۔ آئندہ صفحات میں قوانین کے انفرادی جائزہ میں اس کی مثالیں نمایاں طور پر محسوس ہوں گی۔

قانون سازی میں حزبِ اختلاف کا کردار

2008 سے 2013ء کی پارلیمنٹ میں حکمران اور حزب اختلاف کی تقسیم یکساں نہیں رہی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے 2008ء میں سابق حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) کے خلاف پاکستان مسلم لیگ (نواز) کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ بعد میں پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان مسلم لیگ (ق) نے اپنی اپنی حیثیت تبدیل کرلی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) فروری 2011ء میں حزبِ اختلاف کا حصہ بن کر اس دھڑے کی سب سے بڑی جماعت بن گئی، جب کہ مئی 2011ء میں پاکستان مسلم لیگ (ق) حکومت

کی حلیف بن گئی۔ اسی طرح جمعیت علماء اسلام (ف)[5] جو 2008ء سے حکمران اتحاد کا حصہ تھی، دسمبر 2010ء میں حزبِ اختلاف میں شامل ہوگئی۔ ایم کیو ایم بھی اپنی حیثیت تبدیل کرتی رہی، لیکن زیادہ تر وقت میں حکمران اتحاد کا حصہ رہی۔

جہاں تک قانون سازی کے عمل میں حصہ داری کا تعلق ہے، پاکستان مسلم لیگ (ق)، بالخصوص پہلے دو برس کے دوران، خاص طور پر سرگرم رہی۔ اس دوران اس جماعت کے ارکان نے سابقہ اسمبلی میں پیش کردہ چند بلز بھی دوبارہ پیش کیے۔ اگرچہ مخلوط حکومت میں شریک ہو جانے کے بعد یہ جماعت اپنے مسودات کی منظوری کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکتی تھی، تاہم فوجداری قانون (تیسرا ترمیمی ایکٹ) مجریہ 2011ء کے سوا ان کی طرف سے کسی بل کے حوالے سے کوئی نمایاں کوشش نہیں دیکھی گئی۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) بھی قانون سازی کے محاذ پر کوئی نمایاں سرگرمی دکھانے میں ناکام رہی۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے 91 قانون سازوں کی طرف سے خواتین اور خاندان سے متعلق صرف 4 مسوداتِ قانون ریکارڈ پر ہیں۔

2002 تا 2007ء کی قومی اسمبلی سے موازنہ

تیرہویں قومی اسمبلی (2008 تا 2013ء) کی کارکردگی کے سیاق وسباق کو جاننے اور اس کا موازنہ کرنے کی خاطر 2002 تا 2007ء قائم رہنے والی بارہویں قومی اسمبلی میں قانون سازی اور قانون سازی کے رجحانات پر نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ 12ویں قومی اسمبلی (16 نومبر 2002 تا 15 نومبر 2007ء) ابتدائی عرصے کے دوران سیاسی کشمکش کا شکار رہی اور اس دوران کوئی سنجیدہ کام نہ ہوسکا۔ یہ سلسلہ دسمبر 2003ء میں آئین کی سترہویں ترمیم کی منظوری تک جاری رہا۔ حکومت کی جانب سے بارہویں قومی اسمبلی کی پانچ سالہ مدت کے دوران 222[6] جبکہ تیرہویں اسمبلی کی مدت کے دوران 91 مسوداتِ قانون متعارف کروائے گئے۔ اس کے برعکس مجموعی نجی بل جو بارہویں قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے 70 تھے[7] جبکہ تیرہویں اسمبلی کے دوران پیش کیے گئے نجی بلز کی تعداد 185 تھی۔ یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ بارہویں اسمبلی کی مدت کے دوران زیادہ تر قانون سازی صدارتی آرڈیننسز کے ذریعہ کی گئی۔ کل منظور شدہ

مسودات قانون کی تعداد 50 تھی، جب کہ نافذ کردہ آرڈیننسز کی تعداد 121 تھی۔[8] اس عرصے میں کل 38 قوانین بنائے گئے جن میں سے صرف دو یعنی فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2004ء اور تحفظِ خواتین (فوجداری قانون ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2006ء کا تعلق خواتین سے تھا۔ واحد نجی بل جو قانون بنا وہ شادی کی تقریبات سے متعلق تھا۔[9]

چونکہ بارہویں قومی اسمبلی پہلی اسمبلی تھی جس میں خواتین کی نمائندگی میں اضافہ کیا گیا تھا اس لیے متعدد مطالعہ جات میں خواتین قانون سازوں کی کارکردگی کے مطالعہ پر توجہ مرکوز کی گئی۔[10] تاہم کسی رپورٹ میں خاص طور پر خواتین اور خاندان سے متعلق مسوداتِ قانون کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں خواتین کے کردار کے بارے میں فرزانہ باری صاحبہ کے مشاہدے کا حوالہ قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتی ہیں: ''قومی اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران خواتین ارکان پارلیمنٹ نے جن امور کو اٹھایا اس فہرست میں خواتین سے متعلق خاص سوالات تیسرے نمبر پر ہیں۔ خواتین ارکان پارلیمنٹ جن معاملات پر زیادہ سرگرم تھیں ان کا تعلق عام مسائل سے تھا اور ان کی توجہ خواتین کے مسائل تک محدود نہیں تھی۔'' خواتین کی اس وسعتِ نظر کے برعکس، مرد ارکان کے پیش کردہ مسودات میں سے صرف ایک بل، خواتین دشمن روایات (فوجداری قانون ترمیمی) بل 2006ء[11] ایسا واحد بل تھا جس کا تعلق خاص طور پر خواتین اور خاندان سے تھا۔ یہ مسودۂ قانون چوہدری شجاعت حسین صاحب نے پیش کیا تھا۔

بارہویں قومی اسمبلی کی مدت کے دوران حزب اختلاف کی جماعتیں (پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین، متحدہ مجلس عمل اور پاکستان مسلم لیگ ۔ن) واضح طور پر سرگرم رہیں۔ چھ جماعتی اتحاد متحدہ مجلس عمل[12] کی ایک رپورٹ (محدود اشاعت) کے مطابق اس نے قومی اسمبلی میں 74 مسوداتِ قانون پیش کیے۔[13] پیپلز پارٹی نے بھی متعدد بل پیش کیے۔ فرزانہ باری نے خاتون ارکان کی طرف سے پیش کردہ ایسے 32 مسودات کا ذکر کیا ہے جو اسمبلی کے خاتمے تک زیرِ التوا تھے۔ ان میں سے 14 پیپلز پارٹی کے قانون سازوں کے پیش کردہ تھے۔

اس مختصر جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمانی نظام میں استحکام اور تسلسل نے جمہوری روایات

کو مضبوط تر کیا ہے اور بارہویں قومی اسمبلی کی نسبت تیرہویں قومی اسمبلی میں زیرِ بحث موضوع پر نسبتاً زیادہ اشتراکِ عمل نظر آیا۔

.....

حواشی

1۔ قواعد وضوابطِ کار قومی اسمبلی مجریہ 2007ء کی رُو سے قومی اسمبلی کا ہر وہ رکن پرائیویٹ ممبر ہے جو وزیر نہ ہو۔ (قاعدہ دوم)

2۔ کچھ اور مسوداتِ قانون- مثلاً بچوں کی بہبود اور حقوق کا بل وغیرہ- بھی وسیع تر مفہوم میں اس مطالعہ سے متعلق سمجھے جا سکتے ہیں، تاہم براہِ راست متعلق نہ ہونے کے باعث انہیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

3. Women's Parliamentary Caucus,
http://www.wpcp.org.pk/wpcp/page.aspx?page=Parlimenthistory
(accessed on February 12, 2013)

4۔ (متحدہ مجلسِ عمل، پاکستان مسلم لیگ فنکشنل، بلوچستان نیشنل پارٹی۔عوامی، نیشنل پیپلز پارٹی، پاکستان پیپلز پارٹی۔ شیر پاؤ) بمطابق قومی اسمبلی کی ویب سائٹ:
http://www.na.gov.pk/en/party-stats.php (accessed on February 9, 2013)

5۔ جمعیت علماءِ اسلام (ف) نے متحدہ مجلس عمل (MMA) کے نام سے الیکشن میں حصہ لیا تھا۔

6. PILDAT, Performance of 12th National Assembly of Pakistan.

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً

9۔ متحدہ مجلسِ عمل (MMA) کے لئیق خان کا پیش کردہ یہ بل شادی کی تقریبات (نمود ونمائش اور غیر ضروری اخراجات کا امتناع) (ترمیمی) ایکٹ مجریہ 2006ء کی حیثیت سے منظور ہوا۔

10۔ مثال کے طور پر دیکھیے:
Farzana bari, Role and Performance: Assessment of Pakistani Women Parliamentarian 2002-2007, Encore: Islamabad, 2009; Naeem Mirza and Wasim Wagha, A Five Year Report on Performance of Women Parliamentarians in the 12th National Assembly, Aurat Foundation, Islamabad, and PILDAT, First year of Increased women representation in the Parliament" Islamabad, 2004.

11۔ 2008 سے 2013ء کی پارلیمنٹ میں یہی بل دوبارہ پیش ہوا اور منظوری کے بعد قانون بن گیا۔

12۔ متحدہ مجلسِ عمل (MMA) میں یہ جماعتیں شامل تھیں: جمعیت علماءِ اسلام (ف)، جماعتِ اسلامی، جمعیت علماءِ پاکستان، جمعیت علماءِ اسلام (س)، جمعیت اہلِ حدیث اور تحریکِ اسلامی۔

13۔ پارلیمنٹ کے کسی ایوان کے سیکرٹریٹ میں جمع کروائے گئے مسودات قانون (بلز) کی تعداد اور ایوان میں پیش کیے گئے مسوداتِ قانون کی تعداد میں فرق ہوسکتا ہے کیونکہ کوئی پرائیویٹ رکن صرف ایوان کی اجازت ملنے کے بعد ہی بل کو متعارف کرواسکتا ہے۔ (قواعد وضوابطِ کار قومی اسمبلی مجریہ 2007ء، قاعدہ 119)

باب ششم

خلاصۂ بحث اور سفارشات

اس اختتامی باب میں جہاں عمومی طور پر قانون سازی کے رجحانات کے جائزہ کی روشنی میں خواتین اور خاندان سے متعلق موضوعات کی اہمیت کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں تفصیلی بحث میں سامنے آنے والے اہم نکات اور سفارشات کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

تیرہویں قومی اسمبلی (2008-2013) میں قانون سازی کی مجموعی صورتِ حال بارہویں اسمبلی (2002-2007) کی نسبت بہتر نظر آتی ہے۔ گزشتہ قومی اسمبلی کی مدّت کے دوران منظور کردہ 38 قوانین کی نسبت تیرہویں اسمبلی کی مدّت کے دوران پارلیمان نے 91 قوانین منظور کیے۔ ایک اور نمایاں بہتری نجی ارکان کی طرف سے پیش کیے گئے بلز سے متعلق ہے۔ بارہویں قومی اسمبلی میں عمومی رویہ یہ تھا کہ نجی ارکان کی طرف سے پیش کردہ مسوداتِ قانون کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ پورے پانچ سال کے دوران قومی اسمبلی سیکرٹریٹ کو موصول ہونے والے 240 نجی مسوداتِ قانون میں سے صرف 70 کو اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت ملی، جن میں سے صرف ایک قانون کی شکل اختیار کر سکا۔ اس کے برعکس تیرہویں قومی اسمبلی نے نجی ارکان کے 185 مسوّدات کو قبول کر کے متعلقہ قائمہ کمیٹیوں کے سپرد کیا۔ ان میں سے 18 اسمبلی نے منظور کیے،[1] جن میں سے 3 خواتین اور خاندان کے امور سے متعلق تھے۔

قانون سازی کے رجحانات

- قومی اسمبلی نے اپنی مذکورہ مدّت (2008-13) کے دوران جہاں خواتین اور خاندان کے احترام سے متعلق قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ میں بھیجی گئی ہر تجویز کا جائزہ لیا وہاں خواتین کے حقوق اور انہیں درپیش مسائل پر بھرپور بحث کے ساتھ ساتھ اِن مسائل کو قانون سازی کے لیے زیرِ بحث دیگر امور کی نسبت ایوان میں زیادہ توجہ حاصل رہی۔ اس سب کے باوجود جب معاشرے میں بکھرے اُن بے شمار مسائل کو دیکھا جائے جن کا سامنا خواتین کو کرنا پڑتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کو ان پانچ برسوں میں اس سے بہتر کارکردگی دکھانی چاہیے تھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب قومی اسمبلی کی سپیکر بھی ایک خاتون (محترمہ فہمیدہ مرزا) تھیں، تعاون اور مفاہمت کی فضا بھی پہلے سے کہیں زیادہ تھی اور متعدد امور پر اتفاق رائے بھی جھلکتا نظر آتا تھا۔ قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر (جناب فیصل کریم کنڈی) کے ایک انٹرویو کے مطابق ''97 فیصد سے زائد بل اتفاقِ رائے سے منظور ہوئے''۔[2] اتفاقِ رائے کا یہ اظہار اٹھارہویں،[3] انیسویں[4] اور بیسویں[5] آئینی ترامیم اور دیگر قوانین کے ساتھ ساتھ اہم قومی معاملات پر قراردادوں[6] کی شکل میں بھی نظر آیا۔ کارکردگی میں مزید بہتری کی توقع اس لیے بھی تھی کہ خواتین کے

حقوق اور خاندان کے مقام و کردار پر بحث کو میڈیا، سماجی اور علمی حلقوں میں بھی خوب پذیرائی مل رہی تھی۔ بہت سے مسائل جو مسوّداتِ قانون کی شکل میں پارلیمان کے ارکان کی بحث کا حصہ بنے، اہمیت کے لحاظ سے اس بات کے متقاضی تھے کہ قانون کا حصہ بنتے؛ بالخصوص بچوں اور دودھ پلاتی ماؤں کی دیکھ بھال کے لیے لازمی عبوری حکم کے حصول کے بل۔ اسی طرح اُن مسوّدات کو بھی قانون کی شکل اختیار کرنا چاہیے تھی جو تیزاب اور دیگر جلانے والے مادوں کی تیاری، انہیں رکھنے اور ان کی خرید و فروخت سے متعلق کسی جامع حکمت عملی کو تشکیل دینے سے متعلق تھے۔

● یہ ذکر ہو چکا ہے کہ زیادہ تر مسوّدات، چاہے وہ سرکاری تھے یا نجی، اسمبلی کی مدّت کے ابتدائی دو سالوں میں پیش کیے گئے۔ پہلے 27 مسوّدات میں سے بیشتر اُن ارکان کی طرف سے پیش کیے گئے تھے جو مسلسل دوسری مدت کے لیے رکن قومی اسمبلی کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے جبکہ کئی بل ایسے بھی تھے جنہیں سابقہ اسمبلی میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اسمبلی کی تحلیل کے باعث زائد المیعاد ہو کر غیر مؤثر ہو گئے تھے۔ 7 سابقہ اسمبلی کے اِن زائد المیعاد بلوں کو دوبارہ قومی اسمبلی میں پیش کرنا مطلوب ہدف اور مقاصد سے وابستگی اور مسائل پر حقیقی تشویش کا عکاس بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض صورتوں میں جہاں یہ نظر آتا ہے کہ بِل جمع کروانے والے رکنِ پارلیمان نے اس کی منظوری یا پیش رفت کے حوالے مکمل عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو یہ خیال بھی آتا ہے کہ تیار شدہ مسوّدے کو دوبارہ جمع کروا کے یہ محض سیاسی طور پر نمایاں ہونے کا ایک آسان حربہ بھی ہو سکتا ہے۔

● تیرہویں اسمبلی کی مدّت کے آخری تین برسوں کے دوران پیش کردہ مسوّداتِ قانون کی تعداد میں کمی کی ایک اہم وجہ اپریل 2010 میں اٹھارہویں آئینی ترمیم کی منظوری بھی ہو سکتی ہے، جس نے قانون سازی کے لیے مرکز اور صوبوں کے درمیان مشترک فہرست کو حذف کر دیا ہے۔ قبل ازیں وفاقی آئین ساز ادارہ (پارلیمنٹ) وفاقی قانون سازی کی فہرست میں درج موضوعات پر مکمل اور قانون سازی کی مشترکہ فہرست میں درج موضوعات پر صوبائی حکومتوں کے ساتھ ساتھ قانون سازی کر سکتا تھا۔ وہ موضوعات جو ان دونوں فہرستوں میں مذکور نہ ہوں، ان پر قانون سازی کا بلا شرکتِ غیرے اختیار صوبائی مجالسِ قانون ساز کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے قانون سازی کی مشترکہ

فہرست حذف کر دیے جانے کے بعد پارلیمان کے لیے قانون سازی کے موضوعات بہت کم رہ گئے اور قانون سازی کی وفاقی فہرست کے علاوہ تمام امور صوبائی دائرۂ کار میں چلے گئے۔ فوجداری قانون کے بیشتر حصوں، دیوانی اور فوجداری ضابطوں، شادی، طلاق اور سماجی بہبود سمیت بہت سے موضوعات صوبوں کو منتقل کر دیے گئے۔ تاہم یہ بات اہم ہے کہ وفاقی دارالحکومت کے لیے کی جانے والی تمام تر قانون سازی اب بھی پارلیمنٹ ہی میں ہونا ہے، لہٰذا پارلیمان کے پاس یہ موقع موجود ہے کہ وہ ہر طرح کے موضوعات پر قانون سازی کے ذریعے اچھی مثال پیدا کر کے راہنما کا کردار ادا کرے اور صوبوں کے لیے تقلید کا باعث بنے۔

● حالیہ برسوں میں سماجی تنظیموں کا کردار بتدریج بڑھا ہے۔ اس طرح کی بہت سی تنظیمیں اپنے اپنے شعبوں میں رائے سازی، اپنے موقف پر لوگوں کو آمادہ کرنے کی کوشش اور پالیسی کی تشکیل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تحقیق اور تشہیر میں بھی مصروفِ عمل ہیں۔ کئی معاملات میں دیکھا گیا ہے کہ انہی میں سے کسی تنظیم نے کسی خاص حوالے سے قانون سازی کو اپنا ہدف قرار دیا اور ایک بنیادی مسوّدہ تیار کر دیا جو کسی رکنِ پارلیمان کی طرف سے پارلیمنٹ میں پیش کر دیا گیا۔ بعد ازاں اسی خاص مقصد کو اجاگر کرنے کے لیے مجالسِ مشاورت، تربیتی اجلاسوں، آگاہی و تشہیر کی مہمات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک کثیر جہتی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قانون سازی کے مختلف مراحل کے دوران بل پر ہونے والی بحث پر نگاہ رکھ کر میڈیا میں اس پر بات چیت اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے تاکہ اس مسئلے کو زندہ رکھا جا سکے۔ ایسے میں یہ نہایت قابلِ فہم ہے کہ اس طرح کے بلز کا قانون کی شکل اختیار کر لینے کا امکان زیادہ ہوتا ہے جبکہ کچھ دیگر ایسی اہم تجاویز صرف اس لیے فائلوں میں دَب کر قصۂ پارینہ بن جاتی ہیں کہ ان کی پشت پر رائے سازی اور وکالت کی ایسی کوئی جارحانہ مہم موجود نہیں ہوتی۔

● اصولی طور پر رائے سازی کی اجتماعی اور منظّم کوششوں میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جمہوری معاشروں میں انہیں قبولِ عام حاصل ہے۔ ایسی کوششیں قانون سازی میں عوامی شرکت کی ہی ایک قسم شمار کی جاتی ہیں۔ تاہم ایسے تمام معاملات میں قانون سازوں سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ دانا و بینا

قائدین کا کردار ادا کریں اور کسی خاص تناظر میں پیدا کیے گئے ماحول میں اپنی سمجھ بوجھ کو زیادہ باریک بینی اور دیگر نقطہ ہائے نظر کو جاننے کے لیے استعمال کریں۔ انہیں یہ ملکہ حاصل ہونا چاہیے کہ وہ مسائل کا جائزہ لیں، ان سے وابستہ تمام فریقوں کو سنیں اور مسئلے کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھیں۔ قانون سازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عملی مسائل سے متعلق مناسب تفہیم حاصل کریں اور مقامی تناظر میں ان کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوں۔ جب تک ان کی جڑیں معاشرے میں بہت گہری نہیں ہوں گی اور ان کا رابطہ ملک کے عام شہریوں کے ساتھ مؤثر اور مضبوط نہیں ہوگا اس بات کا خدشہ رہے گا کہ وہ کسی بھی پریشر گروپ کی مہم کا شکار ہو جائیں۔ جس کا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف پاکستانی معاشرے کے حقیقی مسائل کو نظر انداز کر بیٹھیں گے بلکہ ان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائیں گے۔ سب سے بڑھ کر قانون سازوں میں یہ اہلیت ہونی چاہیے کہ وہ بیرونی دباؤ یا غیر ملکی پیسے کی بنیاد پر اٹھائے گئے اقدامات کا شکار ہونے سے بچیں اور خود اتنے بااعتماد ہوں کہ قوم کی فلاح و بہبود کی طرف رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

● ایسا بہت ہی کم دیکھنے کو ملا ہے کہ بل پیش کرنے والوں نے بل میں پیش کیے گئے مسائل پر حقیقی تشویش کا مظاہرہ بھی کیا ہو۔ نہ صرف نجی بلوں کی ایک بڑی تعداد بلکہ حکومت کی طرف سے پیش کیے گئے بعض بل بھی سالہا سال تک زیر التوا رہے ہیں۔ کچھ بل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین کی الگ الگ رضامندی حاصل کرنے کے بعد بھی محض اس لیے قانون نہ بن سکے کہ نہ تو قومی اسمبلی، سینیٹ کی طرف سے ترمیم کے بعد ان پر نظر ثانی کر سکی اور نہ ہی انہیں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کے ذریعے منظور کیا جا سکا۔

● گزشتہ اسمبلیوں کی طرح زیرِ نظر اسمبلی میں بھی دیکھا گیا کہ جن بلوں کو منظوری کے لیے مناسب نہیں سمجھا گیا انہیں ملتوی رکھا گیا، یہاں تک کہ قومی اسمبلی تحلیل ہوگئی اور یہ مسوّدات غیر مؤثر اور زائد المیعاد ٹھہرے۔ ایسے میں متعلقہ مجالسِ قائمہ اپنی رپورٹ پیش ہی نہیں کرتیں۔ یہ ہو سکتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بل میں بیان کردہ مسئلہ تو انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن سامنے آنے والا حل کسی وجہ سے مناسب نظر نہیں آتا۔ تاہم اگر کمیٹی اپنے نتائج اور مشاہدات کے ساتھ رپورٹ اسمبلی میں پیش کر دے

تو اس سے یقیناً دوسروں کو مدد فراہم ہو جاتی ہے کہ وہ اسے بہتر کرنے کی ایک کوشش کر دیکھیں اور ممکن ہے کہ مسئلے کے حل کے لیے کوئی قابلِ عمل اور بہتر طریقہ کار سامنے آ جائے۔

- بعض مسوّدات کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ انہیں زیرِ غور معاملے کی مناسب تفہیم کے بغیر تیار کیا گیا تھا۔ نیز موضوع، مقصد اور پارلیمان کی اہمیت اور حساسیّت کے پیشِ نظر ٹائپنگ اور زبان کی جن غلطیوں کو معمولی توجہ سے ختم کیا جا سکتا تھا، ان پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ ملک کے اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے میں پیش کیے گئے مسوّدات کے متن میں اس طرح کی کوتاہیاں اس لیے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں کہ قومی اسمبلی سیکرٹریٹ کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی کے لیے تیار کیے گئے مسوّدے پر تکنیکی حوالے سے ہر طرح کی سہولت فراہم کرے۔[8] قانون سازی میں سہولت فراہم کرنے کے لیے ایک اور اہم پیش رفت 2008ء کے تیسرے ایکٹ کے ذریعے پارلیمانی خدمات کے ادارے (PIPS) کا قیام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بیشتر معاملات میں پارلیمنٹ کے ارکان نے اس ادارے سے استفادہ ضروری خیال نہیں کیا۔

ایک اور فورم جس کے ذریعے کارکردگی معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے، خود سیاسی جماعتیں ہیں۔ عام طور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ کسی فرد کی طرف سے اٹھایا گیا معاملہ اس جماعت کا ایک اجتماعی اقدام ہے۔ اس کے برعکس پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں بالخصوص قومی اسمبلی میں کسی نجی رکن کی طرف سے اٹھایا گیا کوئی قدم بالعموم خود اس رکن ہی کی دلچسپی اور سوچ کا عکاس ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا مسوّدات میں صرف پاکستان مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی رہنما اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے خواتین مخالف طرزِ عمل کی روک تھام کے بل[9] کو اس ضمن میں یقینی طور پر استثنا حاصل ہے۔ صحت مند پارلیمانی ماحول کے لیے اور اپنے منشور کے ساتھ ایک حقیقی عزم کے اظہار کے لیے ہر سیاسی پارٹی سے توقع کی جانی چاہیے کہ وہ اپنی قیادت اور بالخصوص فعّال ارکان کی تکنیکی مدد کا نظام وضع کریں گی۔

وعدوں اور کارکردگی کا موازنہ

پارلیمان میں قانون سازی کے حوالے سے سیاسی جماعتوں کی کارکردگی کو 2008ء کے انتخابات

میں ان کے انتخابی منشوروں کی بنیاد پر بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین، جو 2008-13 کے دوران برسرِ اقتدار رہی، نے اپنے منشور میں خواتین کو اموال و وسائل کی قانونی ملکیت کو یقینی بنانے کے لیے مؤثر قانون سازی کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے اقتدار کے پانچ سال کے دوران مذکورہ مقصد کے تحت کوئی بل پیش نہیں کیا۔ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین نے قبائلی رسوم و رواج، غیرت کے نام پر قتل اور جبری شادی کے نام پر خواتین کے ساتھ کیے جانے والے جرائم کی روک تھام کے لیے اداراتی اقدامات اٹھانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ اس ضمن میں فوجداری قانون (تیسرا) ترمیمی ایکٹ 2011ء کے ذریعے پیش رفت ہوئی ہے لیکن یہ دراصل پاکستان مسلم لیگ کی طرف سے پیش کردہ بل تھا، نہ کہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کی طرف سے۔ تاہم اس عرصہ میں پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین سے تعلق رکھنے والے نجی اراکین نے مختلف موضوعات پر 14 مسودات قانون سازی کے لیے پیش کیے۔

حزبِ اختلاف کی بڑی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ۔نواز نے بھی 2008ء کے انتخابی منشور کہا تھا کہ پارٹی اس بات کی کوشش کرے گی کہ خواتین کے احترام، وقار اور تحفظ کے لیے ان تمام اقدامات کو یقینی بنائے جو اسلام نے انہیں دیے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مسودہ (تحفظ اکرامِ نسواں بل 2009ء) اسی جماعت سے تعلق رکھنے والی ایک رکنِ اسمبلی نے پیش کیا تھا، لیکن یہ دراصل عمومی اصولوں کی وضاحت پر مبنی ایک بیان ہی تھا، نہ کہ متعین قانون سازی کے لیے تیار کردہ مسودہ۔ واضح طور پر یہ کسی اجتماعی یا سوچی سمجھی کوشش کا حاصل نہیں تھا۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے خواتین پر تشدد کے خلاف اور خواتین کے لیے چھوٹے قرضوں کی سہولت کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم اس طرح کا کوئی اقدام مذکورہ پانچ برسوں کے دوران نہیں دیکھا گیا۔

پاکستان مسلم لیگ (ق) 07-2002 کے پانچ سال اقتدار میں رہ چکی تھی۔ اس کے 2008ء کے انتخابی منشور میں خواتین سمیت معاشرے کے مختلف طبقوں کے لیے مخصوص اقدامات کا تذکرہ نہیں تھا، بلکہ جماعت نے اپنے رہنما اصولوں کو پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ بہرحال قانون سازی کے عمل میں پاکستان مسلم لیگ ق کا حصہ نمایاں رہا اور 35 نجی بلوں میں سے 14 اُن کی طرف سے پیش کیے گئے تھے۔

متحدہ قومی موومنٹ (MQM) نے وعدہ کیا تھا کہ وہ عوامی بیداری مہم کا آغاز کرے گی اور ایسی

سماجی برائیوں سے نمٹنے کے لے سخت قانون سازی کے اقدامات کرے گی جن میں صنفی امتیاز، جنسی طور پر ہراساں کرنے کے عمل، گھریلو تشدد، بچوں سے بدسلوکی، انتقاماً عصمت دری، مخالفین کی خواتین کو سڑک پر برہنہ کر کے چلنے پر مجبور کرنا، غیرت کے نام پر قتل، بچوں کی شادی، کاروکاری، ونی، قرآن سے شادی، جبری مشقت اور بچوں سے مزدوری لینے جیسے عمل شامل تھے۔ اس سب کے برعکس، اس جماعت کی طرف سے سامنے آنے والا واحد مسوّدہ قانون پارٹی کی خاتون رکن نے اسمبلی کی مدّت کے اختتامی دنوں میں (فروری 2013ء میں) ایوان میں متعارف کروایا تھا جو یتیم اور نامعلوم حسب نسب رکھنے والے بچوں کی رجسٹریشن سے متعلق تھا۔

غور وفکر کے حامل نکات

- کئی ایسے اہم مسائل ہیں جو پارلیمنٹ کی توجہ حاصل نہیں کر پائے، اگرچہ ان پر قانون سازی اور دیگر متعلقہ اقدامات سے خواتین کو فوری سہولت ملنے اور خاندانی ڈھانچہ مضبوط ہونے کا قوی امکان تھا۔ مثلاً اسلام کے وضع کردہ طریقہ کار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک وقت میں تین طلاقیں دینے کی حوصلہ شکنی کے لیے قانون سازی، طلاق کی رجسٹریشن، کام کرنے والی خواتین کے لیے زچگی کے فوائد میں اضافہ اور دورانِ عدت انہیں چھٹی فراہم کرنے جیسے عوامل ان چند اہم مسائل میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ دراصل اہمیت انہی مسائل کو دی جانی چاہیے جن کا سامنا خواتین کو معمول کی زندگی میں کرنا پڑتا ہے اور جن سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی پر اثرات مرتب ہو رہے ہوتے ہیں بلکہ ان کی گھریلو زندگی بھی متاثر ہو رہی ہوتی ہے۔ مختصراً یہ کہ پارلیمنٹ کو صرف ردّعمل ہی ظاہر نہیں کرتے رہنا چاہیے بلکہ اس کا کردار قائدانہ ہونا چاہیے۔ پارلیمنٹ کے ارکان سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر مسائل کی نشان دہی کریں گے، ان کا حل تلاش کریں گے اور اس حل پر عمل درآمد کی صورت پیدا کریں گے۔

- اس امر پر بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ رکن پارلیمان جو کسی موضوع پر قانون سازی کے لیے تجویز پیش کرنا چاہتا ہو، خوب آگاہ ہو کہ اِس موضوع پر عوامی، پالیسی اور رائے سازی کے حلقوں میں تازہ ترین کیا بحث چل رہی ہے۔ اس سے نہ صرف وہ تمام متعلقہ فریقوں کے تحفظات اور مفادات کی دیکھ بھال کرنے میں مدد لے سکے گا بلکہ اس طرح اسے یہ موقع بھی فراہم ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں بہترین تجاویز کا

انتخاب کر سکے۔ مثلاً دفعہ 498-C کو 2011ء کے چھبیسویں ایکٹ کے ذریعے مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں شامل کیا گیا تھا جس کا مقصد قرآن مجید سے شادی کو جرم قرار دینا تھا۔ اس ضمن میں وہ تجویز زیادہ بہتر تھی جسے اسلامی نظریاتی کونسل سے منظوری حاصل تھی اور جس پر متعلقہ حصے میں بحث کی جا چکی ہے۔ قاعدے کے مطابق جب ایک بل پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان میں پیش کر دیا جاتا ہے اور اسے متعلقہ قائمہ کمیٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ کمیٹی اس پر تحقیق اور تجزیہ کے لیے کوئی طریقۂ کار طے کرے گی اور ساتھ ہی ساتھ تمام متعلقہ فریقوں کو بھی اس معاملے میں شامل کرے گی۔ اگرچہ بعض صورتوں میں اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے تاہم اسے قانون سازی کا عام طریقہ کار بنا لیا جائے تو اسی سے نہ صرف قانون سازی کا معیار زیادہ بہتر اور جامع ہو جائے گا بلکہ معاشرے میں بھی وسیع تر قبولیت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

- قانون سازی اور قومی پالیسیوں کا مقصد ایک ایسے ہم آہنگ معاشرے کا حصول ہونا چاہیے جس میں طبقاتی تقسیم اور احساس محرومی کم سے کم ہو۔ جہاں تک سماجی تعمیر میں صنف کے کردار کا معاملہ ہے تو اس بات کو اہمیت دی جانی چاہیے کہ خواتین کے اُن سمیت تمام حقوق کی ضمانت دی جائے جو خواتین اور خاندان کے موضوع پر ذکر کردہ حصوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے توازن اور تناسب بگڑنا نہیں چاہیے۔ دیکھا گیا ہے کہ خواتین کے حقوق کی جدوجہد ایسی مراعات کی طالب ہو جاتی ہے جو بجائے خود ایک نوعیت کے صنفی تعصب پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس نوعیت کا عدم اعتدال بھی معاشرے کے لیے اسی طرح خطرناک ہوگا جس طرح خواتین کے خلاف تعصب کی فضا خطرناک ہے۔ چنانچہ عوام کے نمائندوں کو اس ذمہ داری کا ادراک ہونا چاہیے جو انہیں عطا کی گئی ہے اور کسی بھی ایسی سوچ کو تسلیم نہیں کر لینا چاہیے جو غیر متوازن اور ناانصافی پر مبنی ہو۔

- معاشرے کے تمام افراد بالخصوص قیادت کو اس بات کا بھرپور احساس اور اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ پاکستانی معاشرے میں خاندان کا ادارہ ہی استحکام کی بنیاد اور انفرادی و اجتماعی توانائی کا سرچشمہ ہے۔ دستورِ پاکستان میں مذکور حکمتِ عملی کے وہ اصول جن کی پاسداری ریاست کے ہر عضو اور ادارے پر لازم ہے، میں ایک اہم اصول ''شادی، خاندان، ماں اور بچے کا تحفظ'' ہے۔ اس بنیادی اصول

کی جھلک لوگوں کی سماجی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے ہر قانون اور قومی پالیسیوں میں نظر آنی چاہیے۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ 2008ء سے 2013ء تک کام کرنے والی قومی اسمبلی نے اپنے آخری دنوں میں پاکستان مسلم لیگ ق کی ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ کی طرف سے پیش کی گئی قرارداد میں پاکستانی عورت، اس کے کردار اور مقام و مرتبہ کو متعین کرنے والے خیالات کو ایک واضح شکل دی ہے۔ 8 مارچ 2013ء کو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر قومی اسمبلی میں اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس قرارداد میں پارلیمنٹ نے یہ یقین دہانی کروائی کہ خواتین کو زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا حقیقی مقام دلایا جائے گا تاکہ خاندان کے ادارے کی مضبوطی، سماجی طبقات کو قوت دینے اور قوم کی تعمیر کے مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔[10] قانون سازی سے ہٹ کر عقدِ نکاح کے تقدس اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کی آگاہی کو تمام دستیاب ذرائع کی مدد سے پھیلانے اور ان کی اہمیت معاشرے تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

- کسی بھی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دوسروں کے تجربات اور رویّوں سے سیکھنا ایک مثبت طرزِ فکر ہے لیکن باہمی استفادہ کے اس عمل میں یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ لازم نہیں کہ کوئی ایک ہی حل تمام حالات میں مؤثر ثابت ہو۔ بالخصوص انسانی معاشروں کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر معاشرہ اپنے بنیادی فلسفہ، سماجی تعبیر، ثقافتی علامات، مذہبی اقدار، نظریات اور نقطہ ہائے نظر کے لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اصولی طور پر ہر جگہ تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن عملی طور پر عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک بہتر، مؤثر اور دیرپا حل کے لیے انسانوں کے باہم حقوق اور فرائض کو کسی بھی معاشرے کے اپنے نظام ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پالیسی سازوں اور قانون سازوں کو رائج الوقت موضوعات کو قبول عام سمجھ کر پروپیگنڈے کی رو میں نہیں بہہ جانا چاہیے کیونکہ بالعموم پیش کیے جانے والے نظریات اور لائحہ ہائے عمل درحقیقت مغرب کے اپنے تجربات کا حاصل ہیں اور پاکستان کی مقامی ثقافت کے لیے اجنبی ہیں۔

- خاندان کے ادارے کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے سماجی مسائل کے حل کے لیے کی جانے والی تمام کوششیں معاشرے کے اندر موجود طریقۂ کار کے تحت ہونی چاہییں۔ پاکستان کے عائلی قوانین

آرڈیننس مجریہ 1961ء میں تجویز کردہ ثالثی کونسل خاندانی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے ایک اچھا ماڈل ہے۔ یہ نہ صرف قرآن کے دیے ہوئے ماڈل کے قریب تر ہے بلکہ پاکستانی معاشرے کے سماجی ڈھانچے سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ گویا خاندان کے ادارے کو مضبوط اور مستحکم مثالی حکومتوں کے نظام کے ذریعے مضبوط کیا جانا چاہیے۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ بلدیاتی سطح پر اہم سیاسی اور سماجی ادارے سالہا سال سے معطل پڑے ہیں اور پارلیمان اس نقصان کا ادراک تک ظاہر کرنے میں ناکام ہے۔

- ایک بات جس کا معاملہ صرف ارکانِ پارلیمنٹ سے نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی جمہوریت کے ساتھ جا ٹھہرتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی پارلیمانی نظام میں عوامی نمائندوں کی کارکردگی کی مسلسل نگرانی انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو اپنے نمائندوں کی کارکردگی پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ وہ سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کی طرف سے کرائی گئی یقین دہانیوں اور وعدوں کا مسلسل محاسبہ کریں۔ یہ بات ذہنوں میں بٹھالینی چاہیے کہ عوامی نمائندے جب تک اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ ہر لمحہ لوگوں کے سامنے جواب دہ اور ان کے لیے کاموں کے ذمہ دار ہوتے ہیں نہ کہ صرف اسی وقت جب اگلے انتخابات ہونے والے ہوں۔ جو لوگ انتخاب میں اپنا ووٹ ڈال دینے کے بعد اپنے حقوق سے لاتعلق ہو جاتے ہیں انہی کا اپنے حقوق سے محروم رہ جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

- یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ معاشرے کے تمام شعبوں کو حقوق کی فراہمی یقینی بنانے کے جن عوامل کو اہمیت حاصل ہے وہ زیادہ سے زیادہ بیداری، حساسیت، تعلیم اور مشاورت ہیں۔ جب تک معاشرے کے ارکان خود سے ذمہ دار نہ ہو جائیں، قوانین کا کوئی بھی مجموعہ چاہے وہ کتنا ہی مضبوط و مؤثر کیوں نہ ہو، دوسروں کے حقوق کا احترام کرنے کے لیے انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ عوامی نمائندوں اور سیاسی قیادت کو اس ضمن میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ نہ صرف قانون سازی اور انتظامی اقدامات کے ذریعے بلکہ اس کے لیے انہیں لوگوں کے سامنے عملی مثالیں پیش کرنا ہوں گی۔ جب حکمران قانون، انصاف اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا شروع کر دیں گے تو ان کے بنائے گئے یہ معیار معاشرے میں مجموعی طور پر خود بھی پھیلتے چلے جائیں گے۔

- عوام میں بیداری پیدا کرنے کا ایک اہم پہلو خواتین کی تعلیم ہے۔ اگرچہ خواتین کی تعلیم

2008-13 کی اسمبلی کے پورے عرصہ کے دوران توجہ کا مرکز نہ بن سکی تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ قومی اسمبلی نے 14 مارچ 2013ء کو اپنی نشست کے آخری دن ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی تھی[11] جس میں کسی بھی ایسے عمل کی شدید مذمت کی گئی جو لڑکیوں کی تعلیم میں کسی بھی طرح رکاوٹ پیدا کرے۔ اس قرارداد نے آئندہ اسمبلی پر زور دیا تھا کہ وہ قانون سازی کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ کو واضح طور پر مجرمانہ فعل قرار دے۔ اس قسم کا کوئی اقدام نئی حکومت کے قیام کے ڈیڑھ سال گزر جانے کے باوجود اب تک تو سامنے نہیں آیا۔

- مختلف مسوّداتِ قانون کی تمہید یا اسباب و مقاصد کے بیان میں بین الاقوامی معاہدوں اور اعلامیوں کے حوالے دیے جاتے ہیں اور بل کا مقصد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ان بین الاقوامی معاہدوں کے مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا جاسکے اور ان کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عالمی سطح پر تشکیل پانے والے بہت سے قوانین نے انسانیت کو کئی طرح سے فائدہ پہنچایا ہے لیکن حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ بین الاقوامی قوانین پر مشتمل عہدِ حاضر کا نظام زندگی کے حوالے سے ایک مخصوص پیرائے (Paradigm) پر استوار ہے، جس کے فلسفے میں ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ''بقا اسی کی ہے جو زیادہ توانا اور موزوں ہو'' (Survival of the fittest)۔ یہی اصول اقتصادی اور فوجی لحاظ سے غالب مغربی دنیا کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خود اپنے معیارات کو عالمی معیارات قرار دے، اپنے تجربات کو انسانیت کے تجربات کے طور پر پیش کر کے ہر ایک کے لیے بطورِ حجت پیش کرے اور جس طرزِ زندگی کا انتخاب اس نے کیا ہے اسے دنیا بھر میں رائج کرنے کے لیے ہر ممکن وسیلہ اختیار کرے۔[12]

اس سب کے باوجود اصولی لحاظ سے یہ بات بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ ہر معاشرہ اپنے نظریہ، مقاصد اور نقطۂ نظر کے لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی معاہدوں اور اعلامیوں سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ ان میں مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے نقطہ ہائے نظر کی مجموعی عکاسی موجود ہوگی، ان میں یہ گنجائش بھی موجود ہونی چاہیے کہ ہر قوم اپنے مقامی معاملات، خاص طور پر سماجی تعمیر، خاندانی ڈھانچے اور صنفی نقطۂ نظر، کے مطابق ان کی تشریح اور اطلاق کر سکے۔ چونکہ مسلم معاشرے مغربی معاشروں کے

مقابلے میں ایک الگ طرز رکھتے ہیں اس لیے کئی مواقع ایسے ہوتے ہیں جب ان معاشروں کے لیے یہ بہت مشکل امر ہوتا ہے کہ وہ ان معاہدوں کی شقوں یا کنونشن کے مقاصد کو اپنے مذہب اور مقامی ثقافت پر منطبق کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یا تو معاہدے کی شقوں کی خلاف ورزی کی صورت میں نکلتا ہے یا پھر معاشرتی اقدار سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

بہتر طریقہ کار یہی ہے کہ بین الاقوامی معاہدات میں تمام تہذیبوں اور ثقافتوں کو احترام دیا جائے اور انہیں فی الحقیقت تکثیریت (Pluralism) کا مظہر بنایا جائے۔ پاکستان نے بہت سے بین الاقوامی معاہدات اور اقدامات پر تحفظات کے ساتھ دستخط کیے ہیں[13] اور کئی دیگر کے حوالے سے اپنے ہاں موجود تصورات اور اس معاہدے کے مقاصد کے درمیان موجود خلاء کے حوالے سے خدشات کا اظہار کیا ہے۔[14] ایسے میں حالات کو جوں کا توں رہنے دینے اور اپنے تحفظات کے باوجود چلتی لہر کے ساتھ بہتے رہنے کی بجائے پاکستان کو ایک تکثیری بین الاقوامی معاشرے کی تشکیل کے لیے قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ پہلے قدم کے طور پر پاکستان کو ان بین الاقوامی فورَمز میں چوکس اور فعال رہنا چاہیے جہاں کسی نئے معاہدے، کنونشن یا پروٹوکول کو تیار کیا جا رہا ہو یا ان کی تشریح و تطبیق کے اصول طے کیے جا رہے ہوں۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ ان فورمز پر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرے تاکہ ان میں ہونے والی گفتگو کا پیش منظر وسیع کیا جا سکے اور متن میں اسلامی اور دیگر خیالات کو مقام مل سکے۔ اس موقع پر پاکستان کو چاہیے کہ وہ دنیا بھر میں موجود ریاستوں، اداروں، لابیز، گروپوں اور محققین (مسلمانوں اور اپنے خیالات سے ہم آہنگ غیر مسلموں) کو اپنے ساتھ لے کر چلے۔ اسی طرح کی تحریک جلد یا بدیر نہ صرف بین الاقوامی سطح پر بلکہ مقامی طور پر بھی ایک صحت مند تبدیلی لے آتی ہے۔ اس صورت میں تمام افراد اپنی تہذیبوں اور ثقافتوں کو برقرار رکھنے اور انہیں مضبوط بنانے کے لیے بین الاقوامی معاہدوں میں ایک نقطۂ اتصال (Convergence Point) ڈھونڈ لیں گے اور ان کی پیروی کریں گے۔

بنیادی سبب کی نشان دہی

خواتین اور خاندانی نظام سے متعلق مسائل کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو جامع اصلاحات اور آگاہی کے متقاضی ہیں، اور صرف قانون کی نظر سے انہیں دیکھنا اور حل کی کوشش کرنا تمام تر کاوش کو یک

رُخا کر دیتی ہے۔ جب تک ایسے تمام عوامل کو سامنے نہیں رکھا جائے گا ان معاملات کو بہتر کرنے میں کسی بھی طرح کے دیگر اقدامات مددگار ثابت نہیں ہوسکیں گے۔ ان میں سے ایک مثال جاگیردارانہ نظام کی ہے جو اپنے اصل معنوں میں تو شاید بیشتر علاقوں میں ختم ہو چکا ہے (اگرچہ چند علاقوں میں اب بھی رائج ہے) لیکن اس نے ایک ایسی ذہنیت پیدا کردی ہے جو پورے معاشرے میں لوگوں کے رویوں، طرزِ زندگی اور طرزِ بیان میں جھلکتا ہے۔ اس ذہنیت کی ایک بنیادی خصوصیت مقام، مرتبہ اور دولت کا ناجائز استعمال اور اس کی ہوس میں ہر کمزور اور بے بس انسان کے حقوق سے انکار ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خواتین اس کا لازمی شکار ہوتی ہیں۔ خواتین کے حقوق کو زبردستی اپنے اختیار میں لے لینے، وراثت میں ان کے حصے سے انکار، ان کی مرضی ومنشا کے خلاف شادی، عزت کے نام پر تنازعات، اور واجبات وذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے اِن کا استعمال، خاندانی رسم ورواج حتیٰ کہ مذہب کے معاملات میں بھی ان کا استحصال اسی جاگیردارانہ ذہنیت کی علامات اور توضیحات ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ جن اراکین پارلیمنٹ سے اس برائی کے خاتمے اور اس ذہنیت کی تبدیلی کے لیے اقدامات کی توقع کی جاتی ہے، ان میں سے بیشتر خود اسی پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی رکنِ پارلیمان اس سے مختلف پس منظر کے ساتھ بھی آتا ہے تو اس کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اس رائج ذہنیت کو اپنانے سے خود کو روک سکے جو اس پرتعیش طرزِ زندگی کا حصہ ہوتی ہے جو اسے پیش کی گئی ہوتی ہے۔ اس انتہائی اہم مسئلے سے متعلق آگاہی کی جھلک سماجی اور علمی حلقوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ پھر بھی اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب تک رویوں اور سوچ کے زاویوں میں تبدیلی نہیں آتی قانون کی مدد سے کسی متعین جرم کی سزا تو تجویز کی جاسکتی ہے، لیکن یہ قانون اس نوعیت کے جرم کے رجحان کے خاتمے کا سبب نہیں بن سکتا۔ ایسی اصلاحات کی جانی چاہییں جن کی مدد سے دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہونے سے روکا جاسکے۔ تعزیری اقدامات کے علاوہ انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لانی چاہییں۔ خاص طور پر اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ تعلیم اور روزگار کے مواقع ملک کے تمام علاقوں کے باشندوں کے لیے یکساں ہوں تاکہ لوگوں کو یہ طاقت فراہم کی جاسکے کہ وہ خود سے جاگیرداری کے شکنجے سے چھٹکارا حاصل کرسکیں اور معاشرے میں وہ تبدیلی لاسکیں جو اسے جاگیردارانہ نظام سے دُور

لے جائے۔

اس مطالعے میں ذکر ہونے والے یا رہ جانے والے تمام مسائل کا بنیادی سبب کمزور طرز حکمرانی ہے۔ قانونی ضابطوں کی ترتیب وتدوین (codification) بھی اہم ہے کہ اس سے نظام میں یکسانیت وہم آہنگی حاصل ہوتی ہے، لیکن قانون سازی تبدیلی نہیں لاتی، بلکہ تبدیلی کے لیے عزم درکار ہوتا ہے۔ نئے قوانین لانے سے کمزور طرز حکمرانی کے باعث سامنے آنے والے مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس یہ قوانین ایک کمزور حکومتی نظام میں بدعنوانی، بلیک میلنگ اور طاقت اور اختیار کے غلط استعمال کے امکانات کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔ اوپر کی بحث میں دیکھا گیا ہے کہ پہلے سے موجود قوانین کی موجودگی میں بھی اسی حوالے سے نئے قوانین تجویز کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے رائج قانون نتائج فراہم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس ضمن میں سابقہ ابواب میں جہیز کے خاتمے اور خواتین کی اسمگلنگ کے لیے پیش کی گئی تجاویز کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جس چیز پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ پولیس، عدلیہ اور دیگر عوامی خدمت کے اداروں کا کردار ہے۔ قانون کی کتابوں میں نئے صفحات کا اضافہ کر دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ سرکاری ملازمین اور اداروں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ احساس ذمہ داری سے سرشار اور جواب دہی کے لیے تیار ہوں۔

توقعات

اب جبکہ سماجی خدمات، شادی اور اس سے متعلقہ معاملات کو اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے صوبوں کی ذمہ داری بنا دیا گیا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ صوبائی اسمبلیاں خود کو اس قابل ثابت کریں کہ خواتین کو درپیش مسائل کے حل کے لیے صوبے کے مخصوص حالات اور وہاں موجود مؤثر طریقہ کار کو سامنے رکھتے ہوئے قانون سازی کے عمل کو جاری رکھ سکیں۔ یہ بھی امید کی جانی چاہیے کہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں موجود قانون ساز اراکین اسمبلی سامنے آنے والے مسائل، معاملات اور معاشرے کی مشکلات سے نبرد آزمائی میں زیادہ فکرمندی، آگاہی اور احتیاط کا مظاہرہ کریں گے۔ یہ لوگ خاندان کے ادارے کو مضبوط و مستحکم کریں گے، اچھے اور برے کی تمیز کرنے والی اخلاقی اقدار کو پروان چڑھاتے ہوئے خواتین کی اس عزت واحترام کو بحال کریں گے جس کی وہ یقینی طور پر مستحق ہیں۔

حواشی

1۔ روزنامہ ڈان کراچی، 16 مارچ 2013ء۔

2. Pakistan Focus, Kundi Says Parliament did a marvelous job in five years, http://pakistanfocus.com/2013/02/04/kundi-says-parliament-did-a-marvelous-job-in-five-years/ (February 8, 2013)

3۔ دستور پاکستان میں اٹھارہویں ترمیم 19 اپریل 2010ء کو ہوئی۔

4۔ انیسویں آئینی ترمیم یکم جنوری 2011ء کو ہوئی۔

5۔ بیسویں آئینی ترمیم 28 فروری 2012ء کو ہوئی۔

6۔ ان قراردادوں میں شامل ہیں: قومی سلامتی کی حکمتِ عملی اور دہشت گردی سے نمٹنے کے طریقِ کار پر اصولی رہنمائی فراہم کرنے والی قرارداد (22 اکتوبر 2008ء)، سیکیورٹی اور خارجہ پالیسی پر نظرثانی کے لیے قرارداد (14 مئی 2011ء) خواتین کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی قرارداد (8 مارچ 2013ء)۔

7۔ بحوالہ: قومی اسمبلی کی کارروائی چلانے کے قواعد وضوابط 2007ء کا قاعدہ نمبر 253۔

8۔ بحوالہ: قومی اسمبلی کی کارروائی چلانے کے قواعد وضوابط 2007ء کے قاعدہ نمبر 118 کی ذیلی شق نمبر 5۔

9۔ یہ بل پارلیمنٹ سے منظور ہوا اور اس نام سے قانون بن گیا: فوجداری قوانین (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2011ء۔

10۔ قومی اسمبلی کی ویب سائٹ

http://www.na.gov.pk/en/resolution_detail.php?id=89 (آخری رسائی بتاریخ 12 مارچ 2013)

11۔ یہ قرارداد سرکاری اور نجی ارکان کی جانب سے مشترکہ طور پر پیش کی گئی تھی۔

12۔ مثال کے طور پر دیکھیے:

Yasuaki, Onuma, *Towards Intercivilizational Approach to Human Rights*, Asian Yearbook of International Law, Vol. 7 (1998) p. 103; and Chaudhry, Muhammad Sharif, *Human Rights in Islam*, Lahore: All pakistan Islamic Education Congress, 1993.

13۔ جیسے: چوتھا جنیوا کنونشن، شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی کنونشن، خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازات کے خاتمے کا کنونشن۔

14۔ جیسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد (18 دسمبر 2007ء) جو سزائے موت پر پابندی کا مطالبہ کرتی ہے۔

.....

ضمیمہ

خواتین اور خاندان سے متعلق نجی ارکان کے مسوّداتِ قانون

عنوان	تاریخ پیش کش	موجودہ کیفیت	پیش کار
خواتین مخالف طرزِ عمل کی روک تھام کا (فوجداری قانون میں ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۰ جون ۲۰۰۸ بروز منگل	۲۶ دسمبر ۲۰۱۱ء کو نافذ ہوا بطور فوجداری قانون ایکٹ ۲۰۱۱ء (تیسری ترمیم)	چوہدری پرویز الٰہی (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
پاکستانی شہریت (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۰ جون ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	بیگم شہناز شیخ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
پاکستان کا ضابطہ تعزیرات (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۰ جون ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	کشمالہ طارق (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
جرم قذف (حد کے نفاذ) (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	کشمالہ طارق (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
گھریلو تشدد سے بچاؤ ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	۱۴ اگست ۲۰۱۰ء کو قومی اسمبلی سے پاس ہوا اور مدت گزر جانے کے باعث نافذ نہ ہو سکا	یاسمین رحمان (پاکستان پیپلز پارٹی)

عنوان	تاریخ پیش کش	موجودہ کیفیت	پیش کار
عائلی عدالتیں (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	ریاض فتیانہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
جائے کار پر ہراساں کرنے کی روک تھام کا ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	۹ مارچ ۲۰۱۰ء کو بطور قانون نافذ ہوا	عطیہ عنایت اللہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
مجموعہ ضابطہ دیوانی (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	بیگم حسنین (پاکستان پیپلز پارٹی)
ملازمت پیشہ خواتین (حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۲۰۰۸ء	۱۲ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	ریاض فتیانہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
اپنے گھر میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے والی خواتین کے تحفظ کا ایکٹ ۲۰۰۸ء	۲۶ اگست ۲۰۰۸ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	ریاض فتیانہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
فوجداری قانون (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۱۴ اپریل ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	ماروی میمن (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
عائلی عدالتیں (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۲۱ اپریل ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخر النساء (پاکستان پیپلز پارٹی)
مسلم عائلی قوانین (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۲۱ اپریل ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخر النساء (پاکستان پیپلز پارٹی)

عنوان	تاریخ پیش کش	موجودہ کیفیت	پیش کار
فیکٹریز (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۲۱ اپریل ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	خالدہ منصور (پاکستان مسلم لیگ-ن)
عائلی عدالتیں (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۳۰ جون ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	طاہرہ اورنگزیب (پاکستان مسلم لیگ-ن)
فوجداری قانون (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۳۰ جون ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	شمشاد ستار بچانی (پاکستان پیپلز پارٹی)
فیکٹریز (ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۹ء	۳۰ جون ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	یاسمین رحمان (پاکستان پیپلز پارٹی)
بچوں کی شادی امتناع (ترمیمی) بل-۲۰۰۹ء	۱۱ اگست ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	عطیہ عنایت اللہ (پاکستان مسلم لیگ-ق)
خواتین کی تکریم کا بل، ۲۰۰۹ء	۱۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	شیریں ارشد خان (پاکستان مسلم لیگ-ن)
مسلم عائلی قوانین (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۱۲ جنوری ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائدالمیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخرالنساء (پاکستان پیپلز پارٹی)
تیزاب پر کنٹرول اور اس کے جرائم کی روک تھام کا ایکٹ ۲۰۱۰ء	۲۶ جنوری ۲۰۱۰ء بروز منگل	۲۶ اگست ۲۰۱۱ء کو نافذ ہوا بطور فوجداری قانون (دوسری ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۱ء	ماروی میمن (پاکستان مسلم لیگ-ق)

عنوان	تاریخ پیش کش	موجودہ کیفیت	پیش کار
تولیدی صحت کی دیکھ بھال اور حقوق ایکٹ ۲۰۱۰ء	۹فروری ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	عطیہ عنایت اللہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
ایچ آئی وی/ایڈز (حفاظت اور کنٹرول) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۱۷فروری ۲۰۱۰ء بروز بدھ	زائد المیعاد/غیر مؤثر	عذرا فضل پیچوہو (پاکستان پیپلز پارٹی)
پاکستانی شہریت (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۱۷فروری ۲۰۱۰ء بروز بدھ	زائد المیعاد/غیر مؤثر	بشریٰ گوہر (عوامی نیشنل پارٹی)
خواتین کی ٹریفکنگ کی روک تھام اور کنٹرول کا ایکٹ ۲۰۱۰ء	۲۳فروی ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	بشریٰ گوہر (عوامی نیشنل پارٹی)
مجموعہ ضابطہ دیوانی (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۲۳فروری ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخر النساء (پاکستان پیپلز پارٹی)
پاکستان کا ضابطہ تعزیرات (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۱۶مارچ ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخر النساء (پاکستان پیپلز پارٹی)
مسلم عائلی قوانین (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۰ء	۴مئی ۲۰۱۰ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	جسٹس (ر) فخر النساء (پاکستان پیپلز پارٹی)
نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (ترمیم) ایکٹ ۲۰۱۱ء	۱۹اپریل ۲۰۱۱ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	تسنیم صدیقی (پاکستان مسلم لیگ-ن)
ہندو شادی ایکٹ ۲۰۱۱ء	۱۱اکتوبر ۲۰۱۱ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	کشن چند پروانی (پاکستان مسلم لیگ۔ق)

عنوان	تاریخ پیش کش	موجودہ کیفیت	پیش کار
پاکستان کا ضابطہ تعزیرات (ترمیم) بل ۲۰۱۲ء	۱۷ جنوری ۲۰۱۲ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	خرم جہانگیر وٹو (پاکستان پیپلز پارٹی)
پاسپورٹ (ترمیم) بل ۲۰۱۰ء	۱۷ جنوری ۲۰۱۲ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	عذرا فضل پیچوہو (پاکستان پیپلز پارٹی)
نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (ترمیم) بل ۲۰۱۲ء	۱۷ دسمبر ۲۰۱۲ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	عذرا فضل پیچوہو (پاکستان پیپلز پارٹی)
تیزاب پھینکنے اور جلائے جانے کے جرم پر بل ۲۰۱۲ء	۱۸ دسمبر ۲۰۱۲ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	عطیہ عنایت اللہ (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (ترمیم) بل ۲۰۱۳ء	۲۹ جنوری ۲۰۱۳ء بروز منگل	زائد المیعاد/غیر مؤثر	کشور زہرہ (متحدہ قومی موومنٹ)

کتابیات

(Bibliography)

- Al-Qur'an
- Acid Survivors Foundation, Annual Report July 2009 to June 2010, http://acidsurvivorspakistan.org/reports
- ADB, Combatting Trafficking in South Asia, Asian Development Bank, 2003
- Alarmic Rumsey, Mohammadan Law of Inheritance, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1983
- Anis Ahmad, Women and Social Justice: An Islamic Paradigm, Institute of Policy Studies, Islamabad, 1996
- Amarpal Dhillon, The Origins of Hindu Dowry Tradition, http://www.mahavidya.ca/wp-content/uploads/2008/06/dhillon-amarpal-dowry.pdf
- Black's Law Dictionary
- Bukhari, Sahih al-Bukhari (Arabic-English), Dar ul-Fikr, al-Madinah al-Munawwar
- Cairncross, John, After Polygamy was made a Sin: The Social History of Christian Polygamy, Routledge and Kegan Paul Ltd.: 1974
- Constitution of Islamic Republic of Pakistan, 1973
- Council of Islamic Ideology, Final Report on Examination of Laws, Islamabad: Dec. 1996
- D.F. Mulla, Principles of Mahomedan Law, Lahore: PLD Publishers, 1990
- Doreen Elliott, "Gender, Delinquency and Society" England: Avebury, 1988
- FAFEN, FAFEN Parliament Monitor, www.fafen.org
- Farzana Bari, Role and Performance Assessment of Pakistani Women Parliamentarians 2002-2007, Pattan 2009
- HRCP, State of Human Rights in 2006, Lahore: Human Rights Commission of Pakistan, 2007
- Hoffman Bustamante, "The Nature of Female Criminality", Issues in Criminology vol. 8, No. 2

• Inter-Parliamentary Union, www.ipu.org

• IRI, "Hudood-o-Ta'zirat", Islamabad: Islamic Research Institute, 1986

• James Q. Wilson and Richard J. Herrnstein, "Crime and Human Nature: The Definitive Study of the Causes of Crime" New York: Simon and Schuster Inc. 1986

• Khurshid Ahmad, Family Life in Islam,. Leicester: Islamic Foundation, 1974

• Muhammad Sharif Chaudhry, Human Rights in Islam, Lahore: All Pakistan Islamic Educational Congress, 1993

• Murghinani, Abul Hasan Ali, Al-Hidayah, vol. 4, Deoband: Maktaba Rahimia, 1378 A.H.

• Muslim, Al-Musnad al-Sahih, Cairo: Dar Ehya-ul-Kutub al-Arabiyyah, 1347 A.H.

• Naseeruddin al-Khattab (trans.), Ibn-e-Majah, English Translation of Sunan Ibn-e-Majah, Darussalam, 2007

•Naeem Mirza and Wasim Wagha, A Five Year Report on Performance of Women Parliamentarians in the 12th National Assembly (2002-2007), Aurat Foundation, 2007

• National Assembly of Pakistan, www.na.gov.pk

• Onuma Yasuaki, Towards Intercivilizational Approach to Human Rights, Asian Yearbook of International Law, vol. 7 (1998)

• PILDAT, First year of increased women representation in the Parliament" Islamabad, 2004

• PILDAT, Performance of 13h National Assembly of Pakistan, The 3rd year, Nov. 2011

• Qadi Khan, Fatawa, Mustafai Press, Delhi

• Rules of Procedure and Conduct of Business in the National Assembly 2007

• Rizwan Ahmad, Sayings of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, Karachi: Quaid-Foundation and Pakistan Movement Centre, 1993

• Rubya Mehdi, "The Islamization of the Law in Pakistan", Surrey: Nordic Institute of Asian Studies, 1994

• Rules of Procedure and Conduct of Business in the National Assembly 2007

• Senate of Pakistan, www.senate.gov.pk

• Sophia Akram, "Human Trafficking in Pakistan - Laws and Lacunas" http://sophiaakram.wordpress.com

• Tanzil-ur-Rahman, A Code of Muslim Personal Law, Karachi: Hamdard Academy, 1978

• Tanzil-ur-Rahman, "Muslim Family Laws Ordinance: Islamic and Social Survey" Karachi: Royal book Co. 1997

• Taqi Usmani, Muhammad, Amendments in Hudood Laws: The Protection of Women's Rights Bill- An Appraisal, Institute of Policy Studies Islamabad, 2006

• UNHCR, www.unhcr.org

• Waheed-uz-Zaman, Tayseer-ul-Bari (commentary on Sahih Al-Bukhari), Taj Co. Ltd

• Women's Parliamentary Caucus, www.wpcp.org.pk

• ثروت جمال اصمعی، ''عورت، مغرب اور اسلام''، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

خواتین، خاندان اور پارلیمان

پاکستان میں قانون سازی کے رجحانات

تالیف: خالد رحمٰن، سید ندیم فرحت

پاکستانی معاشرے میں خاندان کا ادارہ معاشرتی استحکام کی بنیاد اور انفرادی و اجتماعی توانائی کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''شادی، خاندان، ماں اور بچے کا تحفظ'' ملکی حکمتِ عملی کا اہم اصول ہے جسے دستورِ پاکستان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ملک میں خواتین اور خاندان کے حوالے سے سماجی و حکومتی رویے اور اقدامات پر بالعموم عدم اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں خواتین اور خاندان کو درپیش مسائل کو 2008ء سے 2013ء تک قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے مسوداتِ قانون کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے جہاں خواتین کے مثبت کردار کو تسلیم کرنے، اسے اجاگر کرنے اور نکھارنے پر زور دیا گیا ہے وہاں اعتدال پر مبنی اس نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو ملکی و بین الاقوامی سطح پر اپنایا جانا چاہیے۔

.....

خالد رحمٰن انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل ہیں اور 20 سے زائد کتابوں اور متعدد تحقیقی و علمی مضامین کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ انسٹی ٹیوٹ کے تحقیقی مجلّہ ''پالیسی پرسپیکٹیوز'' کے مدیر بھی ہیں۔

سید ندیم فرحت انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں ریسرچ کوآرڈی نیٹر ہیں۔ قانون، انسانی حقوق، مذہب اور معاشرہ ان کی خصوصی دلچسپی کے میدان ہیں۔